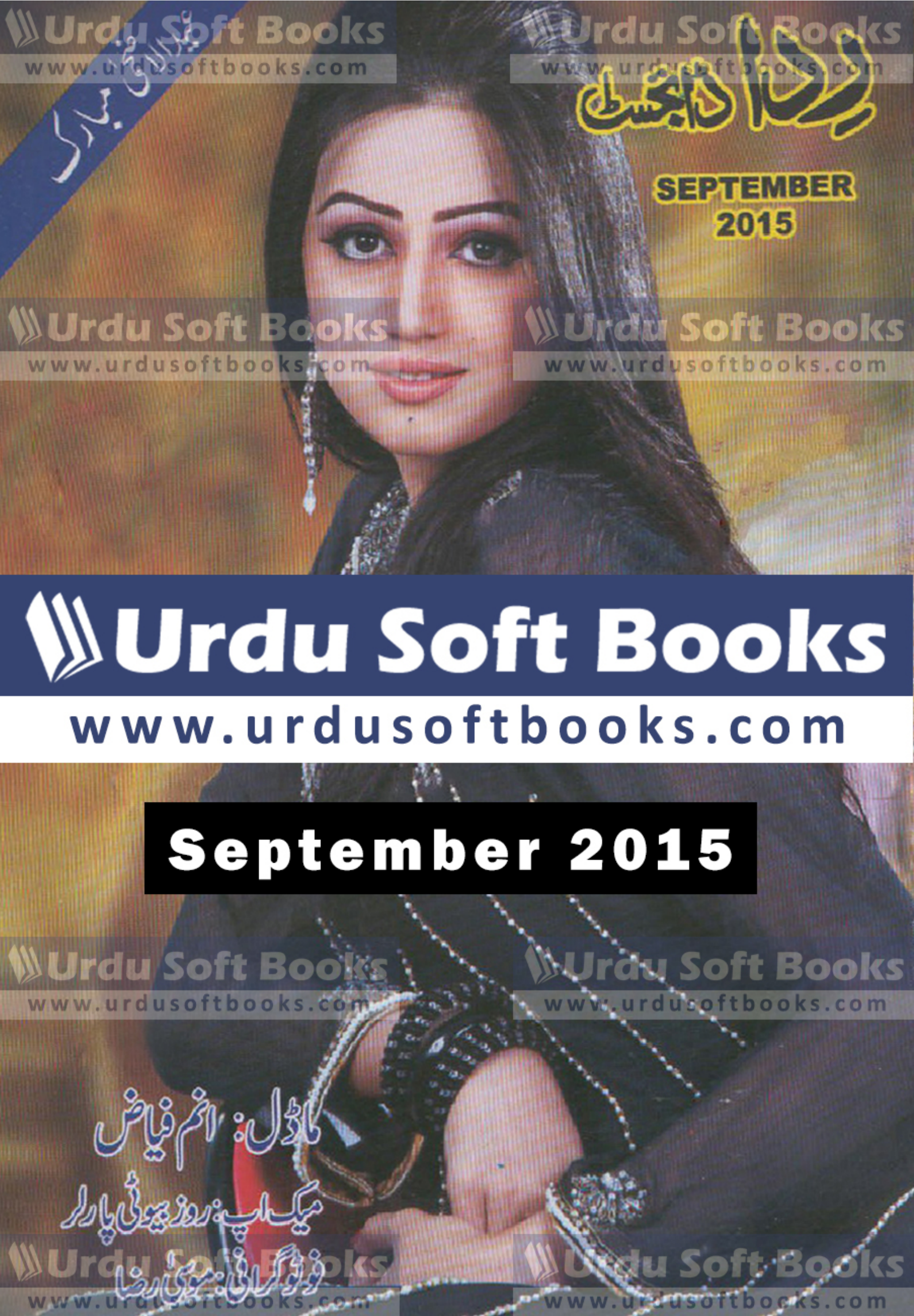

ردا ڈائجسٹ
SEPTEMBER
2015
مبارک
ماڈل: انم فیاض
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی: موسیٰ رضا

ملاقات

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

ستمبر 2015ء

جلد نمبر 21 شمارہ نمبر 9

قیمت 60 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

720 روپے

34535726

پبلشر و ایڈیٹر صالحہ محمود نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۱۲۹/ڈی بلاک۔2۔پی-ای-سی-ایچ-سوسائٹی، کراچی

مستقل سلسلے



Join Us on Facebook

Get Notificatons of Newly Uploaded Books

Find us on: facebook®

Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books



صالحہ محمود

خوبصورت رنگ بھرے موسموں میں اس بار عید قرباں آن پہنچی ہے اس خوش نصیب ساعت میں آپ اپنے لیے کچھ اہم سوچیے اپنے ماحول اور اپنے گھر میں کچھ نئے انداز سے تبدیلی لائیں یعنی حقیقت پسندانہ انداز میں وقت کی تقسیم کر کے اپنی روٹین کو بامقصد بنائیں پرسکون رہیں۔ خلوص اور محنت کے ساتھ اپنے کسی بھی مقصد کو حاصل کریں۔ اپنی ناکامی پر کبھی دلبرداشتہ نہ ہوں حصولِ علم کی جدوجہد جاری رکھیں اگر دیگر مسائل سے آپ دوچار ہیں تو اللہ پر بھروسہ رکھیں کہ آج نہیں تو کل اللہ کا کرم ہو جائے گا۔ بات صرف یہ کہنے کی ہے کہ ہمت نہ ہاریے چھوٹے سے چھوٹے کام کو بھی دوسرے کام سے جوڑ کر رکھیے۔ کامیاب زندگی کا راز یہی ہے کہ ایک دن پہلے آپ اپنا شیڈول ترتیب دے لیں کہ صبح پہلی فرصت میں کیا کرنا ہے۔

دوسری بات بہت اہم یہ ہے کہ انسانی حیات نو کے لیے سب سے اہم جزو جو صحت کے لیے ہے اپنی روح پاک اور صاف رکھیں۔ روح ہمارے جسم کے اندر قید ہے جب روح جسم کو آزاد کرتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟ یہ آپ سب جانتے ہیں اگر ہم اپنی روح کو اتنا پاک وصاف رکھیں یعنی بغض اور کینہ، نفرت، حسرت ان شیطانی عناصر سے ہم اگر بچ جائیں تو ہمارا جسم صحت منداور تندرست رہے گا۔ اس پر بہت سارے دانشوروں نے اپنی رائے دی ہے ناچیز کا مشاہدہ بھی یہی ہے خوشی، حسد اور بغض اور ہر وقت کے تناؤ سے اگر دور رہا جائے تو انسان صحت مند رہتا ہے۔ ماحول جتنا خوشگوار ہوگا آپس میں تعلقات ہوں گے اور آپ صحت مند رہیں گے۔ آپ کے فکر وعمل کی دنیا آباد رہے گی۔ یہ خاص پیغام ہے میرا اس حج کی سعادت کے موقع پر پیغام محبت ہے۔ میرا یہ ایک ایسا مکمل تجزیہ ہے آپ کی صحت کا راز آپ کے خوشگوار ماحول میں ہے رشتے داریاں چھوڑ کر اہل وعیال سے تعلقات بگاڑ کر غیروں سے رشتے داریاں قائم کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے جو قرب وجوار میں رہتے ہیں پہلے ان کو دیکھیے ان کو سمجھیے ان پر خرچ کریں بلاجواز تناؤ آپ کو کسی بھی بیماری میں مبتلا کر سکتا ہے اس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے آپ اللہ کے نام پر سب سے اپنے تعلقات استوار کریں۔ پھر دیکھیے آپ کتنی صحت مند رہتی ہیں۔ صحت کا راز ہی یہی ہے۔

خوب صورت رت موسم میں آپ عید قرباں کو انجوائے کریں۔ جن کے گھر قربانی نہیں ہوئی یا جو ضرورت مند ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ گوشت کا حقدار بنائیے۔ خوشگوار موڈ میں اس حسین موسم کو انجوائے کریں اور میری باتوں پر عمل کریں۔

آپ کے سندیسے مجھے خوش فہمی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ آپ سب مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، ہم بھی آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ دل کی ساری باتیں آپ سے شیئر کروں اور یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی میں آپ لوگوں سے دل کی بات شیئر کر لیتی ہوں اس بار بہت اہم بات ہے جو میں نے آپ سے شیئر کی ہے۔ اس کو آپ دوسروں سے بھی شیئر کریں۔ اپنی ڈائری میں اسے ضرور لکھیں۔

نئے لکھنے والے رابطہ رکھیں ہم کوشش کر رہے ہیں کہ انہیں کسی نئے پلیٹ فارم پر لے آئیں۔ بس میری ہمت اور آپ کی دعا ہمیں آگے تک لے جائے گی۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہم نے اپنے قلم کے ساتھ دیانتداری کی ہے ورنہ میں اس مقام پر بھی نہ ہوتی۔

آپی

میڈیا چینلز متوجہ ہوں

ایک اہم بات میڈیا چینلز پر اکثر وبیشتر اپنے موضوع میں ڈکیتی کی واردات دکھاتے وقت اب ایک نئی چیز پیش کر رہے ہیں کہ مال ودولت کے ساتھ بہن اور بیٹیوں کی عزت کو بھی پامال کرتے ہیں۔ معاشرے میں یہ گھناؤنا عمل مت پھیلائیے قلم کو روکیے۔ خودکشی سے کہیں گندا عمل جو آپ اپنے قلم سے موضوع بنا رہے ہیں میں گزارش کرتی ہوں تمام چینل والوں سے بھی کہ آپ ایسے موضوعات کو سنسر کریں۔ ورنہ یہ نہ ہو کہ ڈکیتی کی واردات میں عزت نفس کا بھی سودا ہونے لگے۔

صالحہ محمود

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے:
اللہ تعالیٰ کے لیے ہی نماز ادا کرو اور قربانی کرو۔

اور ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے کچھ اس طرح فرمایا: آپ کہہ دیجیے یقیناً میری نماز اور میری ساری عبادت اور جینا میرا مرنا یہ سب خالص اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو سارے جہاں کا مالک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں میں سے پہلا ہوں۔

تیسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا: اور ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کے طریقے مقرر فرمائے تاکہ وہ ان چوپائے جانوروں پر اللہ تعالیٰ کا نام لیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دے رکھے ہیں، سمجھ لو کہ تم سب کا معبود و اِلٰہ برحق صرف ایک ہی ہے تم اسی کے تابع فرمان ہو جاؤ اور عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجیے۔

سورہ کوثر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اپنے پروردگار کی نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے۔

مذکورہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے قربانی کا حکم بڑے واضح انداز میں دیا۔ ہجرت کے بعد دس سال تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا اور ہر سال قربانی فرماتے رہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج ادا فرمایا تو سو اونٹوں کی قربانی کی جن میں سے ترسٹھ اونٹ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دست مبارک سے نحر فرمائے باقی اونٹوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا۔ (صحیح مسلم)

قربانی ایک اہم مالی عبادت ہے اور شعائر اسلام میں سے ہے اور سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ قربانی کی احادیث میں بہت فضیلت آئی ہے حضرت زید بن ارقمؓ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ قربانی کیا ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا فائدہ یہ ہے کہ تمہیں قربانی کے جانور کے ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی ملے گی صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن جانوروں کے بدن پر اون ہے تو اس اون کا کیا حکم ہے، اس پر بھی کچھ ملے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اون کے ہر بال کے عوض بھی ایک نیکی ہے (سنن ابن ماجہ) غور کیجیے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثواب ہوگا کہ ایک قربانی کرنے سے ہزاروں لاکھوں نیکیاں مل جائیں، بھیڑ اور دنبے کے بدن پر لاتعداد بال ہوتے ہیں اگر کوئی صبح سے شام تک گننا چاہے تو بھی نہیں گن سکے گا۔ صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ قربانی کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تمہارے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے ہر بال کے عوض میں ایک نیکی ہے۔



حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ قربانی بہت بڑا عمل ہے اور قربانی کے ایام میں اللہ تعالیٰ کو قربانی کرنے سے زیادہ کوئی عمل پسند نہیں ہے۔

قربانی کرتے وقت خون کا جو پہلا قطرہ زمین پر گرتا ہے تو گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے پاس مقبول ہو جاتا ہے۔ قربانی واجب ہوتے ہوئے اور مالی وسعت ہوتے ہوئے قربانی کا نہ کرنا بہت بڑی بدنصیبی اور نیکی سے محرومی کا اور جان کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کا سبب ہے۔ قربانی کی فضیلت میں اور بہت سی روایات آئی ہیں، ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے جانور کے کھر، بال اور سینگ قیامت کے دن نامہ اعمال میں نیکیوں میں شامل ہوں گے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ احادیث میں یہ بھی ہے کہ قربانی کا جانور قیامت کے دن سواری کے لئے لایا جائے گا، اور یہ پل صراط کی سواری ہوگی۔

دیگر عبادت کا عمل کرنے کے بعد ثواب ملتا ہے اور قربانی کا ثواب ابھی عمل بھی پورا نہیں ہوتا ، بلکہ ادھر عمل شروع ہوا کہ ادھر ثواب لکھ دیا جاتا ہے اور ہر بال کے بدلے نیکی حتیٰ کہ دنبے یا بھیڑ کے جسم پر جتنی بالوں کی شکل میں اون ہوتی ہے، ہر بال کے حساب سے ثواب ملتا ہے۔

جس طرح قربانی دینے والے کو زیادہ ثواب ملتا ہے اس طرح اگر کوئی صاحب نصاب ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو اس کا گناہ ہوتا ہے کیونکہ قربانی واجب ہے اور ترک واجب گناہ کبیرہ ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو سخت وعید سنائی ہے۔

حدیث شریف میں ہے: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس کے پاس قربانی کرنے کی گنجائش ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔ حدیث شریف میں قربانی نہ کرنے والوں کیلئے یہ بہت بڑی وعید ہے کیونکہ عیدگاہ کو عید کی نماز پڑھنے کیلئے مسلمان جاتے ہیں اور جو مسلمان نہیں وہ عیدگاہ سے دور رہتے ہیں ، یہ بہت سخت وعید ہے کہ مسلمان ہو اور گنجائش بھی ہو اور قربانی نہ دے ، یہ نہایت بدبختی ہے جس طرح عید کی نماز ہر مسلمان مرد عاقل و بالغ پر واجب ہے اسی طرح ہر صاحب نصاب مسلمان مرد و عورت پر قربانی واجب ہے۔

صحیح بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سیاہ و سفید مینڈھوں کی قربانی دی انہیں اپنے ہاتھ سے ذبح کیا اور (ذبح کرتے ہوئے) بسم اللہ اللہ اکبر کہا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ شریف میں دس برس قیام کیا اور ہر برس قربانی کیا کرتے تھے)۔

جس نے بھی نماز (عید) کے بعد (قربانی کا جانور) ذبح کیا تو اس کی قربانی ہوگئی، اور اس نے مسلمانوں کی سنت پر عمل کر لیا)۔

(صحیح بخاری حدیث)

جو شخص قربانی کرنے کی استطاعت رکھتا ہو اس کے لیے قربانی کرنا سنت موکدہ ہے، لہٰذا انسان اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جانب سے قربانی کرے۔

.......☆

سلسلہ وار ناول

قسط نمبر 21

تجھ سے مانگوں میں تجھ کو

اگر وہ امی کو احساس نہیں دلاتی تو وہ تو برے سے برا کرتی ہی چلی جاتیں، کیسے ہیشم کی شادی پر بھی واویلا مچایا تھا۔ ان کی مرضی تھی جو ہم سے ہو اور جو ہم اس نے کبھی ہیشم کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ عم



میں بھی تو خاصی چھوٹی تھی وہ ہیشم کو فاران کی طرح ہی بھائی سمجھتی تھی۔

''ہیشم بھائی! کتنے اچھے ہیں، سب کا خیال رکھتے ہیں۔'' اس نے اپنے آنسو صاف کیے دل تو اس کا ماں کی طرف سے اداس تھا کیوں کہ انہوں نے کتنا اسے برا بھلا کہا تھا۔

''امی! میں آپ کو کچھ بھی برا نہیں کرنے دوں گی اور رہے فاران بھائی ہمیں ان کی پسند بھی قبول کرنی ہوگی۔'' اس نے عزم کرلیا تھا۔ وہ سب کچھ ٹھیک کر کے رہے گی اس کے لیے اسے کچھ بھی کرنا پڑے۔

''جوہم امی کے لیے دودھ گرم کر کے لے جاؤ، انہیں میں نے دوائی کھلادی ہے۔'' میران امی کے روم سے باہر آ کے اسے ہدایت دینے لگا۔

''اچھا!'' اس نے سر ہلایا۔

''اور ہاں مزید کچھ بولنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ وہ بہت رو رہی ہیں۔''

''میران میں نے کیا غلط کہا ہے؟''



''تم نے سب ٹھیک کہا مگر مزید انہیں کچھ کہنا ٹھیک نہیں ہے کہیں زیادہ طبیعت خراب نہ ہو جائے۔''

میران کافی دیر سے نزہت کے پاس ہی تھا کیوں کہ ارتضیٰ علی کو تو خود وقتی غصہ تھا جو مرتضیٰ علی نے کہہ کر انہیں کم کر دیا تھا مگر وہ نزہت سے ناراض تھے جو ہیثم کو بہت برا بھلا کہہ رہی تھیں۔

☆......☆

حسنیٰ ضرورت سے زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ شہریار اسے کاموں میں لگائے رکھتا تھا۔ ابھی بھی وہ سارا کمرا سمیٹ کے نہانے جا رہی تھی۔ نازیہ بھابی میکے رہنے گئی ہوئی تھیں۔ ابھی تک حسنیٰ کا ہاتھ کھیر میں بھی نہیں پڑا تھا وہ اور ہی آرام سے ہو گئی تھی کام کی تو ویسے ہی چور تھی۔

''سنو مجھے روٹی بنا کے دو بھوک لگ رہی ہے۔''

''بھابی سے کہہ دیں۔'' وہ اپنے ہاتھ پیروں کی کلینزنگ کر رہی تھی۔

''بھابی سے کیوں کہہ دوں تمہاری ذمہ داری ہوں، ان کی نہیں۔'' اس نے اس کے سرخ و سپید سراپے کو بغور دیکھا جب سے اس نے ویٹ کم کیا تھا اور زیادہ خوب صورت اور دلکش ہو گئی تھی۔ شہریار اسے ذرا بھی اس کی خوب صورتی کا احساس نہیں دلاتا تھا۔

''بھابی اپنی امی کے گئی ہوئی ہیں۔''

''مگر میری تو ابھی کھیر پکائی کی رسم بھی نہیں ہوئی۔'' وہ جھٹ بولی۔

''ضروری ہے یہ فضول رسم ہو گی تو ہی تم کچن کا کام کرو گی کوئی کھیر پکائی نہیں ہو گی۔ میں نے منع کر دیا ہے۔''

''واٹ! آپ کی امی تو کہہ رہی تھیں کہ وہ ضرور کریں گی۔''

''میں نے منع کر دیا ہے۔''

''آپ کی امی کو ویسے بھی پیسے بچانے کی پڑی رہتی ہے۔'' وہ تو بہت ہی بھنا رہی تھی۔

''زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں ہے اور یاد رکھنا میں تمہاری بکواس برداشت بھی نہیں کروں گا۔'' وہ تو آنکھیں نکال کے اسے وارننگ دے رہا تھا۔

حسنیٰ کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ شہریار ذرا بھی تو اس کا خیال نہیں کر رہا تھا۔ نئی دلہن کے تو شروع میں شوہر ہر ناز نخرے بھی اٹھاتے ہیں یہاں شوہر تو کیا سسرال والے بھی اس کے کوئی ناز نخرے نہیں اٹھا رہے تھے۔

''جلدی سے نہا کے آؤ پھر مجھے روٹی بنا کے دو اور ہاں رات کا بھی کھانا بنا لینا کیوں کہ اماں گھر میں ہی ہوں گی۔ میرے دوست کے گھر دعوت ہے اس نے بلایا ہے وہاں جانا ہوگا۔'' وہ اسے ساتھ ساتھ ہدایتیں بھی دیئے جا رہا تھا اور وہ جل کے کلس ہی رہی تھی اسے کیا خبر تھی اسے یہ دن بھی دیکھنا پڑیں گے۔ کیسے اس کی نوابوں والی زندگی تھی۔ رفعت تو اسے کسی کام کو ہاتھ لگانے نہیں دیتی تھیں مگر نسرین اس سے سارے کام لیتی تھیں مگر اسے یہ سب اس وقت کرنا ناگوار نہیں گزرتا تھا مگر یہاں شہریار کے حکم پر ہر کام کرنا اس کی جان ہی جلا رہا تھا۔

''دل میں خوب کوس رہی ہو گی۔ ہے ناں۔'' اس کا جائزہ لینے لگا۔ پنک لان کے پرنٹڈ کپڑوں میں اس کی سرخ و سپید رنگت غصے کی وجہ سے اور سرخ ہی ہو رہی تھی۔

''کوسنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ طنز کرتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل پر اپنی گولڈ کی چوڑیاں اتار کے رکھنے لگی۔

شہریار بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا تھا نگاہ اس پر ہی جمائی ہوئی تھی۔

''تم عورتیں فائدے نقصان میں ہی پڑی رہتی ہو۔''

''اگر اتنی بری تھی تو مجھ سے شادی کیوں کی؟'' وہ تیز لہجے میں پھنکاری۔

''تمہارا میرا جوڑ لکھا جا چکا تھا اور یہ بڑے بول تمہارے آگے آئے ہیں کیا کہا تھا مجھ سے شادی کرنے سے پہلے میں خودکشی کر لوں گی۔'' وہ اسے یاد دلانے لگا۔

''آپ سے شادی بھی خودکشی سے کم نہیں ہے۔'' دانت پیسے شہریار اٹھ کے اس کے راستے میں ہی آ گیا حسنیٰ سائیڈ سے ہو کے نکلنے لگی۔

''کیا ہے مجھے کام کرنے دیں۔'' وہ جھنجھلا گئی۔

''تیور تو تمہارے ایسے ہیں جیسے کہیں کی شہزادی ہو۔'' ہاتھ پکڑے بیڈ پر گرا چکا تھا۔

حسنیٰ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسے شہریار کے ہر لمس سے جانے کیوں انتقام ہی کیوں محسوس ہوتا اس نے ایک دفعہ بھی اسے پیار سے نہیں چھوا تھا۔

''چھوڑیں ناں۔'' وہ چیخی۔

''آواز نیچی رکھو۔'' وہ اس کے کان کے قریب آہستگی سے ڈپٹ کے بولا تھا۔

''میرا جب دل چاہے گا تمہیں میرا خیال رکھنا ہوگا۔''

''آپ کو بیوی نہیں اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے چاہیے تھی میں ہی کیوں کوئی اور لڑکی لے آتے۔''

''کیا کروں ہم لوگ خاندان بھی تو دیکھتے ہیں۔'' وہ پھر جلانے لگا۔

حسنیٰ جلتی رہتی کلستی رہی مگر وہ اسے جلاتا رہا تھا جتنا وہ اس کے سامنے پر اعتماد بنتی وہ اسے اتنا بے عزت کرتا وہ اکیلے کمرے میں منہ چھپائے روتی مگر اس نے بھی سوچ لیا تھا شہریار کو سبق سکھا کے ہی رہے گی۔ اسے جب محبت ہی نہیں تو کیوں وہ اس کے ساتھ زبردستی یہ رشتہ جوڑے رکھے۔ گھر سے نسرین بھی تو نہیں آئی تھیں جو وہ ان کے ساتھ ہی کچھ دنوں کے لیے گھر چلی جاتی۔

☆......☆

بڑی مامی کو تو جیسے چپکی ہی لگ گئی تھی۔ وہ فاران سے بات بھی نہیں کر رہی تھیں۔ ارتضیٰ علی نے فاران کو بہت سنایا تھا مگر اس نے ایسی مجبوری بتائی کہ وہ خاموش ہو گئے تھے۔

''امیر علی، فاران کی دلہن کو رخصت کروا کے اس گھر میں لے آؤ۔'' مرتضیٰ علی نے اچانک ہی کہا تھا وہاں بیٹھے لوگ سب ہی چونک گئے تھے۔ فاران کو تو یقین نہیں آ رہا تھا ہیثم نے پہلو بدلا تھا جب کہ خوشنما کی نگاہ گاہے بگاہے ہیثم پر بھی تھی جو کل سے اس سے بات بھی نہیں کر رہا تھا اور کمرے میں بھی آ کے نہیں سویا تھا۔

''بابا جان! نزہت بالکل نہیں مانے گی۔''

''اسے سمجھانا تمہارا کام ہے جب کہ تمہارے بیٹے نے یہ قدم اٹھا ہی لیا ہے تو اسے تم نے پورا کرنا ہے۔''

''اور ہاں ہیثم تم نے بھی کسی لڑکی سے نکاح کیا تھا اس لڑکی کو بھی تم لے آؤ۔''

''جی۔'' ہیثم کو لگا جیسے سر پر بم پھوڑا ہو۔ خوشنما تو گھبرا ہی گئی کیوں کہ اصل حقیقت تو کسی کو بھی نہیں معلوم تھی۔

''نانا جان یہ آپ کہہ رہے ہیں۔''

''میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں اس لڑکی کی بھی حق تلفی نہیں ہو اور خوشی بیٹی کی بھی۔'' نوجوان پارٹی کو مرتضیٰ علی نے آنکھ کے اشارے سے جانے کو کہا تھا۔

''ہیثم میں چاہتا ہوں تم خوشی بیٹا سے بات کرو اور راضی خوشی اس لڑکی کو لاؤ۔'' خوشنما فوراً ہی جھٹکے سے اٹھ گئی سب کی حیرانگی سے استفہامیہ نگاہیں اٹھ گئی تھیں۔

''خوشی کو میری یہ بات بری لگی ہے میں چاہتا تو یہ بات میں اس کے سامنے نہیں کرتا مگر میں نے جان کے یہ بات کی تاکہ اسے اندازہ ہو جائے کہ میں اس کا بھی خیال رکھتا ہوں۔'' مرتضیٰ علی سمجھ رہے تھے خوشنما کا وہ خیال کر رہے ہیں جب کہ ایسا کچھ نہیں تھا خوشنما کو ان کی یہ بات بری لگی تھی۔

''نانا جان! آپ کو اچانک سے یہ خیال کیوں آیا۔''

''میں نے فیصلہ کیا ہے تم اور فاران سیدھے طریقے سے اپنی زندگی گزارو۔ فاران نے بھی اپنی ماں کو دھوکا دیا ہے مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا اس کا یہی حل ہے کہ فاران اس لڑکی کو لے آئے اور وہ لڑکی نزہت کا دل جیتنے کی کوشش کرے۔'' وہ بڑے نرم اور مدبرانہ انداز میں ان دونوں کو ہی سمجھا رہے تھے۔ اشرف علی اور ارتضیٰ علی اور شاہدہ خاموش بیٹھے ان کی بات سن رہے تھے۔ ہیثم کا سارا دھیان خوشنما کی طرف تھا کیوں کہ اسے اب موقع ملا تھا خوشنما کو ذہنی ٹارچر کرنے کا۔

''شاہدہ بیٹا! آپ دلہنوں کی تیاریاں شروع کریں یہ فرض تو ادا کرنا ہی ہے۔'' مرتضیٰ علی خاصے تھکے تھکے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''چلو ارتضیٰ میں نزہت سے بھی بات کرلوں ایسے کب تک وہ ناراض رہیں گی۔'' وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے کھڑے ہو گئے۔

فاران نے بڑی فکر مندی سے پہلو بدلا تھا کیوں کہ نزہت اس سے بالکل بھی بات نہیں کر رہی تھیں کتنی ہی وہ معافیاں مانگ چکا تھا۔

''چلو دلہا میاں تیار ہو جاؤ اپنی دلہن لانے کو۔'' ہیثم نے شوخی سے کہہ کے اس کی پشت معنی خیزی سے تھپکی تھی۔

''تمہیں بھی تو کہا ہے۔''

''مجھ سے ایک سنبھالی نہیں جا رہی ہے۔ دوسری کہاں افورڈ کر سکتا ہوں۔'' اس نے خود ہی اپنا تمسخر اڑایا۔

''پھر ہیثم تم اس لڑکی کا کیا کرو گے جسے تم گھر لائے تھے نکاح کر کے۔''

''مامی میں اس لڑکی کو کچھ دے دلا کے چپ کرا دوں گا۔'' اسے اب اندازہ ہو رہا تھا ایک جھوٹ چھپانے کے لیے کتنے جھوٹ بولنے پڑ رہے تھے۔

''لگتا ہے خوشنما بھابی کو دادا جان کی یہ بات پسند نہیں آئی ہے۔'' فاران نے خوشنما کے تیور نوٹ کیے تھے۔

''اگر نانا جان نے مجھ سے زیادہ ہی فورس کیا تو مجھے پھر کچھ تو کرنا پڑے گا۔''

''اپنی اس بیگم کا کیا کرو گے وہ تو بالکل برداشت نہیں کریں گی۔''

''ارے ہیثم کے لیے کوئی مشکل تھوڑی ہے دوسرا فلیٹ خرید کے اس میں رکھ لے گا کیوں ہیثم۔'' شاہدہ نے جیسے مسئلے کا حل پیش کیا ہو۔

''مامی وہ میں نے نکاح مجبوری میں کیا تھا کہ نانا جان میری خوشنما سے جان چھڑا دیں اور اب میں ایسا بالکل نہیں چاہتا۔'' وہ اس وقت بہت مشکل میں تھا کیسے سچ بتائے اگر نانا جان کو یہ پتا چلا کہ اس نے جھوٹ ہی کہا تھا وہ کتنا ناراض ہوں گے۔

''میں ذرا چلتا ہوں امی کے روم میں۔'' فاران کو وہاں کی بھی فکر تھی اور ہیثم کو اس وقت صرف یہ فکر بھی کہ وہ کیا کرے کہ یہ جھوٹ ختم ہو ادھر خوشنما بھی غصے میں ہو گی۔

☆......☆

''یہ کارنامہ انجام دے کر بہت اچھا کیا ہے۔ یہ نظر نہیں آیا بہن کی خوشیاں ضمران کسی اور کی جھولی میں ڈال چکا ہے۔'' راشدہ، نوین پر بہت ناراض ہو رہی تھیں۔

''ہم زبردستی کسی کو بھی مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ ہم سے شادی کرے۔ ضمران بھائی نے کبھی نوشین باجی کو پسند ہی نہیں کیا یہ آپ ہی تھیں جو آئے دن جا کے وہاں رک جاتی تھیں اور اپنی عزت اور اہمیت کم کرتی تھیں۔'' نوین کو کب اچھا لگتا کانوں سے بھی سنتی تھی کتنا دکھ ہوتا تھا صرف اپنی ماں اور بہن کی وجہ سے۔

''عتیق بھائی کو کیا کہا جو وہ سیدھے یہاں سے چلے گئے۔''

''ماموں کو احساس دلانا تھا جو میں نے دلا دیا۔ ان کی سمجھ میں آ گیا جو وہ چلے بھی گئے۔''

''نوین کیسی اولاد ہے تجھے ذرا اپنی ماں اور بہن کا خیال نہیں۔''

''آپ سب کا ہی خیال تھا جو میں نے ایسے کہا۔'' وہ بڑی سنجیدہ تھی اپنی ماں اور بہن کی عقلوں پر ماتم کرنے کو دل چاہتا تھا۔

''تم کیا سمجھ رہی ہو میں ضمران کو ایسے ہی چھوڑ دوں گی۔''

''نوشین باجی! آپ کو اللہ کا واسطہ کیوں اپنی عزت کرا رہی ہیں کیوں ان کی ہنستی بستی زندگی میں ٹانگ اڑا رہی ہیں۔''

''بکواس بند کرو۔'' اس نے نوین کو ڈانٹ دیا۔

''مجھے تو رضوانہ بھابی پر شک ہو رہا ہے ضرور اس نے کچھ گھول کے پلا دیا ہے جو یہ ان کی کہے جا رہی ہے۔''

''امی اگر مامی کو پلانا ہوتا تو ماموں کو آپ کو اور نانی جان کو پلاتیں تاکہ آپ سب ان کے گن گاتے۔ نہ ماموں گھر سے بھاگتے اپنی ذمے داریوں سے منہ چھپا کے۔''

''امی دیکھیں کیسی اس کی زبان چلے جا رہی ہے۔'' نوشین کے تو اور ہی پتنگے لگ رہے تھے وہ حیران بھی تھی جو نوین بالکل چپ رہتی تھی۔ آج کیسے اس کی زبان چل رہی تھی۔

''نوین! بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' کرن نے بھی آ کے تائید کی۔

''ہاں تمہاری ہی کمی تھی آ جاؤ اس کے ساتھ بیٹھ جاؤ اور ماں کے خلاف محاذ کھول لو۔''

''آپ غلط بات کر رہی ہیں۔ میں صرف حقیقت بیان کر رہی ہوں اور سچ بول رہی ہوں۔'' وہ ترکی بہ ترکی بول رہی تھی۔

''دونوں کیسی گھنی میسنی ہیں مامی کے گھر والوں سے ملی ہوئی ہیں۔'' نوشین کے تو پتنگے لگ رہے تھے۔

''آپی یہ آپ کی سوچ ہے ہم کوئی مامی کے گھر والوں سے نہیں ملے ہوئے ہیں آپ اپنی فکر کریں ضمران بھائی کے سسرال والوں میں بھی آپ کی خاصی شہرت ہوگئی ہے۔ مہندی کے دن کا ہنگامہ یاد ہے۔'' کرن بھی اسے احساس دلانے لگی کہ کسی طرح تو اس کی بہن سدھر جائے۔

''میرے حق پر وہ لڑکی ڈاکہ ڈالنے آگئی میرے آگ نہیں لگے گی تو کیا کروں۔''

''آپی آپ بالکل ان پڑھ لوگوں کی طرح ری ایکٹ کرنے لگی ہیں۔ پڑھی لکھی باشعور ہیں کچھ تو عقل سے سوچیں۔''

''زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں جاؤ تم اپنا کام کرو۔'' اس نے کرن کو ڈانٹ دیا۔ نوین اور کرن ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ ان دونوں کو اپنی ماں اور بہن کی سوچوں پر دکھ ہورہا تھا جو پتا نہیں کیوں نہیں سوچ رہی تھیں۔

''آپ کو اس طرح کرنے سے کچھ حاصل وصول نہیں ہوگا۔''

''میں حباب کو بھی ضمران کے ساتھ رہنے نہیں دوں گی۔ دونوں کو الگ کروا کے رہوں گی۔'' اس نے نوین کو بتایا نوشین کی آنکھوں میں تو جیسے خون اترا ہوا تھا۔

''نوین چھوڑو ان کو ان کے حالوں پر جیسے ابو نے چھوڑ دیا ہے۔'' کرن نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''دونوں لڑکیوں کو دیکھو کیسے میرے منہ کو آرہی ہیں۔''

''امی ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ ہماری ماں ہیں اور آپی ہماری بہن ہیں۔ میں نہیں چاہتی کوئی آپ دونوں کو برا کہے پلیز آپ دونوں اپنی سوچوں کو وسیع کریں غلط سوچنا بند کریں دوسروں کی خوشی میں خوش رہنا سیکھیں۔'' نوین مدبرانہ انداز میں سمجھا رہی تھی۔

نوشین تو ہنکارے ہی چلی گئی اور راشدہ اسے گھورنے لگیں۔

''دونوں اپنے باپ پر گئی ہیں جیسے وہ کسی کی نہیں سنتا ایسی تم ہو۔'' انہوں نے نوین کو برہم ہوتے کہا۔

نوین اپنا سر تاسف سے ہاتھوں میں تھام کے ہی رہ گئی کیوں کہ اس وقت راشدہ اور نوشین جیسے کچھ سوچنا سمجھنا نہیں چاہتی تھیں غصے اور رقابت کی آگ میں دونوں جل رہی تھیں۔

☆......☆

''یار! میں نے تجھ سے ایک کام کہا تھا۔'' اشعر اسے اپنی گزشتہ دنوں کہی گئی بات یاد دلانے لگا۔

''تمہیں اپنی پڑی ہے وہاں گھر میں الگ ہنگامہ پڑا ہے۔ ایسے میں مجھے خوشنما سے بات کرنے کا بھی موقع نہیں ملا۔'' ہیثم خاصا پریشان اپنی ریوالونگ چیئر پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

''خیریت تو ہے۔'' اشعر نے بھی فکرمندی سے پوچھا۔

''یار! وہی میرا جھوٹ میرے لیے مسئلہ بن رہا ہے۔''

''جھوٹ۔'' وہ سمجھا نہیں۔

''وہی جو میں نے خوشنما کو گھیرنے کے لیے کیا تھا کہ میں نے نکاح کرلیا ہے۔''

''تم نے ابھی تک کسی کو حقیقت نہیں بتائی کہ وہ خوشنما تھی۔'' اشعر گویا ہوا۔

''نہیں نا میں نے کسی کو یہ تھوڑی ہی بتایا ہے خوشنما میرے آفس میں جاب کرتی تھی اور میں بتانا بھی نہیں چاہتا۔'' ہیثم خاصی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔

''ایسے میں بھابی کیا کہتی ہیں؟''

''ارے اس سے تو میری بات ہی نہیں ہورہی ہے۔'' ہیثم نے اپنے اور اس کے درمیان کی ناراضی بھی اسے بتادی۔

''تم بھی اتنی سی بات لے کے بیٹھ گئے ان کا غصہ بجا ہے تم نے کون سا ان کے ساتھ اچھا کیا تھا۔'' اس نے ہیثم کو احساس دلایا۔

''یار! ہر بات کی حد ہوتی ہے ایک بندہ جھکا جارہا ہے مگر اسے ذرا احساس نہیں۔'' وہ خاصا جھنجھلایا ہوا تھا۔

''یار! میرے مسئلے کا کیا ہوگا۔ امی مجھے فورس کررہی ہیں۔ شادی کرو جب تک میں بھابی سے بات نہیں کرلوں گا کیسے بات آگے بڑھ سکتی ہے۔''

''تم ایسا کرو خوشنما کو کال کرلو۔''

''نانا میں خود سے!'' وہ گھبرایا۔

''تم تو ایسے گھبرا رہے ہو جیسے لڑکی کو اپنے رشتے کی بات کرتے ہوئے جھجکتے رہیں۔''

''میری بھابی سے ایسی کوئی زیادہ بات چیت نہیں ہے تم خود ہی یہ کام سرانجام دے دو پلیز بعد میں میرے بچے بھی دعا دیں گے۔'' وہ منت بھرے انداز میں گویا ہوا۔

''چل بکواس نہیں کر پہلے شادی تو کرلے بچے بعد کی بات ہے۔'' ہیثم کے چہرے پر بھی ایک سایہ سا آکے گزر گیا۔

''یار بچے بھی اللہ کی نعمت ہوتے ہیں کیسے زندگی میں رونق آجاتی ہے۔''

''اے ہیلو کیا بات ہے کوئی خوش خبری ہے کیا۔'' اشعر نے معنی خیزی سے مسکرا کے پوچھا۔

''نن......نہیں......تو۔'' وہ سیدھا ہوگیا۔ ''خوشنما ایسے حالات ہی نہیں پیدا کررہی کہ ایسی کوئی بات ہو۔''

''وہ تو میں تمہاری بات پر کہہ رہا تھا۔'' اس نے انٹرکام پر جوس کا آرڈر دیا۔

''میں آج خوشنما سے بات کروں گا۔''

''بچے کے متعلق۔'' اشعر نے جھٹ سے کہا۔

''یار! کیا بکواس ہے۔'' وہ جھینپ گیا۔

''تمہارے رشتے کی تمہارا کیا ارادہ ہے ویسے یار جو ہم بھی بری نہیں ہے۔''

''دیکھو ہیثم! میں نے تمہاری کزن کو صرف تمہاری شادی پر دیکھا تھا اور میں ایسا کچھ اس کے متعلق جانتا بھی نہیں ہوں۔''

''اچھی لڑکی ہے تمہیں خوش رکھے گی۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے مگر مجھے کچھ میچور لڑکی چاہیے رمنا اس کے مقابلے میں سمجھدار ہے کیوں کہ میں نے اس کی سمجھداری دیکھی ہے۔''

''سوچ لو تمہاری بھابی کی طرح نہ نکلے یہ بھی تمہیں بھی تڑا کے کے لے جائے۔'' ہیثم نے مسکرا کے آگہی دی۔

''جب خوشنما بھابی تمہیں تڑا کے نہیں گئیں۔ وہ بھی انہی کی بہن ہے ایسا بالکل نہیں کرے گی۔'' اشعر کو

جیسے اس پر بہت یقین تھا۔
''خوشنما کی تو بات ہی نہیں کرو۔'' وہ اس دن کے بعد سے خوشنما سے بہت مایوس ہو گیا تھا۔
''میں بھابی کی بات ضرور کروں گا کیوں کہ تمہاری لائف انہوں نے اچھی بنا دی ہے تمہارا بزنس اور تمہیں بھی۔''
''ہوں۔'' ہیثم نے جیسے اس کی بات سے اتفاق بھی کیا۔
اتنے میں جوس بھی آ گیا تھا۔ دونوں ہی سنبھل گئے۔
''یار! اب میں چلوں گا کیونکہ میں تو آج جلدی آفس سے اٹھ کے آ گیا تھا امی کا چیک اپ کروانا ہے۔'' اس نے جلدی جلدی جوس کا گلاس ختم کیا۔
''سن جلدی بات کر لینا۔''
''ہاں ہاں کر لوں گا بہت بے قراری ہے۔'' وہ معنی خیزی سے کہہ کر ہنسا تھا۔
اشعر پھر اس سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا تھا۔

☆......☆

''کسی دن شہریار کو اس کی مسز کو کھانا پر بلا لیتے ہیں۔'' ضمران نے اسے مخاطب کیا جو سارے کام سے فارغ ہو کے کمرے میں آ گئی تھی۔
''شہریار ماموں منع کر رہے تھے۔'' اپنے دراز بالوں میں برش پھیرنے کے لیے اٹھا رہی تھی۔
''بٹ وائے۔'' وہ تکیوں کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔
''کہہ رہے تھے کھانے پر بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم خود کسی دن آ جائیں گے۔''
''شہریار! بھی عجیب ہے بھانجی کا گھر سمجھ کے گریز کر رہا ہے۔''
''ہوں شاید۔'' اس نے صرف سر ہلایا۔
''پھر میں خود ہی بات کر لوں گا۔'' اسی دوران دروازے پر ناک ہو گئی۔
''ارے بھئی کون ہے آ جاؤ۔'' ضمران نے چونک کے کہا۔
''واقعی آ جاؤں۔'' مزمل کی شوخ آواز ابھری
''ہاں یار۔'' وہ ہنسا۔
''آپ دونوں کے لیے ایک اطلاع ہے دادی جان آئی ہیں۔ آپ دونوں کو پوچھ رہی تھیں امی نے کہا کہ میں آپ کو بلا کے لے آؤں۔'' حباب تو گھبرانے لگی ان کی آمد کسی طوفان سے تو کم نہیں تھی۔
''ابو کے آنے کی خبر ہو گئی ہو گی راشدہ پھپھو سے کہاں برداشت ہو رہا ہو گا سوچا آگ لگا کے تماشا دیکھ لوں۔''
''مزمل کوئی فضول بات نہیں۔'' ضمران نے ٹوکا۔
''بھائی جان مزے کی بات بتاؤں ابو تو دادی جان کو قصوروار ٹھہرا رہے ہیں۔''
''تم کیا ان باتوں میں پڑے ہو جاؤ اور ہاں بڑوں کی باتوں میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔''
''او کے...... او کے۔'' اس نے گم صم حباب کو دیکھا۔ جو لب کچلتی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔
''بھابی کو لگتا ہے، دادی جان کا آنا فکر مند کر رہا ہے۔''

''تم فضول بکواس میں لگ جاؤ ایسی کوئی بات ہے جاؤ تم۔'' مزمل مسکراتا ہوا چلا گیا۔ ضمران کی نگاہیں اس پر چلی گئیں۔
''حباب تم گھبراؤ نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں۔''
''مگر وہ تو پھر پوچھنے لگیں گی میں کیا جواب دوں گی۔'' وہ حیران پریشان سی سکتے کے عالم تھی۔
''کیا تو پوچھیں گی......'' وہ جیسے سمجھا نہیں۔
''یہی کہ کچھ نہیں۔'' اسے احساس ہوا تو وہ جھینپ کے رہ گئی وہ کیا بولنے والی تھی۔
''ابھی تم جو کچھ سوچ رہی ہو بعد میں سوچ لینا۔'' ضمران نے جلدی جیسے چپل پاؤں میں ڈالی۔ اس نے بھی بالوں کو سمیٹ کر کیچر لگا کے کھلے چھوڑ دیے۔ ضمران کی ہمراہی میں جھجکتے ہوئے باہر آ گئی۔ ابھی وہ لوگ عتیق احمد کے کمرے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ عتیق کی آواز پر رکے۔
''آپ نے کبھی مجھ سے پیار ہی نہیں کیا میرے بچوں اور بیوی کو در در بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا میری تو غلطی تھی ہی کبھی آپ نے مجھے اچھی صلاح نہیں دی۔ مجھے گمراہ ہی کرتی رہیں اور راشدہ اس نے بھی کبھی کوئی اچھی بات نہیں کی۔ مجھے اپنے گھر میں رکھا اور خود میری بیوی اور بچوں سے ملتی رہی اور آ کے برائیاں ہی کرتی رہی۔ آپ نے بھی اسے نہیں سمجھایا۔'' عتیق احمد کی روہانسی آواز نکل رہی تھی۔
''مجھے خود عقل نہیں تھی۔'' دادی جان بولیں۔ ضمران نے جب دیکھا بات بہت زیادہ تلخی میں جا رہی ہے تو وہ اندر آ گیا۔
''امی! یہ میرے بچے ہیں ان کی رضوانہ نے بہت اچھی تربیت کی ہے اتنے سال گزرنے کے بعد بھی ان بچوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اگر نوین میری آنکھیں نہیں کھولتی تو میں شاید ایسے ہی زندگی گزارتا رہتا۔
''وہ نوین بھی بہت گھنی ہے۔ ماں کا دماغ خراب کر رکھا ہے اس نے۔'' دادی جان کو نوین کی بھی خبریں مل گئی تھیں۔
''کیوں آپ کو خوشی نہیں ہوئی میں اپنے بچوں سے مل گیا۔'' وہ انہیں حیرانگی سے دیکھ رہے تھے جو ذرا بھی خوش نہیں لگ رہی تھیں۔
''عتیق احمد دیکھنا یہ بچے تجھے ایک دن لات مار کے نکال دیں گے وہ آدم اس کی تو زبان ہی بہت چلتی ہے وہ تو تجھے بالکل برداشت نہیں کرے گا۔''
رضوانہ چپ بیٹھی تھیں۔ ان ماں بیٹے کی باتوں میں مداخلت نہیں کر رہی تھیں مگر انہیں اس رات کا بہت دکھ ہو رہا تھا کہ کیسی ماں تھیں بیٹے کو پھر غلط بات کر کے چڑھا رہی تھیں۔
حباب تو ان کی بزرگی کا خیال کر کے خاموش تھی۔ ورنہ وہ بھی بول سکتی تھی۔
''کوئی بات نہیں میرے چاروں بیٹوں میں سے کوئی تو ایک ہو گا جو اپنے باپ کو رکھ لے گا۔''
''ارے ابو آپ بالکل بھی ایسا نہیں سوچیں ہم آپ کے بیٹے ہیں ہم ایسا بالکل نہیں کریں گے دادی جان سے آدم ذرا تلخ ہو جاتا ہے تو یہ ایسا بول رہی ہیں ورنہ آدم ایسا نہیں ہے۔'' ضمران نے حمایت میں وضاحت دی۔
''بیٹا مجھے اندازہ ہے مگر میری ماں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ صحیح اور غلط کا انہیں اندازہ نہیں ہو رہا۔''

''چل چل مجھے سب اندازہ ہے۔'' وہ ہاتھ اٹھا کے بولیں۔

''اے لڑکی تمہیں سلام دعا سب بھول گیا۔'' ان کا نزلہ حباب پر گرا وہ تو ویسے ہی پہلے سے گھبرائی ہوئی تھی۔ جھٹ سلام کیا۔

''رضوانہ چائے تو بنا کے بھیج دینا میں باہر بیٹھا ہوں۔'' عتیق احمد بہت تھکے تھکے ہو گئے تھے۔ انہیں اپنی ماں کا رویہ اور سوچ پر بہت دکھ اور افسوس ہو رہا تھا۔

''ہاں ماں کی شکل بری لگ رہی ہے۔''

''امی ایسی کوئی بات نہیں ہے میرے سر میں درد ہو رہا ہے نیند بھی آ رہی ہے۔'' انہوں نے عذر پیش کیا۔

''ابو آپ اپنے کمرے میں ہی آرام کریں ہم صبح ملتے ہیں۔'' ضمران نے ہی ماحول کی تلخی کو دور کرنا چاہا۔

''آدم آ جائے میں پھر سوؤں گا۔'' وہ جب سے یہاں آئے تھے ان کے اندر بچوں کی محبت اور زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

دادی جان عتیق احمد کے بیڈ پر ہی دراز ہو گئیں۔

''بیٹا تم جاؤ آرام کرو۔'' انہوں نے حباب کے سر پر ہاتھ رکھا۔

ضمران اور وہ دونوں چلے گئے۔ عتیق احمد کو یہی دکھ اور افسوس تھا۔ ان کی ماں کو کوئی پشیمانی اور دکھ نہیں تھا وہ کتنے سالوں سے اپنے بیوی اور بچوں سے دور تھے۔

''رضوانہ تم بے فکر ہو جانا اب مجھے کوئی بھی گمراہ نہیں کر سکتا۔'' انہوں نے کچن میں چائے بناتی رضوانہ سے کہا کیوں کہ ان کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔

☆......☆

وہ سب رات میں کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اپنے اپنے کمروں کا رخ کر رہے تھے۔ جب کہ ہیشم گہری سوچ میں ڈوبا ہال کمرے میں بیٹھا تھا۔ اشعر نے بھی ایک ذمہ داری اسے سونپی تھی اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا خوشنما سے بات کرے یا نہیں کیوں کہ اس دن کے بعد سے وہ اس سے ہنوز اسی طرح ناراضی رکھے ہوئے تھا اس نے ذرا زوردار انداز میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا تھا۔ وہ تو اچھل ہی گئی بیڈشیٹ ٹھیک کر رہی تھی۔ دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہوا۔ ڈارک میرون پرنٹڈ کپڑوں میں اس کی سرخ و سپید رنگت اور زیادہ چمک رہی تھی یا پھر وہ دن بہ دن نکھرتی جا رہی تھی۔ اس کا ایک ایک نقش اتنا حسین تھا وہ اکثر رات کے اندھیرے میں نائٹ بلب کی ملگجی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھتا رہتا تھا۔ کیوں کہ دن کے اجالے میں تو وہ اس کی جانب دیکھنے سے گریز کرتا تھا۔

خوشنما نے اپنے چہرے کا رخ نیچے کیا اور بیڈشیٹ کی شکنیں ہاتھوں سے نکالنے لگی تھی۔

''کیسے بات کروں اور اب میں اس سے بات کروں، کبھی نہیں میری ہر وقت توہین اور تضحیک کیے جاتی ہے میں پھر بھی نرم پڑ جاتا ہوں مگر اب نہیں جھکوں گا۔'' ڈریسنگ ٹیبل پر اپنا سیل رکھا اور چینج کرنے کے لیے واش روم گھس گیا۔

''لگتا ہے زیادہ ہی برا لگ گیا ہے جو اتنے دن گزرنے کے بعد بھی بات نہیں کر رہے ہیں۔'' خوشنما کو اس کی یہ خاموشی کسی حیرانگی سے کم نہیں لگ رہی تھی وہ بات نہیں کر رہا تھا تو یہ بھی اسے مخاطب نہیں کر رہی تھی۔

یہی تو وہ چاہتی تھی اس شخص کو پل پل کی مار مارے اور اسے احساس ہو بے عزتی کیا چیز ہوتی ہے۔ سوچے جا رہی تھی اور اپنا کام بھی کیے جا رہی تھی۔ بال ایک دم ہی آبشار کی طرح بکھر کے پشت پر لہرانے لگے۔ ہیشم اسی وقت واش روم سے ایزی سے قمیض شلوار میں ملبوس باہر آیا تھا اس نے جلدی سے بالوں کو سمیٹا تھا وہ بیڈ پر تکیہ درست کر کے لیٹ گیا۔

خوشنما جھجک کے پیچھے ہٹ گئی تھی۔

''موصوف کو کچھ زیادہ ہی برا لگ گیا ہے۔'' وہ اسے چوری چھپے دیکھنے لگی اس وقت ہیشم نے اس کی چوری پکڑی وہ گڑبڑا کے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی تھی۔

وہ اٹھا اور بیڈ کی سائیڈ کی لائٹ آف کر دی۔ آدھے حصے میں بیڈروم سیٹ تھا اور آدھے میں ڈریسنگ ٹیبل اور دیگر فرنیچر سیٹ تھا۔ ہیشم ذرا اسٹائلش بندہ تھا۔ اس نے اپنا بیڈروم بھی اسٹائلش ہی سیٹ کیا تھا۔

''پلیز یہ کھٹر پٹر بعد میں کر لینا میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔'' اس نے ناگواری سے کہہ کر اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔

''اگر زیادہ ہی میں آپ کو بری لگ رہی ہوں تو مجھے روانہ کیوں نہیں کر دیتے۔'' وہ تیز لہجے میں دھاڑی۔

''پلیز آہستہ بولو اور مجھ پر دھاڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں پہلے ہی پریشان ہوں۔'' وہ نانا جان کے فیصلے کی وجہ سے بہت الجھا ہوا تھا۔

''جو دوسروں کو پریشان کرتے ہیں بعد میں خود ہی اپنی پریشانیوں میں الجھ جاتے ہیں۔'' خوشنما نے گہرا طنز کیا۔

''پلیز! اگر درد کم نہیں کر سکتی ہو۔ پریشانی دور نہیں کر سکتی ہو تو مرچیں لگانے کا کام بھی نہیں کرو۔'' وہ تو بری طرح بھنایا مگر خود کو کنٹرول میں رکھا ہوا تھا۔ وہ ایسا کوئی ری ایکٹ نہیں کرنا چاہتا تھا جو بعد میں پھر خوشنما کو اس کی کمزوری ہاتھ لگ جائے۔

''درد اور پریشانی آپ کو کیا پتا کیا ہوتی ہے۔'' وہ ترش روی سے جلتا ہوا تیر اس پر اچھالنے لگی۔

''تم کیا چاہتی ہو میں سولی پر ٹنگ جاؤں کیوں کہ تمہارا بدلہ ہی پورا نہیں ہو رہا۔ ایک شخص معافیاں مانگ رہا ہے مگر تم ایسی بے حس بن گئی ہو کہ ذرا احساس نہیں۔'' وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔

خوشنما نے دیکھا اس کا چہرہ پریشانی اور غصے کی وجہ سے تمتما رہا تھا۔

''ہاں میں بے حس ہوں اور مجھے احساس نہیں سارے احساس تو آپ رکھتے ہیں۔'' وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

''اگر بعد میں نتائج کا اندازہ نہیں ہوا کرے تو جذبات میں آ کر غلط بات نہیں کیا کریں۔'' وہ طنزیہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''ساری پریشانیاں آپ کی پیدا کردہ ہیں۔ ایک جھوٹ کو جھوٹ کیسے ثابت کریں گے یہ آپ کا درد سر ہے میرا نہیں۔'' وہ یہ کہہ کر کمرے سے ہی نکل گئی۔ وہ اتنی تو بے حس بالکل نہیں تھی ہیشم کتنا اسے منانے کی کوشش کر چکا تھا۔ اس کے لیے بڑی مامی تک سے لڑ لیا۔ اتنا تو وہ اس کے ساتھ برا نہیں تھا اسے بھی بعد میں یقین دلانا مشکل ہو جائے۔ ہیشم کو اپنی غلطی کا احساس تھا اور کیا چاہیے تھا۔

☆......☆

وہ ابھی تک پڑی ہوئی سو رہی تھی اور وہ اسے کئی آوازیں بھی دے چکا تھا۔

"حسنیٰ کم آن یار اٹھ جاؤ۔" وہ بہت بے زار کھڑا تھا۔ بھوک سے برا حال تھا اور نازیہ بھابی تو ابھی تک نہیں اٹھی تھیں۔ حسین بیگم بھی سو رہی تھیں اور وہ کچن میں کبھی اپنے لیے کچھ بنانے گیا نہیں تھا۔

"آپ کو کھانے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں ہوتا۔" وہ تو جلبلا ہی گئی۔

"سنو! زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارا شوہر ہوں کوئی ملازم نہیں ہوں۔" اس نے حسنیٰ کی کلائی پکڑی اور اٹھا کے بٹھا دیا وہ تو تکلیف سے چیخ ہی پڑی۔

"کیا وحشت ہے۔" وہ کلائی چھڑا کے سہلانے لگی۔

"تم بکواس کرتی رہو اور میں سنتا رہوں۔"

"میں ابھی نئی دلہن ہوں آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو ذرا بھی خیال نہیں ہے چاہتے ہیں کہ کولہو کا بیل بنی رہوں۔" وہ تو غصے میں دانت پیسنے لگی۔

"تمہاری ماں نے بھی تو اپنی بھتیجی کو کولہو کا بیل بنایا ہوا ہے اس کے لیے تو کبھی احساس نہیں کیا ایسا۔" شہریار دبنے والوں میں سے تو تھا ہی نہیں۔ وہ حسنیٰ پہ رعب اور دھونس رکھے ہوئے کہ جیسے اگلے پچھلے سارے حساب اس سے لے رہا ہو۔

"آپ کو بڑا خیال ہے میری ماں کی بھتیجی کا۔" اس نے تمسخرانہ انداز میں طنز ہی کیا۔

"فضول بکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ ناشتہ بناؤ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" وہ اسے حکم دے کے صوفے پر دھڑ سے لیٹا تھا۔

حسنیٰ دانت پیس رہی تھی اس گھر میں آ کے اسے لگتا تھا کسی کو بھی فکر نہیں نہ ہی عزت و قدر ہے۔

"الٹا سیدھا سوچتی رہو گی تو ایسے ہی برے منہ بناتی رہو گی۔" وہ اس کے چہرے کے زاویے دیکھ رہا تھا۔ وہ تلملا کے واش روم میں گھس گئی۔

"حسنیٰ بیگم جب تک تم اپنے مزاج میں تبدیلی نہیں لاؤ گی میں ایسے ہی تمہاری بے عزتی کرتا رہوں گا۔ تمہارا دماغ ہمیشہ آسمان پر رہتا ہے۔" شہریار سوچے جا رہا تھا۔ حسنیٰ باہر نکل کے اسے گھورنے لگی۔

"تمہیں لگتا ہے یہ احساس نہیں کہ میں تمہارا شوہر ہوں۔"

"شوہر ہیں تو کیا سر پر بیٹھا کے ناچوں۔" وہ تو تنک ہی گئی۔

"شٹ اپ تمہیں ذرا بڑے چھوٹے کی تمیز نہیں ہے۔"

"آپ کو جیسے بہت ہے۔" بالوں کو تیزی سے برش چلا کے سیدھے کر رہی تھی۔

"خیر میں تو اپنی بات کر ہی نہیں رہا۔" اس نے سیل پر کال چیک کی۔

اور وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اسے سب کا ہی ناشتہ بنانا پڑا تھا۔ حسنیٰ بیگم تو کب کسی کے احسان ماننے والوں میں سے تھیں۔

"ہمارے ہاں تو بہوئیں گھر کے سارے کام کرتی ہی ہیں۔" وہ پراٹھے کا لقمہ منہ میں رکھ کے گویا ہوئیں۔

حسنیٰ غصے میں پہلو بدل کے رہ گئی۔

"ہاں بہوؤں کے دل تو ہوتے نہیں ہیں وہ محض نوکرانیاں ہوتی ہیں اپنے ماں باپ کے گھر فالتو ہوتی ہیں جو سسرال بھیج کے ایک نوکرانی مہیا جو کر دیتے ہیں۔" وہ دل ہی دل میں بہت بھنا رہی تھی غصے میں ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ کسی نے بھی اسے ناشتہ کا کہا بھی نہیں تھا۔

شہریار اس کا غصہ سب سمجھ رہا تھا مگر وہ بھی کچھ نہیں بولا تھا۔

"مجھے کچھ دنوں کے لیے گھر جانا ہے۔"

"کیوں خیریت؟" شہریار نے حیرانگی سے پوچھا۔

"میرا دل چاہ رہا ہے مما یاد آ رہی ہیں۔"

"کام سے بچنے کے طریقے ہیں۔" وہ حسنیٰ کو ہر طرح سے ہی سلگا کر رکھتا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے جب سے ہماری شادی ہوئی ہے میں ابھی تک رکنے نہیں گئی۔" وہ خاصی برا مان کے گویا ہوئی تھی۔

"ابھی تو تم نہیں جا سکتیں۔ کیونکہ میری چند دن کی چھٹیاں اور ہیں پھر تم بعد میں رکنے چلی جانا۔" وہ ٹی وی کی اسکرین پر ہنوز نگاہ جمائے بیٹھا تھا۔

حسنیٰ نے حیرت بھری نگاہ اس پر ڈالی جب سے شادی ہوئی تھی شہریار نے ایک دفعہ بھی اس سے پیار بھرے لہجے میں بات نہیں کی تھی نہ ہی وہ اسے وہ کھانے کے لیے باہر لے کے گیا تھا اس کا بھی دل چاہتا تھا شہریار بھی اس کے ناز نخرے اٹھائے مگر وہ تو اس سے لٹھ مار ہی انداز میں بات کرتا تھا حسنیٰ جانتی تھی اس کی ذمہ دار بھی شہریار اس سے بدلے ہی لے رہا تھا۔ وہ اس کے آگے جھکنے کو تیار نہیں تھی اور شہریار اس پر توجہ دیتا نہیں تھا۔

"پتا نہیں ایسے کیسے کب تک چلے گا۔" وہ سوچ رہی تھی۔

☆......☆

"آخر کب تک وہ اس کے ساتھ ایسا کرے گی۔" کتنا وہ اس کا خیال رکھتا تھا اور وہ جواب میں اسے کیا دے رہی تھی۔ بے رخی مگر وہ بھی کیا کرے۔

"نہیں تم غلط ہو۔" اندر سے کوئی بول رہا تھا۔

وہ جھنجھلائی ہوئی بیٹھی تھی۔ دل اس کا بہت اداس تھا ضمران کی دادی کی باتیں اسے برداشت نہیں ہوتی تھیں۔ وہ اور زیادہ ضمران سے دور ہو رہی تھی نوشین کے نام کی غلط فہمی تھی دل میں بال رکھتی تھی حالانکہ صوفی نے اور ضمران نے کلیئر بھی کر دیا تھا ایسی کوئی بات نہیں ہے مگر جانے کیوں حباب کو ایسا لگتا تھا اس نے نوشین کے حق پر ڈاکا ڈالا ہے جب کہ ضمران کی ذرا بھی توجہ نوشین کی طرف نہیں تھی۔

"حباب، شہریار کی کال ہے وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" ضمران کی آواز پر وہ چونک گئی۔ ناشتے کے بعد وہ برتن دھو رہی تھی۔

شہریار سے بات کرنے لگی تھی۔

"جی کوشش کرتی ہوں آ جاؤں گی۔" اس نے کہا تھا۔ شہریار اسے گھر بلا رہا تھا اس نے رات میں کھانے پر سب کو بھی بلایا تھا اور ناہید کو بھی مگر ناہید کو ... سے فرصت نہیں تھی اس لیے انہوں نے

معذرت کر لی تھی۔
"ناہید باجی نہیں آ رہیں۔" شہریار بولا۔
"اچھا اچھا آ جاؤں گی میں۔" اس نے کہا اور پھر سیل آف کیا۔
"شہریار ماموں مجھے بلا رہے ہیں۔"
"چلی جاؤ میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔ میں آفس کے لیے تیار ہو رہا ہوں۔ جب تک تم ریڈی ہو جاؤ گی۔" اس نے کہا۔
"میں اتنی جلدی تو نہیں جا سکتی آپ آفس چلے جائیں۔ میں خود چلی جاؤں گی کیوں کہ ابھی کچن کا کام بھی رہتا ہے۔" وہ اپنی ذمے داریوں سے بھاگتی نہیں تھی۔
"ٹھیک ہے جیسا تم مناسب سمجھو میں امی کو کہہ دوں گا وہ تمہارے ساتھ چلی جائیں گی۔" میں نے کہا۔
حباب نے پھر بقیہ کام سمیٹا دوپہر کا سالن بنا دیا تھا ضمران کی دادی ابھی گھر میں موجود تھیں ان کے اعتراضات بھی ہوتے رہتے اس لیے بہت سارے کام ختم کیے اور پھر وہ بارہ بجے تک چلی گئی تھی۔
"اور سناؤ تمہارے سسر صاحب سے کیسی بنی تمہاری۔"
"وہ بہت اچھے ہیں بہت خیال بھی کرتے ہیں۔" حباب نے عتیق احمد کی تعریف میں بتایا۔
"نوشین کوئی گڑبڑ تو نہیں کرتی۔" اس نے پھر پوچھا۔
شہریار اندر آ رہا تھا۔ حسنیٰ کی بات پر باہر ہی رک گیا تجسس بھی ہوا کیوں کہ اسے اتنا اندازہ تھا اور وہ جانتا تھا کہ حباب ابھی تک بھی اپنی سسرال میں ایڈجسٹ نہیں ہوئی ہے۔
"حسنیٰ آنٹی مجھے ایسا لگتا ہے میں نے نوشین کے ساتھ زیادتی کی ہے۔"
"بے وقوفی کی بات نہیں کرو، نوشین میں جب ضمران بھائی اور ان کے گھر والے انٹرسٹ ہی نہیں رکھتے تھے تو تم نے کہاں سے زیادتی کر دی۔" وہ اس کی بے وقوفی پر گویا ہوئی۔
"ضمران تمہارا شوہر ہے اس کے ساتھ ظلم نہیں کرو اگر تم اسی طرح انہیں اگنور کرتی رہو گی اور طنز کرو گی ضمران بھائی تم سے دور ہو جائیں گے اور نوشین کو موقع مل جائے گا۔ تم ان کی بیوی ہو پورا پورا حق رکھتی ہو، اتنا تم سے پیار کرتے ہیں اور تم ابھی تک ایسی ہی زندگی گزار رہی ہو۔" شہریار کو حسنیٰ کی ایسی مدبرانہ باتوں کی توقع نہیں تھی وہ کتنی سمجھ داری سے حباب کو سمجھا رہی تھی۔
"شوہر کو اگنور کیے جانا سخت برا لگتا ہے، جب کہ تمہارا شوہر تو اتنا نرم مزاج ہے تمہاری کسی بات پر غصہ نہیں کرتا۔ شکر ادا کرو۔" حسنیٰ کے لہجے میں حسرت تھی کیوں کہ شہریار تو سوائے اسے طنز کرنے کے اور ڈانٹنے کے کچھ کرتا ہی نہیں تھا۔
"مجھے احساس ہے میں ضمران کے ساتھ غلط کر رہی ہوں۔" حباب نے یہ بات قبول بھی کی۔
"تمہارے دماغ میں جو بھی فضولیات ہیں انہیں دفع کرو اور ضمران بھائی کے ساتھ ہنسی خوشی رہو۔"
حباب نے اسے بڑی گہری نگاہوں دیکھا جیسے حسنیٰ کو جانچا ہو۔
"اور آپ نے شہریار ماموں کے ساتھ ایڈجسٹ کر لیا۔" اس نے معنی خیزی سے پوچھا۔
"جب نکاح پڑھوا لیا تو ایڈجسٹ بھی کر لیا یہ الگ بات ہے تمہارے ماموں میرے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو رہے ہیں۔" اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ بھی تو انہیں شادی سے پہلے کیا کیا نہیں کہتی تھیں۔"
"وہ سب میں شادی نہ کرنے کی وجہ سے کہتی تھی۔" اس نے وضاحت دی۔
"اب کیا کہتی ہیں۔" مسکراتے اور شرارتی لہجے میں پوچھا۔
"اب وہ ہی سب کچھ کہتے رہتے ہیں مجھے موقع ہی نہیں ملتا تمہارے ماموں غصہ بہت کرتے ہیں۔ کبھی جو اس انسان نے پیار بھری بات کی ہو۔" وہ شکایت ہی کرنے لگی۔
شہریار نے اسی وقت اندر قدم رکھا۔ دونوں ہی سنبھل گئیں۔
"کہیں انہوں نے میری بات تو نہیں سن لی۔" حسنیٰ گھبرا کے نگاہ چرانے لگی۔
"کیا بات ہے کب سے باتوں میں لگی ہو کچھ کھانا وغیرہ بھی ملے گا یا نہیں۔" اس نے حسنیٰ کو مخاطب کیا۔
"دیکھا ہر وقت کھانا پینا ہی مانگتے رہتے ہیں۔" اس نے حباب کے کان میں سرگوشی کی۔ اس کی تو ہنسی نکل گئی۔
"کیا کہا ہے میری بھانجی کے کان میں۔" شہریار سمجھ گیا تھا اس کے متعلق ہی کچھ کہا ہوگا۔
"شہریار ماموں! آپ حسنیٰ آنٹی سے کبھی پیار و محبت سے بھی بات کر لیا کریں۔"
حسنیٰ اسے آنکھیں دکھانے لگی۔ اسے شہریار کے سامنے ایسی بات پر حیا بھی آئی۔
"اچھا تو میری شکایتیں لگائی ہیں تم نے۔"
"جی نہیں میں کیوں لگاؤں گی شکایتیں۔" وہ گڑبڑا کے رہ گئی۔
"حباب! میں کچن میں جا رہی ہوں تم وہیں آ جانا۔" اس نے اپنی جان بچانے میں ہی عافیت جانی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ شہریار کے لب مسکرانے لگے تھے۔ اسے حسنیٰ آج بہت مختلف لگی تھی۔

☆......☆

"نزہت تو جیسے ہر کسی سے بائیکاٹ کیے ہوئے تھیں۔ وہ ابھی تک بھی فاران کی دلہن کو دیکھنے نہیں گئی تھیں۔ مرتضیٰ علی نے شاہدہ اور خوشنما کو بھیج دیا۔
فاران نے بھی زبردستی ہی نکاح کیا تھا کیوں کہ اسے معلوم تھا اس کی ماں کبھی بھی نہیں چاہے گی مریم فاران کی کلاس فیلو تھی۔ وہ شروع سے اسے پسند کرتا آ رہا تھا۔ اس لیے پڑھائی ختم ہونے کے بعد بھی اس نے مریم سے رابطہ نہیں توڑا تھا۔ مریم متوسط گھرانے کی لڑکی تھی۔ وہ اکلوتی تھی اس کے ماں باپ کچھ عرصہ پہلے ہی چل بسے تھے۔ وہ اپنی خالہ کے گھر رہتی تھی۔ فاران نے خالہ کو مجبور کیا کہ وہ نکاح کر دیں، وہ اپنی ماں کو ساتھ لائے گا تو رخصتی بھی کروا لے گا مگر اسے نہیں خبر تھی کہ اس کی ماں اتنی سخت دل عورت ہوں گی۔ وہ اپنی ضد پر ہی اڑی رہیں گی آج وہ پھر ہمت کر کے ان کے کمرے میں چلا آیا تھا۔
"امی آپ میری ذرا سی بات نہیں سنیں گی۔"
"مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی چلے جاؤ۔" وہ پشت پھیرے ہوئے تھیں۔
"امی! سوچ لیجیے گا آپ، میں اس گھر سے ہی ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔ میری صورت تک کو ترس جائیں گی۔"
"مجھے ایسی دھمکی دے کے ڈرا نہیں سکتے۔"

''امی میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ خاصا سنجیدہ تھا۔

''اولاد کو پال پوس کے بڑا کرو اور وہ ماں و باپ کو یہ انعام دیتے ہیں۔'' وہ تو کلس رہی تھیں۔

''تم نے میرے اعتماد کو توڑا اور میرے ارمانوں کو بھی کتنی خواہش تھی میں اپنے بیٹے کی اپنی پسند سے شادی کروں گی۔''

''آپ ایک دفعہ مریم سے مل تو لیں۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔''

''مجھے نہیں ملنا۔'' وہ اتنی سخت دل ہوگئی تھیں فاران بہت مایوس اور افسردہ ہوگیا تھا۔

''ٹھیک ہے آپ مجھے معاف کریں گی اور مریم کو اپنی بہو تسلیم نہیں کریں گی تو میں اسے چھوڑ دیتا ہوں مگر یاد رکھیے گا ساری زندگی شادی نہیں کروں گا دوبارہ۔'' وہ یہ کہہ کر رکا نہیں چلا گیا۔

نزہت تو ہکا بکا رہ گئی تھیں۔ وہ یہ کیا کہہ کر چلا گیا تھا۔ ان کا دل بے چین ہوا۔

فاران سید حامر تضیٰ علی کے پاس گیا تھا۔ ان سے بھی یہی بات کی وہ تو ایک دم غصے میں آگئے۔

''تمہارا دماغ خراب ہے ایک لڑکی کو خود سے باندھا اور اسے چھوڑنے کی بات کر رہے ہو پہلے تو بے وقوفی کی ہی تھی دوبارہ سے یہ غلطی کرنے جا رہے ہو۔''

''تو کیا کروں، امی کسی طرح بھی مریم کو قبول نہیں کر رہی ہیں۔ میں نے ایک بے سہارا لڑکی کو تحفظ دیا ہے تو کیا غلط کیا ہے۔ میں مانتا ہوں، میں نے یوں چوری چھپے نکاح کر کے آپ سب کے اعتماد کو توڑا ہے مگر میرا قدم اس لیے تھا کہ امی کبھی بھی مریم سے میری شادی نہیں کریں گی۔ اس لیے میں نے نکاح کیا، سوچا تھا بعد میں آپ سب کو بتا دوں گا مگر مجھے یہ امی کو بتانا پڑا خوشنما بھابی کی بے عزتی کرتی رہتی تھیں۔ کیونکہ وہ غریب گھرانے سے ہیں میں نے امی کی سوچ کو بدلنے کے لیے یہ سب کیا تھا۔''

''دادا جان! مجھے بتائیے کیا کروں میں۔'' وہ ان کے گھٹنوں پر سر رکھتے ہوئے بہت رنجور اور دلگرفتہ ہو رہا تھا۔

''تم اس لڑکی کو چھوڑنے کی بات نہیں کرو۔ ہم تمہارا ولیمہ کر رہے ہیں اسی لیے کہ تاکہ اس لڑکی کو عزت سے رخصت کروا کے لائیں اور بڑی دلہن بھی مان جائیں گی تم مزید الٹا سیدھا نہیں سوچو۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے تسلی دی۔

''دادا جان مجھے معاف کر دیں۔''

''ہشت مرد روتے اچھے نہیں لگتے۔ اٹھو اور اپنا کام کرو جا کے اس طرح تم اپنی جاب کو چھوڑ کے بیٹھے رہو گے تو کچھ نہیں کر سکو گے۔'' اس نے سر ہلایا۔

''ارتضیٰ آفس گیا ہے تم بھی جایا کرو ایسے کام نہیں چلے گا۔''

''دادا جان آپ بہت اچھے ہیں۔'' اس نے ان کے ہاتھ چوم لیے۔

''اچھا، اچھا بس کر آئندہ کوئی بھی قدم اٹھاتے وقت اتنا ضرور سوچنا تمہارے بڑوں کی بھی اہمیت ہے۔'' فاران نے شرمندگی سے سر ہلایا تھا۔

☆......☆

ہیثم جاوید احمد اور ثمینہ سے رمنا کے رشتے کی بات کر چکا تھا خوشنما سے اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔

''انکل میرے دوست کی امی جب ہی آئیں گی جب آپ کی رضامندی ہوگی۔''

''بیٹا اتنے بڑے لوگوں میں ہمارا جوڑ نہیں بنتا۔'' وہ ہچکچا رہے تھے۔

''آپ ایسی بات سوچ بھی کیوں رہے ہیں۔'' ہیثم ان کی بات سمجھ گیا تھا کیوں کہ خوشنما کے ساتھ جو کچھ ہوا کون سا اچھا ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے سوچ لیا تھا اپنی باقی دونوں بیٹیوں کی شادی اونچے لوگوں میں نہیں کریں گے کیوں کہ رشتے برابر کے لوگوں میں ہی کرنے چاہئیں۔

''بیٹا حالات ایسی بات سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ آپ ان لوگوں سے معذرت کر لیں۔''

''انکل آپ ایسی بات تو نہیں کریں اشعر کی فیملی بہت اچھی ہے انہوں نے خوشنما کو دیکھا ہے جب ہی تو اشعر کی امی نے خواہش ظاہر کی کہ خوشنما کی بہن سے رشتہ کرنا چاہتی ہیں۔'' اس نے اشعر کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

''آپ نے خوشنما سے ذکر کیا۔'' ثمینہ نے پوچھا۔

''خوشنما کو پتا ہے میں نے سوچا میں خود جا کر بات کروں تو بہتر ہے۔'' وہ کچھ بڑبڑایا بھی مگر فوراً ہی بات کو سنبھال بھی لیا۔

''خوشنما اشعر کی امی کے ساتھ آئے گی۔'' وہ جھٹ بولا۔

''انکل پلیز انکار نہیں کریں۔ پہلے آپ ان لوگوں سے مل لیں۔ پھر ہی کوئی فیصلہ کیجیے گا۔ کیوں کہ میری یہ خواہش ہے کہ رمنا اور ایمن کی اچھی جگہ شادی ہو، وہ میری بہنوں کی طرح ہیں۔'' جاوید احمد نے ثمینہ کی طرف دیکھا کیوں کہ وہ چاہ رہی تھیں پہلے ان لوگوں سے مل لیں پھر ہی کوئی فیصلہ بھی کریں۔

''ٹھیک ہے بیٹا آپ ان لوگوں کو آنے کا کہہ دیں۔''

''شکریہ انکل بہت بہت شکریہ۔'' وہ مسکرا کے ان کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

''میں رمنا کو دیکھوں ابھی تک چائے نہیں لائی۔''

''آنٹی چائے وغیرہ بعد میں پیوؤں گا اب میں چلوں گا۔'' اس نے ٹائم دیکھا، خاصا ہو گیا تھا۔ آفس سے نکلے ہوئے اسے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔

''بیٹا تھوڑی دیر اور۔''

''نہیں انکل مجھے کچھ ضروری کام بھی ہیں۔ میں کل ہی ان لوگوں کو لے کے آؤں گا۔''

وہ ان سے سلام و دعا کر کے رخصت ہو گیا۔ ادھر رمنا کی دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں دو تین بار ہی اشعر کو دیکھا تھا اس نے اندازہ نہیں کیا تھا اشعر اس کے لیے کیا جذبات رکھتا ہے۔

جھٹ خوشنما کو بھی کال کر لی تھی۔

''کیا ہیثم آئے تھے۔'' خوشنما کو حیرانگی بھی ہوئی۔

''کیوں آپ کو نہیں بتایا۔'' رمنا کو حیرت ہوئی۔

''نہیں بتایا تو تھا۔'' اس نے خود ہی بات بھی بنائی۔

''آپی اتنے امیر لوگوں میں میرا رشتہ میں ایسا بالکل نہیں چاہتی، کیا پتہ آپ کے سسرال والوں کی طرح مجھے بھی کمتر سمجھیں وہ لوگ۔'' رمنا بھی رضامند نہیں تھی۔

''ضروری نہیں ہے ہر کوئی ایسا ہو۔''

''آپی آپ کے ساتھ کون سا اچھا ہوا ہے جو آپ یہ بات کہہ رہی ہیں۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''اچھا اچھا بس زیادہ فضول سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آؤں گی تو پھر بات ہو گی آج کل یہاں گھر میں بھی ٹینشن چل رہی ہے۔''

''کیسی ٹینشن؟'' رمنا نے پوچھا۔

''گھر آ کے بتاؤں گی۔''

''آپی پھر بھی کچھ تو بتایئے۔'' رمنا خاصی ضدی واقع ہوئی تھی۔

خوشنما نے فاران کے نکاح کی بات بتائی مگر اس نے ہیثم کی کوئی بات نہیں بتائی کیوں کہ اس کے گھر والے ان سب باتوں سے لاعلم تھے اور وہ چاہتی بھی نہیں تھی انہیں کچھ پتا چلے۔ مگر کب تک ایک نہ ایک دن تو پتہ چل ہی جانا تھا۔

''دیکھا کیسے آپ کو کمتر سمجھتی تھیں ان کے بیٹے نے بھی ایسے ہی شادی کر لی۔''

''بری بات رمنا ایسے نہیں بولتے۔'' اس نے اسے سرزنش کی۔

''آپی اتنا غرور بھی اچھا نہیں ہوتا ہے انہیں بھی سبق مل گیا۔''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو تم کل ذرا اچھا سا تیار ہو جانا، اشعر کے گھر سے ان کی امی آئیں گی۔'' خوشنما نے ان پر یہ بالکل ظاہر نہیں کیا اسے ہیثم نے کچھ نہیں بتایا۔ وہ جانتی تھی وہ اپنے معاملے کی وجہ سے بھی الجھا ہوا تھا اس سے وہ ابھی تک بات بھی نہیں کر رہا تھا اور اسے ہی ایسا کوئی قدم تو اٹھانا ہی تھا ہیثم کی الجھن ختم ہو کیونکہ وہ اتنی بے حس بھی نہیں تھی۔

☆......☆

حسنیٰ نے کافی حد تک کچھ کو ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ شہریار کے جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔ حسنیٰ کو اس نے بلاوجہ ڈانٹنا چھوڑ دیا تھا وہ بھی حیران تھی شہریار ایسے کیسے رہ سکتا تھا۔

''کتنے عرصے بعد بلاؤ گے حسنیٰ کو؟'' نسرین ملنے آئی ہوئی تھیں۔

''پھپھو یہ تو میں وہاں جا کر دیکھوں گا کیوں کہ میں نے فلیٹ بھی کرائے پر لینا ہے وہ سب سیٹ ہو جائے تو پھر بلاؤں گا۔'' اس نے ذرا آہستگی سے سمجھا کے انہیں بتایا۔

حسنیٰ ان سب کے درمیان بیٹھی تھی مگر وہ بہت خاموش سی ہو گئی تھی یا پھر شہریار کے جانے سے وہ اداس ہو رہی تھی۔

''جب تک بیٹا تم اسے بلاؤ گے میں ایسا کرتی ہوں حسنیٰ کو گھر لے جاتی ہوں۔'' نسرین نے کہا۔

''اے نسرین ایسی بھی تمہیں کیا مار پڑی ہے۔ تمہاری بیٹی یہاں آرام سے ہے اور شہریار بھی بلا ہی لے گا۔'' حسین بیگم روایتی ساس بن کے گویا ہوئیں۔

''بھابی بہت دن ہو گئے حسنیٰ رہنے نہیں آئی ہے رفعت کہہ رہی تھی میں اسے ساتھ لے آؤں۔''

''بس رفعت کی تو رہنے ہی دو۔'' وہ ویسے بھی ان سے خاصی جلی ہوئی تھیں کیوں کہ رفعت نے جو کچھ

بھی دیا تھا صرف حسنیٰ کو دیا تھا ان کے لیے تو کچھ بھی نہیں دیا تھا۔

''ٹھیک ہے پھپھو آپ لے جایئے مگر ابھی نہیں۔'' اس نے حسنیٰ کے خاموش چہرے پر نظر ڈالی ریڈ پرنٹڈ کاٹن کے سوٹ میں اس کی سرخ و سپید رنگت اور نمایاں ہو رہی تھی۔

''امی! مجھے جب آنا ہو گا میں آ جاؤں گی۔'' وہ یکدم ہی بولی تھی۔

نسرین حیرانگی سے اس کے بگڑتے تیور دیکھنے لگیں۔ شہریار نے اسے جانچ لیا تھا اُسے حسین بیگم کی بات ناگوار گزری ہے اس لیے اس نے غصے میں اسے کہا تھا۔

شہریار اس کے پیچھے ہی چلا آیا وہ کونے میں کھڑی اپنے آنسو آنچل کے کونے سے صاف کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور اس سے بچ کے کچن میں چلی گئی۔

''کیا بات ہے تم نے پھپھو کو ایسے کیوں جواب دیا۔'' وہ استفسار کر رہا تھا۔

''آپ لوگ جو چاہتے ہیں اسی طرح جواب دے تو دیا ہے۔ نہیں جا رہی میں کہیں کبھی آپ بے فکر ہو جائیں۔'' حسنیٰ بہت افسردہ اور مایوس ہو گئی تھی اسے اپنی زندگی بے مصرف سی لگنے لگی تھی کوئی بھی چارم نہیں تھا اس نے اندازہ کر لیا تھا۔ شہریار نے اسے نیچا دکھانے کے لیے اس سے زبردستی شادی کی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا۔'' وہ اس کی سرخ ہوتی ناک کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سنک میں پڑے گندے برتن دھو رہی تھی۔

''آپ لوگوں کو نوکرانی چاہیے تھی۔ آ تو گئی ہوں ہاں اور آپ بھی جیت گئے کیوں کہ میں نے آپ کو پتا نہیں کیا کیا کہا تھا۔ وہ سب مجھے آپ لوٹا تو رہے ہیں۔'' لہجے میں بہت افسردہ تھی وہ شہریار کے سرد رویے سے تنگ آ گئی تھی جسے اس کے جذبات اور احساسات کی ذرا پروا نہیں تھی۔

''شہریار صاحب! آپ جیت گئے مجھے آپ نے ختم کر لیا جیسا دل چاہے آپ سلوک کریں میرے ساتھ کیوں کہ میں اسی قابل ہوں کیوں کہ میں نے آپ کو پہلے بہت کچھ الٹا سیدھا بولا ہے۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو۔'' وہ ایک لمحے کو گڑبڑا بھی گیا کیوں کہ حسنیٰ بہت ٹوٹی ہوئی بکھری ہوئی لگ رہی تھی۔

''مجھے تو پہلے بھی کوئی خوشی نہیں ملی اور ابھی بھی کوئی خوشی نہیں ملی میرے مرحوم باپ نے مجھے پیدا ہوتے ہی پھپھو کی گود میں ڈال دیا۔ میری تو شخصیت ہی بٹ گئی۔ کس کی سنتی پھپھو کی یا اپنی ماں کی۔ دونوں نے مجھے اپنی ملکیت سمجھ کے اپنی مرضی مجھ پر چلائی اور اب آپ اپنی چلا رہے ہیں۔ میں تو کہیں بھی نہیں ہوں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی اور پھر اس نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ شہریار کو شرمندگی اور دکھ ہو رہا تھا واقعی حسنیٰ کے ساتھ تو شروع سے ہی زیادتی ہوتی آ رہی تھی اور اب وہ اس کے ساتھ کون سا اچھا کر رہا تھا اگر اسے حسنیٰ سے محبت ہے تو وہ پھر اسے کیوں اسے دکھ دے رہا تھا جب کہ حسنیٰ نے تو یہاں آ کر خود کو کافی حد تک ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ شہریار کو اپنی غلطی کا احساس شدت سے ہونے لگا تھا۔ وہ بھی دلگرفتہ سا ہونے لگا۔

(جاری ہے)

مکمل ناول

آخری حصہ

میرا دل میرا مسافر

سائرہ کا جہاز رن وے پر اتر چکا تھا۔ کراچی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اس نے اپنا پہلا قدم رکھ دیا تھا۔ اس شہر سے اس کی ماں کا تعلق بہت گہرا تھا۔ یہاں اس کی ماں کا گھر تھا۔ وہ گھر جس کے قصے سن سن کر سائرہ جوان ہوئی تھی۔ سائرہ اپنے بچپن سے ہی اپنی ماں کی زبانی پاکستان کے بارے میں باتیں سنتی آئی تھی اور اس وقت اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ جا کر اس ساحل سمندر کو چھو کر آئے جس کے مقابلے میں اس کی



ماں کو سڈنی کے سارے ساحلی علاقے معمولی لگتے تھے۔ ان شاموں میں کچھ وقت گزار کر آئے جس کے بارے میں اس کی ماں کا دعویٰ تھا کہ سڈنی کی خوب صورت شامیں اور موسم ان شاموں کے آگے کچھ نہیں ہیں۔ بچپن کی وہ دبی دبی سی خواہش ایسے پوری ہوگی یہ تو اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس کی ماں نے اپنے ایک جاننے والے کے ذریعے اس کی ٹکٹس کروادی تھیں۔ وہ اپنی ماں کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی مگر اس دوزخ سے نکلنے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں کے کہنے پر سڈنی چھوڑ تو آئی تھی مگر اس کا ارادہ تھا کہ کچھ دنوں بعد ہی واپس لوٹ جائے گی۔ ویسے بھی اپنی تعلیم تو اسے اپنے شہر میں ہی مکمل کرنا تھی۔ اس لیے یہاں مستقل طور پر رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

کراچی کا ایئرپورٹ سڈنی کے ایئرپورٹ کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا مگر اسے پھر بھی یہ اچھا لگا تھا۔ ایئرپورٹ پر اس کے جواد ماموں اسے لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ویسے تو اپنے اکثر ننھیالی رشتے داروں سے اس کا غائبانہ تعارف تھا مگر اپنے جواد ماموں سے اس کی ایک دو بار اسکائپ پر بات ہو چکی تھی اور وہ انہیں اچھی طرح پہچانتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں نے اپنے خاندان کے خلاف جا کر اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ اس لیے اس کے ننھیال والے ان لوگوں سے نہیں ملتے تھے۔ مگر اب صورت



حال کافی بدل چکی تھی۔ اس کی ماں کا فون پر اپنے گھر والوں سے رابطہ رہتا تھا۔ یہ بات اس کے باپ کے علم میں نہیں تھی ورنہ ہوسکتا تھا وہ پیسوں کا مطالبہ کرتا۔ سائرہ کے نانا اور نانی کا انتقال ہو چکا تھا۔ کراچی میں اس کے صرف ایک ماموں تھے۔ جب کہ ایک ماموں اور خالہ انگلینڈ میں رہتے تھے۔ اس کے جواد ماموں اسے لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہ ان کے خاندان کے ساتھ بہت جلد گھل مل گئی تھی۔ اسے کراچی شہر آئے ہوئے ابھی کچھ دن ہی ہوئے تھے مگر اسے لگتا تھا کہ جیسے وہ صدیوں سے یہاں رہ رہی ہو۔ یہاں کی سب سے خوب صورت جگہ بلاشبہ ساحل سمندر ہی تھا جو اسے دیگر ساحلی علاقوں کی طرح بہت خاموش پراسرار اور گہرا لگا تھا۔ اس شہر میں اس کے لیے بس یہی ایک خاص کشش تھی کہ اس کی ماں کی یہاں سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ اس کی اپنی یادیں تو جس جگہ سے جڑی ہوئی تھیں اسے تو وہ بہت دور چھوڑ آئی تھی۔ شاید سارے شہر ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بس ان سے وابستہ یادیں ہی ہماری نظر میں ان کو خاص بناتی ہیں۔ اپنے ماموں کے گھر اسے جو اپنائیت ملی تھی اس نے اسے پراعتماد بنا دیا تھا۔ وہ چند ہی دنوں میں سب کی بہت اچھی دوست بن گئی تھی۔ اسے یہاں پر زبان کا کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا کیوں کہ اس کی ماں نے اپنی مادری زبان سے اس کا تعارف کروا رکھا تھا۔ وہ نہ صرف اردو سمجھ لیتی تھی بلکہ مناسب حد تک بول بھی لیتی تھی۔ اپنے ماموں کی دونوں بیٹیوں سبرینہ اور شہرین سے اس کی بہت بے تکلفی ہو گئی تھی۔ وہ ابھی پڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ زیادہ تر وقت وہ کراچی کے ساحل ہی کے پاس ہی گزارتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کا بھی ایک خوب صورت گھر ساحل سمندر کے کنارے ہو، جہاں پر وہ روزانہ شام کو چہل قدمی کے لیے جایا کرے اور سمندر سے بہت سی باتیں کرے۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک روز اس کی خواہش ضرور پوری ہوگی۔ چشم تصور میں وہ خود کو علی کے ساتھ اکثر ساحل پر گھومتے ہوئے دیکھتی تھی۔ باوجود کوشش کے وہ علی کو بھول نہیں پائی تھی۔ اپنی سوچوں پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس کا دل علی کو بے وفا نہیں سمجھتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ اسے ایک بار علی سے ضرور اپنے دل کی بات کہہ دینی چاہیے تھی۔ وہ علی سے بدگمان ضرور ہوئی تھی مگر اپنے آپ کو اس سے محبت کرنے سے روک نہیں پائی تھی کہتے ہیں محبت کا درخت جتنا بھی مضبوط ہو جائے، دل کی سرزمین پر اگر شک کا بیج اپنی جگہ بنا لے تو مضبوط سے مضبوط درخت بھی اپنی جگہ چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی شاید ایسا ہی ہوا تھا۔ اسے اپنی ماں کی بھی بہت فکر تھی۔ جواب اس سے بہت دور تھی۔ اس کی فون پر ایک دو بار اپنی ماں سے بات ہوئی تھی مگر اسے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں لگی تھی۔ ماں کی زبانی اسے پیٹر کا حال بھی معلوم ہو چکا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا اس کا باپ تھا۔ وہ ہر لمحے اپنے باپ کی سلامتی کے لیے دعا گو رہتی تھی۔ اس کے دل میں آنے والے وقت کے بارے میں سوچ کر دبے دبے سے کچھ خدشات تھے جو آہستہ آہستہ سر اٹھا رہے تھے۔ وہ اپنے ماموں کے گھر اپنی زندگی کے بہترین لمحات گزار رہی تھی مگر ان دیکھے وسوسے اور اندیشے اسے رات کو سکون سے سونے نہیں دیتے تھے۔ یہاں آ کر اس نے مذہب کو بھی ٹھیک طرح سمجھا تھا ورنہ سڈنی میں تو وہ صرف نام کی ہی مسلمان تھی۔ اپنی مذہبی رسومات کی ادائیگی کے بعد اس کے دل کو کچھ سکون ملتا تھا۔ اس کو یہ اطمینان تھا کہ اس کی ماں کے ساتھ ان کی ایک سہیلی ہے جو ان کا بہت خیال رکھتی ہے مگر پھر بھی وہ اپنے دل کی بے چینی کا سبب جان نہیں پائی تھی اور ایک روز اسے اپنے دل کی بے چینی کا سبب مل ہی گیا۔ جب اسے پتا چلا کہ اس کی ماں اچانک سے اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اس کے ماموں نے جب یہ خبر اسے سنائی تو اسے لگا کہ اس کے اندر سے جیسے کسی نے سارا خون

نچوڑ لیا ہو۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اتنی تنہائی اور اکیلا پن اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے ماموں کے ساتھ ایک بار پھر سڈنی میں تھی۔ اس بار اسے اپنا یہ شہر بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا تھا۔ دنیا کے دکھوں سے نجات پا کر اس کی ماں ابدی نیند سو گئی تھی۔ سائرہ کے لیے زندگی میں اب کوئی کشش نہیں تھی۔ اسے بے رنگ اور بے کیف زندگی اب اکیلے ہی گزارنی تھی کیوں کہ اس کو حوصلہ دینے والی ماں اب اس کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکی تھی۔

☆......☆

''ایرک پلیز! حوصلہ کرو۔ تمہیں ایک سے ایک اچھی لڑکی مل جائے گی۔ تم سمجھ لو کہ سائرہ تمہارے قابل نہیں تھی۔''

علی نے یہ سب کہتے ہوئے ایرک کو گلے لگا لیا تھا۔ وہ جو حسب معمول شام کو سینٹرل پارک میں کچھ وقت گزارنے آیا تھا۔ ایرک کو اس طرح بینچ پر اکیلے بیٹھے بچوں کی طرح روتے دیکھ کر علی اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا تھا۔ ورنہ اسے ایرک سے کوئی ہمدردی نہیں تھی مگر جب ایرک نے پوری بات بتائی تو علی کو اس سارے معاملے میں ایرک کا کردار بہت معصوم لگا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سائرہ اتنی دھوکے باز لڑکی ثابت ہوگی۔ اسے ایرک سے بہت ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

''وہ تو مجھ سے محبت کے بہت دعوے کیا کرتی تھی۔ ہر وقت مجھ سے ملنے کے لیے بے قرار رہتی تھی۔ اس نے مجھے دھوکا دیا علی۔ اس نے مجھے برباد کر دیا۔'' ایرک، علی کے کندھے پر سر رکھے اب اور زیادہ زور سے رو رہا تھا اور اپنی محبت کی بربادی کی داستان سنا رہا تھا۔

علی کو اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اسے سائرہ پر بہت غصہ تھا۔ جس نے ایرک جیسے معصوم انسان کو دھوکا دیا تھا۔ ایرک نے اسے بتایا تھا کہ سائرہ اپنے کسی دولت مند کزن کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور اس نے نہ صرف ایرک بلکہ اپنے باپ کو بھی دھوکا دیا تھا۔ ایرک کی باتیں سن کر اسے سائرہ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ اتنی اچھی تصویریں بنانے والی لڑکی اتنی چالاک اور مکار بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا دل ایک ہی لمحے میں سائرہ سے نفرت محسوس کرتا تھا تو دوسرے ہی پل دل کے اندر اس کی محبت بھی زور زور سے اپنے ہونے کا اعلان بھی کرتی تھی۔ کچھ معاملات میں ہم مکمل طور پر بے بس ہوتے ہیں۔ یہ محبت کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ جس میں وہ خود کو مکمل طور پر بے بس محسوس کرتا تھا۔ وہ اس روز بہت دیر تک ایرک کے پاس بیٹھا اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتا رہا تھا۔ جب وہ ایرک کے پاس سے اٹھ رہا تھا تو اسے لگا کہ ایرک اب پہلے سے کافی بہتر ہے مگر اب علی کو اپنی ذہنی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ خود کو بہت ٹوٹا اور بکھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ایسے میں وہ کیتھی کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا مگر وہ اپنی ماں کے پاس چھٹیاں گزارنے میلبورن گئی ہوئی تھی۔ اس لیے کچھ وقت سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے بعد اب وہ گھر لوٹ آیا تھا۔ گھر آتے ہی جو خبر اس نے سنی وہ اس کے رہے سہے اعصاب ختم کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس کے والد نواز شاہ کا بہت سیریس قسم کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ وہ اسپتال کی ایمرجنسی میں تھے۔ علی کو یاد آیا کہ اسے راستے میں بھی فون آ رہا تھا مگر وہ اتنا افسردہ تھا کہ ہر آنے والا فون کاٹ رہا تھا۔ گھر آتے ہی جب ملازم نے اسے بتایا تو وہ بھاگ کر اسپتال پہنچا جہاں اس کا باپ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا اور مرتے وقت جو کچھ اس نے علی کو بتایا اس نے گویا علی کی زندگی کا

رخ بدل دیا۔

☆......☆

عروہ ایک بار پھر بہت بری طرح قسمت کی ستم ظریفی کا شکار ہوئی تھی۔ موسیٰ کی بے وفائی نے جو زخم اسے لگایا تھا اس کا جلد مندمل ہونا بہت مشکل تھا۔ وہ گھر آ تو گئی تھی مگر ذہنی اور جسمانی طور پر بہت کمزور اور خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس کی ایسی حالت دیکھ کر اس کی ماں بہت روئی تھی۔ وہ خود کو عروہ کی اس حالت کا ذمہ دار سمجھتی تھی۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تو عروہ کا گھر اجڑ چکا تھا۔ اپنی ماں کے ہی کہنے پر عروہ کے چھوٹے بھائی نجیب نے موسیٰ کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر موسیٰ کا اسے کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ ایک لاحاصل سی تلاش کے بعد وہ بھی خاموش ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ عروہ کو اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں بہت دن لگ گئے کہ اب موسیٰ نام کا کوئی فرشتہ اس کی زندگی میں نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ نارمل بھی ہو گئی مگر اپنی ذات پر لگے ان زخموں کو بھول نہیں پائی تھی جو اسے بہت تکلیف دیتے تھے۔ ایسے میں اپنے سے زیادہ اپنی کوکھ میں پلتی اس ننھی جان کی فکر تھی جو ہر لمحہ اسے اپنے ہونے کا احساس دلاتی رہتی تھی۔ گھر کے حالات اس کے سامنے تھے۔ اب جو بھی کرنا تھا اسی نے کرنا تھا۔ اس نے گھر کے قریب ہی ایک اسکول میں نوکری کر لی تھی۔ تنخواہ اگر بہت زیادہ نہیں تو اتنی کم بھی نہیں تھی جو اس کی ضروریات کو پورا نہ کر سکے۔ کہتے ہیں کہ رب اگر ایک در بند کرتا ہے تو سو در کھول دیتا ہے۔ سو عروہ اور اس کے گھر والوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ اسے ملازمت کیا ملی کچھ ہی دنوں بعد اس کی چھوٹی بہن کو بھی ایک سرکاری ادارے میں بہت اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ اب ان لوگوں کے گھر کے حالات بھی بہتر ہو گئے تھے۔ عروہ کے چھوٹے بھائی کی تعلیم بھی اب مکمل ہونے ہی والی تھی۔ جیسے جیسے عروہ کی ڈلیوری کے دن قریب آ رہے تھے ویسے ویسے ایک انجانا سا خوف اس کے وجود پر دستک دینے لگا تھا کہ نہ جانے کب کیا ہو جائے۔

وہ ڈاکٹر سے باقاعدگی سے اپنا چیک اپ کروا رہی تھی۔ اس کی رپورٹس سب نارمل تھیں مگر وہ اس خوف سے پیچھا نہیں چھڑا سکی تھی۔ اسے موسیٰ کے رویے نے بہت دکھ پہنچایا تھا۔ جس نے محض شک کی بنیاد پر عروہ سے پوچھے بغیر اسے عمر قید کی سزا سنا دی تھی اور خود نہ جانے دنیا کے کون سے کونے میں جا کر چھپ گیا تھا۔ اس کے باپ نے بھی اس پر شک کیا تھا اور موسیٰ نے بھی وہی عمل دوبارہ دہرایا تھا۔ اسے ان دونوں میں رتی برابر بھی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ اپنی زندگی کے بھیانک خواب کو بھلانے کے لیے عروہ نے خود کو حد درجہ مصروف کر لیا تھا۔ وہ صبح اسکول ہوتی تو شام کو بچوں کو ٹیوشن پڑھانے میں مصروف ہو جاتی تھی مگر وہ اس ذہنی دباؤ سے نجات حاصل نہیں کر سکی تھی جو اس کی ذات کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ دن گزرتے جا رہے تھے مگر عروہ کوشش کے باوجود اپنی ذہنی و جسمانی حالت میں بہتری نہیں لا سکی تھی۔ بالآخر وہ دن آ ہی گیا تھا جس روز عروہ کے وجود میں پلتی اس ننھی جان نے دنیا میں آنکھ کھولنی تھی۔ اس روز صبح سے ہی اسے شدید قسم کا درد محسوس ہو رہا تھا۔ درد کی شدت جب حد سے بڑھی تو اس کے گھر والوں کو اس کے کمزور اور لاغر وجود کو لے کر اسپتال منتقل کرنا پڑا۔ اس کی بگڑتی ہوئی حالت کے پیش نظر ڈاکٹرز نے اس کے فوری آپریشن کا فیصلہ کیا۔ عروہ پچھلے چند ماہ سے جس درد اور اذیت کو جھیل رہی تھی اس سے نجات کا وقت آن پہنچا تھا۔ اس کی حالت بہتر نہیں ہو رہی تھی۔ ڈاکٹرز کے لیے واحد راستہ یہی رہ گیا تھا کہ وہ ماں اور بچے میں سے ایک کی جان بچائیں۔ ایسے موقعوں پر عموماً ماں کی جان بچانے کی ہی کوشش کی جاتی ہے اور یہی عروہ کے گھر والوں

کا فیصلہ تھا مگر اوپر کاتب تقدیر کا فیصلہ کچھ اور تھا جیسے ہی وہ بچہ اس دنیا میں آیا اسی لمحے اس کی ماں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے بچے کو اس دنیا کے حوالے کر کے عروہ نے ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے ناتا توڑ لیا۔

☆......☆

کہتے ہیں کہ جب انسان پر برا وقت آتا ہے تو اس کا سایہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ یہی کچھ پیٹر کے ساتھ ہوا تھا۔ میتھیو نے اس کی سوچ سے بھی زیادہ برا سلوک اس کے ساتھ کیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ پیٹر کو جان سے ہی مار دیتا مگر یہ پیٹر کی خوش قسمتی تھی کہ وہ میتھیو کی قید سے بھاگ نکلا تھا۔ میتھیو نے پیٹر کو سڈنی کی شہری آبادی سے دور نسبتاً ایک ویران علاقے میں قید کر رکھا تھا جہاں روزانہ چند غنڈے پیٹر پر بہت بری طرح تشدد کرتے تھے اور اس کام میں کبھی کبھی میتھیو اور ایرک بھی اپنا حصہ ڈال لیا کرتے تھے۔ تشدد کے علاوہ وہاں پیٹر سے جسمانی مشقت کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ میتھیو کا کہنا تھا کہ جب تک تمام قرض سود سمیت پیٹر واپس نہیں کرتا تب تک وہ اپنی رہائی کے بارے میں سوچ تک نہیں سکتا۔ وہ غنڈے جس طرح پیٹر پر تشدد کرتے تھے اس سے پیٹر کو تو یہی لگتا تھا کہ اب اس کی موت یقینی ہے مگر وہ بہت سخت جان تھا۔ اسی لیے اتنی مار کھا کر بھی نہ صرف زندہ تھا بلکہ اس کے حواس بھی بحال تھے۔

ایک روز انہی غنڈوں کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر پیٹر اس قید خانے سے بھاگ نکلا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس سمت جا رہا ہے۔ بس وہ میتھیو کی پہنچ سے بہت دور چلے جانا چاہتا تھا۔ وہ جسمانی طور پر بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اس لیے اس کی ٹانگیں اس کا زیادہ ساتھ نہیں دے سکیں تھیں اور کچھ میل کے فاصلے پر جا کر وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں ایک شخص اٹھا کر اپنے گھر لے آیا تھا۔ وہ شخص کون تھا۔ پیٹر نہیں جانتا تھا۔ مگر اس کی چند روز کی تیمارداری سے پیٹر کے کمزور وجود میں جان پڑ گئی تھی۔ اس کے زخم بھی مندمل ہو رہے تھے۔ پیٹر اس شخص کا دل سے شکر گزار تھا جو کسی فرشتے کی طرح پیٹر کی زندگی میں آیا تھا۔ وہ شخص ایک باریش اور راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ وہ پیٹر کے سامنے روزانہ پانچ وقت نماز پڑھ کر اس کے چہرے پر کچھ پڑھ کر پھونکا کرتا تھا۔ پیٹر کی حالت اب کافی بہتر ہو گئی تھی۔ وہ اب روزانہ کچھ دیر چہل قدمی کرتا تھا۔ اسے اب اس شخص سے ایک خاص قسم کا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک روز جب اس شخص نے پیٹر کے پوچھنے پر اپنا نام بتایا تو پیٹر کو ایک خوشگوار قسم کی حیرت ہوئی تھی۔ اس شخص کا نام عبداللہ تھا۔

☆......☆

اشرف مسیح کو شہر کے اس درمیانے درجے کے گائنی وارڈ میں کام کرتے ہوئے چند برس ہونے کو آئے تھے۔ روزانہ طرح طرح کے لوگوں سے اس کا واسطہ پڑتا تھا مگر وہ شخص اس کے لیے ایک نہایت عجیب کیس ثابت ہوا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا اور مہذب شخص نظر آتا تھا مگر اس کی حرکتیں اسے اشرف مسیح کی نظروں میں بہت مشکوک بنا رہی تھیں۔ تقریباً ایک ہفتے سے وہ روزانہ ہی کچھ مخصوص وقت کے لیے گائنی وارڈ کی انتظار گاہ میں آ کر بیٹھ جایا کرتا تھا اور جیسے ہی کوئی نرس کسی نومولود کو اس کے باپ یا پھر کسی دوسرے رشتے دار کے حوالے کرتی اس لمحے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ اس شخص کی آنکھوں میں چھپی حسرت اور تمنا کو اشرف مسیح بہت اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اشرف مسیح اور اس شخص کے درمیان باقاعدہ طور پر بات چیت شروع ہو گئی تھی۔ اس شخص نے اپنا مدعا

اشرف مسیح سے بیان کر دیا تھا۔ پہلے پہل تو اس نے انکار کر دیا تھا۔ مگر اس شخص نے اسے بہت بھاری رقم کی پیشکش کی تھی۔ کچھ دن سوچنے کے بعد بالآخر اشرف مسیح اس شخص کی خاطر وہ کام کرنے پر تیار ہو گیا۔ کیونکہ بہر حال ایک اچھا مستقبل اس کا بھی حق تھا۔ اس شخص نے اشرف مسیح کو ایک خالی چیک دیا تھا۔ جس پر اپنی مرضی کی رقم لکھ کر اشرف مسیح نے اپنے پاس چیک رکھ لیا تھا۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس پر قسمت اس قدر جلد اتنی مہربان ہو جائے گی۔ اب اس نے ایک نومولود کو اغوا کر کے اس شخص کے حوالے کرنا تھا۔ یہ کوئی اتنا آسان کام نہیں تھا مگر اب اسے آسان ہی لگ رہا تھا۔ وہ دو برس سے اس وارڈ میں صفائی کر رہا تھا اور اپنے اچھے رویے کے باعث اس کے دیگر ملازمین اور اب اسپتال کی انتظامیہ سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ تبھی اس پر بھروسہ اور بھرپور اعتماد کرتے تھے۔ اس لیے اس پر کوئی شک نہیں کر سکتا تھا۔ اسے صرف مناسب موقع کا انتظار تھا اور ایک روز اسے وہ موقع مل گیا تھا۔

ایک رات گائنی وارڈ میں ایک لڑکی بچہ پیدا کر کے مر گئی تھی اور اشرف مسیح کو لگا کہ اس سے زیادہ سنہری موقع اسے دوبارہ نہیں مل سکتا تھا۔ بچہ انتہائی نگہداشت وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ اشرف مسیح نے اس وارڈ کی دو نرسز کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور خود وارڈ میں صفائی کے بہانے زیادہ سے زیادہ وقت گزار رہا تھا۔ اس نے اس شخص کو فون کر کے اسپتال کے بیرونی احاطے میں انتظار کرنے کا کہا تھا۔ جیسے ہی ڈاکٹر اِدھر اُدھر ہوئے اس نے بچے کو اٹھایا اور چند لمحوں میں اسے اس شخص کے حوالے کر دیا جو اس کی بتائی ہوئی مخصوص جگہ پر پہلے سے کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ رات کی تاریکی میں وہ شخص بچے کو لے کر اشرف مسیح کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اشرف مسیح اب اسپتال کے اندر جا رہا تھا۔ اسے وہاں جا کر اب صورت حال کو سنبھالنا تھا۔ ویسے تو اس شخص نے اسے یقین دلا رکھا تھا کہ اس کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں اگر اشرف مسیح کو کچھ ہوا تو وہ اسے بچا لے گا۔ اب اسے صفائی کا کام بھی چھوڑ دینا تھا۔ اس کے بینک اکاؤنٹ میں اتنی رقم تھی کہ وہ کوئی اچھا سا کاروبار شروع کر سکتا تھا۔ اس کا ارادہ یہ شہر چھوڑ دینے کا تھا اور وہ اب ایسا کر سکتا تھا۔ ایک نہایت سنہرا اور شاندار مستقبل اب اس کا اور اس کے بیوی بچوں کا منتظر تھا مگر یہ مستقبل اس نے کسی کی گود اجاڑ کر حاصل کیا تھا۔ اس لیے یہ سب اسے راس نہیں آسکا اور بہت جلد وہ دوبارہ اسی جگہ پر واپس آ گیا تھا جہاں سے وہ چلا تھا۔

☆......☆

موسیٰ نے اپنا ایک آرٹ اسکول کھولا تھا۔ جہاں پر آرٹ کی مختلف اصناف میں کچھ کورسز کروائے جاتے تھے۔ یہ اپنی طرز کا ایک منفرد آرٹ اسکول تھا۔ جہاں پر جدید آرٹ کی تعلیم دی جاتی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس آرٹ اسکول کی شہرت پورے شہر میں پھیل گئی تھی۔ صبح وہ آرٹ اسکول میں ہوتا تھا تو شام کو کچھ وقت کے لیے کینوس کے سامنے کھڑے ہو کر رنگوں کے ساتھ کھیلنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کاروبار سے اس کی لاتعلقی ہنوز برقرار تھی۔ اس لیے اس کے باپ نے بھی اسے کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں سوچتا تو وہ اسے ایک بھیانک خواب کے علاوہ کچھ محسوس نہ ہوتی مگر وہ بھیانک خواب اس کے اندر بستا تھا۔ ماضی کی یادیں اب بھی تنہائی میں اسے بے چین کر دیا کرتی تھیں۔ آرٹ اسکول میں اس کا بہت اچھا وقت گزرتا تھا۔ نو آموز طالب علموں کے اندر کام سیکھنے کی جستجو اسے بہت حوصلہ دلاتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کے ملک میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں ہے بس ذرا سا تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس نے

اپنے اسکول کی فیس بہت کم رکھی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ محض پیسوں کی وجہ سے کوئی اس کے ادارے میں داخلہ لینے سے محروم رہ جائے۔ ایک روز جب وہ اپنے ادارے میں طالب علموں کو لیکچر دے کر ابھی اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ اس سے اس کے یونیورسٹی کے دنوں کا ایک پرانا شناسا حارث ملنے کے لیے آ گیا۔ حارث سے اس کی یونیورسٹی کے زمانے میں اچھی سلام دعا تھی۔ حارث ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے اسے سب سے پہلے شادی کی مبارک باد دی تھی اور حارث اور اس کے چند دوستوں سے تو اس کی یونیورسٹی کے بعد بھی کچھ عرصہ بہت دوستی بھی رہی تھی۔ حارث کو اس طرح اپنے سامنے دیکھ کر موسیٰ کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ ابتدائی بات چیت کے بعد وہ دونوں اب یونیورسٹی کے زمانے کے قصے دہرا رہے تھے۔ موسیٰ کو حارث کا رویہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا مگر باوجود کوشش کے وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ایک عجیب سا احساس ندامت اس کے چہرے پر نمایاں تھا۔

"موسیٰ! میں تم سے اب جو بات کہنے والا ہوں۔ وہ سن کر تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گے مگر اس سے کہیں زیادہ نفرت تمہیں اپنے باپ سے محسوس ہو گی۔ میرے دل پر بہت دنوں سے ایک بوجھ ہے۔ میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا ہے۔ شکر ہے آج تم مجھے مل گئے۔" اس کی باتیں موسیٰ کو بہت پریشان کر رہی تھیں۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ کھل کر کہو۔" موسیٰ نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"موسیٰ! ان دنوں میری مالی حالت بہت پتلی تھی۔ ابو کی بیماری کی وجہ سے ان کی پوری تنخواہ ان کے علاج پر ہی خرچ ہو جاتی تھی۔ میرے پاس یونیورسٹی کی فیس ادا کرنے کے پیسے نہیں تھے۔ امتحانات نزدیک تھے اور اگر فیس ادا نہ ہوتی تو میرا امتحان دینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا۔ ایسے میں میرا پورا سال ضائع ہو جاتا۔ میں بہت پریشان رہنے لگا تھا کہ ایک روز میرا دوست خضر میرے پاس آیا۔ میری پریشانی کا سن کر اس نے مجھے یقین دلایا کہ میرا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ پھر وہ مجھے تمہارے والد کے پاس لے گیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم سب مل کر تمہارے دل میں موجود عروہ کی محبت کو نفرت میں بدل دیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے میرے اور خضر سمیت چار اور لڑکوں کا انتخاب کیا۔ ہم سب کو اتنی اچھی رقم کی پیشکش کی گئی تھی کہ ہم انکار ہی نہیں کر سکے۔ اب ہم تمام وقت کسی نہ کسی بہانے سے تمہارے آس پاس رہنے لگے۔ ہم مختلف طریقوں سے تمہیں عروہ اور محسن سے بدظن کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ امتحانات میں کامیابی کے بعد جب تم نے یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا تو تمہارا لیکچر ختم ہونے کے بعد ہم میں سے کوئی ایک تم سے ملنے کے لیے آ جاتا اور جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر تمہاری ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتا یا پھر ہم تمہارے پاس بیٹھ کر اس قسم کی گفتگو کرتے جس کو سن کر تمہارے دل میں عروہ اور محسن کو لے کر فضول قسم کے خیالات اجاگر ہوتے۔ ہماری گھٹیا گفتگو کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ اگر تم ان دونوں کے درمیان تعلق کے حوالے سے اگر کچھ نہیں سوچتے تو سوچنا شروع کر دو۔ شروع شروع میں تم ہماری باتوں میں کچھ خاص دلچسپی نہیں لیتے تھے مگر آہستہ آہستہ تم نے ہماری گفتگو میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ تم ہمارے جال میں پھنسنے لگے اور تم نے تصویر کو اسی رخ سے دیکھنا شروع کر دیا جس رخ سے ہم تمہیں دکھانا چاہ رہے تھے۔ تم آرٹ گیلری جاتے تو ہم میں سے کوئی نہ کوئی پہلے سے وہاں موجود ہوتا اور تم سے تمہاری تصویروں کی نمائش کے سلسلے میں بات کرتا اور ہم تمہیں دیر تک رکنے پر مجبور کرتے۔ ہم نے اپنے ساتھ باہر کے کچھ لوگ بھی شامل کر لیے تھے تاکہ تمہیں کسی پر شک نہ ہو۔ تمہارے والد صاحب کا یہی

حکم تھا کہ ہم تمہیں دیر تک گھر سے باہر رکنے پر مجبور کریں اور پھر ایک روز تم نے شک کی آگ میں جل کر اپنا سب کچھ ختم کر ڈالا۔“

حارث یہ سب کہنے کے بعد خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ وہ انتظار کرتا رہا کہ موسیٰ اس پر اپنا غصہ نکالے۔ اسے برا بھلا کہے مگر کچھ دیر تک آواز نہ آئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو موسیٰ وہاں پر نہیں تھا۔ حارث سمجھ گیا تھا کہ اب وہ اپنے باپ سے جواب طلبی کرے گا۔ مگر اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ اس کے ضمیر پر چند برسوں سے جو بوجھ تھا اس نے اس روز وہ بوجھ اتار دیا تھا۔ اب وہ مطمئن انداز میں اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

موسیٰ نہایت تیزی سے گاڑی چلا جا رہا تھا۔ اس کا رخ اپنے گھر کی جانب تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں تھیں۔ اپنے باپ کے بارے میں سوچ کر اس کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ وہ اس لمحے بہت ٹوٹا اور بکھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی ایک نسبتاً کم رش والی جگہ پر کھڑی کر لی تھی۔ اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ مضبوطی سے جمائے وہ سامنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اسے سب کچھ دھندلا دھندلا سا لگ رہا تھا مگر شاید منظر تو ابھی واضح ہوا تھا۔ اسے اپنے باپ سے بھلائی کی کوئی امید تو پہلے بھی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ سمجھتا تھا کہ اس کے باپ کو جب موسیٰ کی اولاد کی خوش خبری ملے گی تو وہ موسیٰ کو معاف کر دے گا مگر یہ خوش خبری بھی اس کے باپ کے پتھر دل کو موم نہیں کر سکی۔ حارث کے ان انکشافات کے بعد وہ اپنے باپ کے لیے اپنے دل میں نفرت کے علاوہ کوئی دوسرا جذبہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وہ ان سے ملنا تو در کنار وہ ان کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ ملک حیات ان دنوں اپنے ایک بزنس ٹور کے سلسلے میں ملک سے باہر تھے اور موسیٰ کے لیے یہی بہتر تھا کہ اس وقت اس کا اپنے باپ سے سامنا نہ ہو۔ اسے رہ رہ کر عروہ اور اپنے ہونے والے بچے کا خیال آ رہا تھا۔ اس لمحے موسیٰ کو اپنے آپ سے بے انتہا نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ شک کی آگ میں جل کر اس نے محسن جیسے دوست کو بھی کھو دیا تھا۔ اب اس کی گاڑی کا رخ عروہ کے گھر کی طرف تھا۔ اتنے برسوں بعد وہ دوبارہ سے انہی راستوں پر جا رہا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ تھا کہ نہ جانے وہ لوگ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ مگر وہ ہر قسم کے ردعمل کے لیے تیار تھا۔ وہاں پہنچ کر جو کچھ اس نے عروہ اور اپنے بچے کے متعلق سنا تو اس کا دل چاہا کہ وہ وہیں کہیں ڈوب کر مر جائے۔ اسے لگا کہ اس کے اندر سے جان نکلتی جا رہی ہے۔

☆......☆

”تم مسلمان ہو؟“ یہ وہ پہلا سوال تھا جو عبداللہ نے پیٹر سے براہ راست پوچھا تھا۔ ورنہ ان دونوں کے درمیان برائے نام ہی گفتگو ہوتی تھی۔

عبداللہ کا زیادہ تر وقت عبادت میں گزرتا تھا۔ وہ ایک نہایت کم گو قسم کا آدمی تھا۔

”نہیں...... ہاں۔“ پیٹر نے ادھورا سا جواب دیا۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“ ایک اور سوال کیا گیا۔

”پیٹر...... نہیں...... عبداللہ۔“ پیٹر نے ایک اور نامکمل جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے مسلمان تو ہو مگر مسلمان ہونے سے ڈرتے ہو۔ اللہ کا بندہ بننے سے خوف زدہ ہو۔“ عبداللہ نے نہایت محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پیٹر عبداللہ کی طرف مکمل طور پر دیکھنے سے اکثر پرہیز ہی کرتا تھا۔ کیونکہ اسے لگتا تھا کہ عبداللہ کی آنکھوں سے کچھ عجیب سی روشنیاں نکلتی ہیں جو

اسے جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیں گی اور راکھ کا ڈھیر تو وہ شاید بن ہی چکا تھا۔

وہ پچھلے کئی دن سے عبداللہ کے اپارٹمنٹ میں تھا۔ مسجد سے ملحقہ یہ ایک چھوٹا اپارٹمنٹ تھا جہاں عبداللہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ وہ جب مسجد جاتا تھا تو پیٹر کو ہدایت کر کے جاتا تھا کہ وہ اندر سے دروازہ لاک کر لے۔ عبداللہ کا کچھ قیمتی سامان بھی اپارٹمنٹ کے اندر ہی تھا۔ پیٹر چاہتا تو وہاں سے کوئی بھی چیز چوری کر کے آرام سے بھاگ سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ کچھ تھا جو ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ اتنے دنوں سے اس نے شراب کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ عبداللہ کے ساتھ پیٹر میں جو مثبت تبدیلیاں آ رہی تھیں وہ اسے بہت حیران کر رہی تھیں۔

نہ جانے اس کے لہجے میں ایسا کیا جادو تھا کہ پیٹر کو اس کے سامنے اپنا پورا وجود تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے وجود کے اندر جو برا انسان موجود تھا وہ اب باہر نکل چکا تھا۔ اب وہ پیٹر نہیں رہا تھا بلکہ محمد عبداللہ بن چکا تھا اور صرف اس کا نام نہیں بلکہ اس کی پوری شخصیت کا رخ ہی بدل چکا تھا۔ وہ شخص عبداللہ ایک استاد تھا اور محمد عبداللہ اس کا ایک نالائق شاگرد تھا جسے لفظ اسلام کا حقیقی مطلب بھی نہیں معلوم تھا بس اسے اپنے رب کا حقیقی بندہ بننا تھا اور عبداللہ نے اسے وہی راستہ دکھانا تھا جس پر چل کر وہ نہ صرف ایک اچھا مسلمان بلکہ ایک اچھا انسان بھی بن سکتا تھا۔ عبداللہ نے اسے وضو کرنا سکھایا تھا اور زندگی کے اس پہلے وضو نے نہ صرف اس کے جسمانی اعضاء بلکہ اس کے گناہوں تک کو دھو ڈالا تھا۔ محمد عبداللہ نے پہلی بار قرآن پڑھا تھا جیسے جیسے وہ قرآنی آیات کو پڑھ اور سمجھ رہا تھا ویسے ویسے اس کے ذہن میں پڑی بند گرہیں کھلتی جا رہی تھیں۔ روشنیوں کے غول کے غول اس کے دل و دماغ میں داخل ہو رہے تھے اور برسوں سے تاریکیوں میں پڑا اس کا ذہن اسلام کی روشنیوں سے منور ہو چکا تھا۔ عبداللہ نے صرف اسے اسلامی عبادات سے ہی متعارف نہیں کروایا تھا بلکہ اسے لوگوں کی مدد کرنے کا بھی درس دیا تھا۔ اسے سمجھایا تھا کہ اگر رب کو راضی رکھنا ہے تو اس کے بندوں کی خدمت کرو۔ ضرورت مندوں کی مدد کرو۔ رب خود بخود راضی ہو جائے گا۔ عبداللہ نے اسے صبر و رضا کا درس بھی دیا تھا اور وہ ایک اچھے شاگرد کی طرح اپنے استاد کے پڑھائے ہوئے تمام اسباق کو ذہن نشین کرتا جا رہا تھا۔ اب وہ عبداللہ کے ساتھ مسجد میں بھی کچھ وقت ضرور گزارتا تھا۔ اس نے داڑھی رکھ لی تھی اور اس کے سرخ و سفید چہرے پر داڑھی لگتی بھی بہت خوب صورت تھی۔ عبداللہ نے اسے اذان بھی یاد کروا دی تھی اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ بہت اچھی اذان دینا سیکھ گیا تھا۔ وہ اب ظاہری اور باطنی طور پر اتنا بدل گیا تھا کہ اس کے ملنے والوں میں سے کوئی بھی اسے پہلی نظر میں نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ اس علاقے میں محمد عبداللہ کے نام سے ہی جانا جاتا تھا۔ اس کی تربیت مکمل ہو چکی تھی۔ اب اسے واپس جانا تھا۔ وہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا مگر اس کے استاد کا حکم تھا کہ اب اسے اپنے گھر والوں کے پاس واپس جانا چاہیے۔ کیوں کہ انہیں اب اس کی بہت ضرورت ہے۔

بالآخر وہ دن آ ہی گیا جب اسے وہاں سے کوچ کرنا تھا۔ اپنے استاد محترم سے اجازت لینے کے بعد محمد عبداللہ اب ایک بار پھر سے اپنے پرانے ملنے والوں کے درمیان جا رہا تھا۔ اسے اب میتھیو سے کوئی خوف نہیں تھا کیوں کہ اب اس کا دل ہر قسم کے خوف سے آزاد ہو چکا تھا۔ اب اس کے دل میں اپنے رب کے علاوہ کسی کا کوئی خوف نہیں تھا۔ سڈنی پہنچتے ہی اسے مائدہ کے مرنے کی خبر ملی جو اس کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ اسے پتا چلا کہ اس کی بیٹی سائرہ اپنے ماموں کے ساتھ واپس پاکستان جا رہی ہے اور

اس سلسلے میں وہ ایئرپورٹ پہنچا۔ اسے سائرہ کو واپس اپنے گھر لانا تھا اور یہ حقیقت تھی کہ وہ اپنی اس بیٹی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ایئرپورٹ پر اسے سائرہ اپنے ماموں کے ساتھ لاؤنج میں نظر آ گئی تھی۔ محمد عبداللہ کا بدلا ہوا روپ دیکھ کر سائرہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور وہ اپنے باپ کے صرف ایک دفعہ کہنے پر اس کے ساتھ واپس آ گئی۔ اب کی بار محمد عبداللہ کے گھر میں ایک سناٹے کا راج تھا مگر سائرہ کو اپنے باپ کی شخصیت کا یہ بدلاؤ بہت اچھا لگا تھا۔ وہ اب پیٹر نہیں بلکہ محمد عبداللہ تھا۔ یہ بات بھی اس کے لیے بہت اطمینان کا باعث تھی۔ اس کے باپ کا صرف ظاہر ہی نہیں بلکہ باطن بھی بدلا تھا۔ جس کا اندازہ اسے چند ہی دنوں میں ہو گیا تھا۔ زندگی ایک بار پھر اپنے معمول پر آ گئی تھی۔

☆......☆

دولت کمانا ہی جب انسان کی زندگی کا مقصد بن جائے تو پھر اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں رہتی کہ یہ دولت کس طرح سے اسے حاصل کرنی ہے۔ وہ حلال اور حرام میں تمیز کرنا بھول جاتا ہے۔ کسی بھی ناجائز کام کو کرنے میں اسے کسی قسم کی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ ایسا ہی کچھ اشرف مسیح نے کیا تھا۔ ایک نومولود کو اس کے اپنوں سے جدا کر کے اس نے پیسہ تو خوب کما لیا تھا مگر اخلاقی لحاظ سے وہ پست ترین درجے پر چلا گیا تھا۔ اب اسے اس نوکری کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ مگر اتنی جلدی نوکری چھوڑنا بھی اسپتال میں اپنی ساکھ خراب کرنے والی بات تھی۔ کیوں کہ اسپتال انتظامیہ بچہ اغوا ہونے کے بعد ہر ملازم کو شک کی نظر سے دیکھ رہی تھی اور گائنی وارڈ کے ملازمین سے تو روزانہ ہی پوچھ گچھ کی جاتی تھی جس خاندان کے بچے کو اغوا کیا گیا تھا وہ لوگ درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور معاشرتی طور پر کچھ خاص اثر و رسوخ کے مالک نہیں تھے۔ اس لیے کہیں بھی ان کی شنوائی نہیں ہو رہی تھی۔ اس صورت حال کا اسپتال انتظامیہ نے فائدہ اٹھایا اور بچہ اغوا ہونے کا سارا ملبہ اس کے گھر والوں پر ڈال دیا۔ یہ اسپتال کی ساکھ کا بھی معاملہ تھا کیوں کہ اگر یہ بات ثابت ہو جاتی تو اسپتال کی شہرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا اس لیے اسپتال کی انتظامیہ نے بہتر یہی سمجھا کہ ساری ذمہ داری بچے کے گھر والوں پر ڈال دی جائے وہ لوگ تھوڑا سا واویلا مچا کر آخر کار خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ کچھ ماہ بعد جب اس سارے واقعے کی گرد بیٹھ گئی تو اشرف مسیح نے سکھ کا سانس لیا کیوں کہ اس تمام عرصے کے دوران اسے اپنی جان سولی پر لٹکی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سب کو مطمئن تو کر دیا تھا مگر ایک عجیب سا خوف ہر وقت اس کے اندر موجود رہتا تھا۔ اب صورت حال معمول پر آ گئی تھی تو اس نے بھی بہتر یہی سمجھا کہ وہ استعفیٰ دے دے۔ اس نے نہ صرف استعفیٰ دیا بلکہ وہ شہر بھی چھوڑ دیا۔ وہ ایک دوسرے شہر جا کر رہنے لگا تھا۔ وہاں پر اس نے کپڑے کی ایک بہت بڑی دکان کھول لی تھی۔ یہ اس کی پسند کا کام تھا اور اس کام میں اس کی بیوی بھی اس کی مدد کر دیا کرتی تھی۔ اپنے دونوں بچوں کو اس نے شہر کے ایک بہترین اسکول میں داخل کروا دیا۔ ایک اچھا گھر اور گاڑی اس کا خواب تھا اور وہ خواب بھی پورا ہو گیا۔ اس کی دکان بھی چل نکلی تھی تھوڑے ہی عرصے میں اس نے کچھ ملازمین بھی رکھ لیے تھے۔ وہ ایک مطمئن اور خوش حال زندگی گزار رہا تھا۔ اب تو اس کے دل سے یہ احساس بھی مٹ چکا تھا کہ اس نے یہ سب کچھ ایک گناہ کے عوض حاصل کیا تھا اور گناہ بھی ایسا جس نے ایک معصوم کو ہمیشہ کے لیے اس کے اپنوں سے دور کر دیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ خدا نے اس کی رسی بھی دراز کر دی تھی اور اس کی دولت میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جانے کتنے برس گزر گئے۔ اب وہ

اس معاشرے کا ایک معزز فرد تھا۔ اس کے دونوں بچوں اسکول سے نکل کر کالج کی آزاد فضاؤں میں پہنچ چکے تھے مگر دولت کی فراوانی نے اس کے بچے کو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی عیاش پسند بنا دیا تھا۔ اپنے باپ کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے اڑانا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ کالج میں ان دونوں کی شہرت بھی اچھی نہیں تھی۔ آئے روز ان کے اساتذہ کی طرف سے شکایات اشرف مسیح کو ملتی رہتی تھیں۔ وہ بچوں کی وجہ سے بہت پریشان رہنے لگا تھا کہ ایک روز اس کی دکان میں اچانک سے آگ بھڑک اٹھی اور اس کا کروڑوں کا مال جل کر خاکستر ہو گیا۔ اپنے اس بنے بنائے کاروبار کی تباہی دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وہ اور اس کی بیوی دونوں اس صدمے سے سنبھل نہیں پائے تھے کہ اس کے بیٹوں نے اس کے دل کو ایک اور صدمہ پہنچایا۔ اس کے دونوں بیٹے چوری کی ایک واردات کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ پولیس کے ذریعے اسے پتا چلا کہ اس کے بیٹے پولیس کو پہلے بھی کچھ وارداتوں میں مطلوب تھے۔ اس نے ایک وکیل کیا مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے دونوں بیٹوں کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔ اشرف مسیح کا شاندار خواب بہت بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ زندگی میں اس نے سب کچھ حاصل کر لیا تھا مگر اب اس کے ہاتھ خالی تھے۔ وہ اور اس کی بیوی اب دوبارہ سے اپنے پرانے شہر آ گئے تھے۔ جہاں اس کے سارے پرانے جاننے والے تھے جن سے اس نے تقریباً تعلق ختم کر لیا تھا مگر اب وہی لوگ اس کے کام آ رہے تھے۔ پے در پے اتنے صدمات جھیلنے کے بعد اب اس کو زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کی بیوی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ خاکروب کا کام چھوڑے اسے عرصہ ہوا تھا۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ اب وہ کام دوبارہ سے کر سکے گا، اس کے ایک جاننے والے نے اسے اپنی دکان پر اپنے ساتھ بٹھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور اس کی یادداشت بھی اب آہستہ آہستہ اس کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی مگر برسوں پہلے کا وہ واقعہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اسے ازبر تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا ہے یہ مکافاتِ عمل ہے۔ یہ اس کے اعمالوں کی وہ سزا ہے جو اسے دنیا میں ہی مل گئی ہے۔ وہ اپنے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ مانگ کر تھک گیا تھا مگر اس کے دل کو کسی صورت قرار نہیں آتا تھا۔ ایک روز اسے اپنے دل کی بے چینی کا سبب سمجھ میں آ ہی گیا۔ جب وہ اپنے گھر میں اپنی بیوی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک سے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو ایک خوش شکل نوجوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس لڑکے کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کئی راتوں سے سو نہیں پایا ہو۔ اس نے اشرف مسیح سے جو کچھ پوچھا تھا اس نے اشرف مسیح کو واقعی میں بہت حیران کر دیا تھا۔

☆......☆

یہ ایک معمولی رقبے پر پھیلا ہوا ایک درمیانے درجے کے علاقے کا قبرستان تھا جو کہ اپنی خستہ حالی پر نوحہ کناں تھا۔ قبرستان کے اردگرد ناجائز تجاوزات کی بھرمار تھی۔ ان لوگوں کا بس چلتا تو شاید قبرستان کے اندر بھی اپنے چائے، پان کے کھوکھے سجا لیتے مگر جس تیزی سے تجاوزات کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ مستقبل قریب میں شاید تجاوزات کا دائرہ قبرستان کے اندر تک وسیع ہو جائے۔ اس قبرستان میں موجود قبروں کی حالت بھی اتنی اچھی نہیں تھی۔ قبرستان کے ایک کونے کو چند عادی نشئی افراد نے اپنا مسکن بنایا ہوا تھا۔ وہاں کتوں اور بلیوں کی بہتات بھی تھی اور صفائی کا انتظام انتہائی ناقص تھا۔ موسیٰ کا تعلق جس طبقے سے تھا ان لوگوں کے قبرستان بھی بہت شاندار تھے۔ خود موسیٰ کی ماں کی قبر بھی ایسے ہی

ایک قبرستان میں تھی۔ موسیٰ اس قبرستان میں جس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ وہ کبھی اس کے دل کے بہت قریب تھی مگر پھر شک کی آگ میں جل کر موسیٰ نے سب کچھ برباد کرڈالا تھا اور جب وہ اس لڑکی سے معافی مانگنے آیا تو پتا چلا کہ وہ تو دنیا چھوڑ کر چلی گئی اس نے موسیٰ کا انتظار بھی نہیں کیا اور چپ چاپ بغیر کچھ کہے سنے ایک نئے سفر پر روانہ ہوگئی۔ موسیٰ کو تھوڑی سی تلاش کے بعد عروہ کی قبر مل ہی گئی۔ موسیٰ کے ساتھ عروہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ جس نے موسیٰ کو عروہ کے بارے میں سب کچھ بہت تفصیل سے بتادیا تھا۔ جسے سن کر موسیٰ کو خود سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ عروہ کو تو واپس نہیں لاسکتا تھا مگر اس کی قبر کے پاس بیٹھ کر اس کے سامنے آنسوؤں کا نذرانہ تو پیش کرسکتا تھا اور اس روز وہ بہت دیر تک بیٹھ کر یہی کرتا رہا۔ وہ جب قبرستان سے واپس آرہا تھا تو اس کے ذہن میں صرف اور صرف اپنے بچے کا خیال تھا۔ جو نہ جانے کن ہاتھوں میں پرورش پا رہا ہوگا۔ عروہ کے چھوٹے بھائی نے اسے بتایا تھا کہ عروہ کا بیٹا پیدائش کے چند گھنٹے بعد ہی اغوا ہو گیا تھا۔ ان سب لوگوں نے بہت شور مچایا مگر اسپتال کی انتظامیہ نے اسے ایک حادثہ قرار دے دیا اور اسپتال کے ملازمین سے بھی زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی۔ ہم لوگوں نے تھانے میں ایف آئی آر کٹوائی مگر ہماری کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ نتیجے کے طور پر ایک روز ہم بھی تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ موسیٰ کو اس سارے معاملے میں صرف اور صرف اپنا قصور نظر آیا۔ وہ اس کیس کو حل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے پاس پیسہ بھی تھا اور اثر و رسوخ بھی بے تحاشا تھا جس کے ساتھ اسے امید تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو ڈھونڈ لے گا۔

☆......☆

ویسٹ میڈ اسپتال سڈنی کی ایمرجنسی میں موجود نواز شاہ کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ ان کو بہت زیادہ چوٹیں آئی تھیں۔ ایک مختصر سے آپریشن کے بعد ان کو ہوش آتو گیا تھا مگر ڈاکٹرز نے ان کی حالت کو تسلی بخش قرار نہیں دیا تھا۔ انہوں نے کچھ دیر کے لیے اپنے بیٹے علی کو اپنے پاس بلایا تھا۔ علی ان کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔ اپنے باپ کو اس طرح دیکھ کر اسے بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رہا تھا۔ وہ انہیں بولنے سے منع کر رہا تھا مگر نواز شاہ تو اس لمحے اپنے دل پر پڑے نہ جانے کون کون سے بوجھ ہلکے کر رہے تھے۔

''علی! برسوں پہلے میں اور میری بیوی صاعقہ اولاد کے نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھے۔ ڈاکٹرز نے بھی صاعقہ کو صاف جواب دے دیا تھا کہ وہ کبھی بھی ماں نہیں بن سکے گی۔ میں نے اپنی اس محرومی پر کسی نہ کسی طرح صبر کرلیا تھا مگر صاعقہ ہر وقت روتی رہتی تھی۔ میں بچہ گود لینے کے حق میں نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایسے بچے بڑے ہوکر اپنے والدین کے لیے بہت مشکلات کھڑی کرسکتے ہیں۔ صاعقہ کے روز روز کے رونے سن کر میں بھی بہت پریشان ہوجاتا تھا۔ ایک روز میں اپنے آفس سے تھکا ہارا گھر آیا تو صاعقہ کو اسی طرح روتے ہوئے دیکھا، میں غصے میں گھر سے باہر نکل آیا اور اپنی گاڑی کو بغیر سوچے سمجھے اِدھر اُدھر گھماتا رہا۔ میرا دل بہت اداس تھا۔ میں کسی ایسی جگہ چلے جانا چاہتا تھا۔ جہاں پر مجھے سکون ملے۔ اچانک میری نظر ایک اسپتال پر پڑی اور میں نے اپنی گاڑی اسی اسپتال کے سامنے پارک کردی۔ ایک عجیب سے جذبے کے تحت میں اس اسپتال کے گائنی وارڈ میں چلا آیا اور انتظار گاہ میں ایسے آکر بیٹھ گیا جیسے اندر ڈیلیوری روم میں میری بیوی موجود ہو اور تھوڑی ہی دیر میں نرس آکر مجھے ایک بچہ پکڑا دے گی۔ اس انتظار گاہ میں، میں نے لوگوں کے چہروں پر خوشی کے بہت سے رنگ دیکھے تھے۔ نرس باہر آکر جب کوئی نرم سا وجود کسی مرد کی گود میں تھماتی تھی تو اس لمحے اس مرد کے چہرے پر جو رونق آجاتی تھی اس خوشی کو کوئی نام نہیں

دیا جاسکتا تھا۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھ کر پھر وہاں سے چلا آیا۔ راستے میں، میں نے صاعقہ کے لیے بہت سے تحفے خریدے۔ اس دن اس اسپتال میں کچھ وقت گزار کر جیسے میری ساری پریشانی دور ہوگئی تھی اور میرے چہرے کی رونق لوٹ آئی تھی۔ میں نے صاعقہ کو یقین دلایا تھا کہ میں اس کو کبھی بھی اداس نہیں ہونے دوں گا۔ اب میں روزانہ آفس سے گھر آنے کے بجائے اسپتال کی انتظار گاہ میں جاکر بیٹھ جاتا تھا۔ میرا شیطانی ذہن ان دنوں ایک نئے منصوبے کی پیوندکاری میں مصروف تھا۔ میرے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی اور صاعقہ سے بڑھ کر مجھے کچھ بھی عزیز نہیں تھا۔ اپنے گھناؤنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں نے اس وارڈ میں ایک صفائی کرنے والے ملازم کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ میں اس ملازم کو اس کام کے عوض ایک اچھی رقم آفر کررہا تھا۔ اس لیے کچھ دیر انکار کرنے کے بعد وہ رضامند ہوگیا تھا اور پھر ایک رات میرا مقصد پورا ہوگیا اور میں نے علی تمہیں حاصل کرلیا۔ میں تمہارا ننھا منا سا وجود لے کر خوشی خوشی صاعقہ کے پاس گیا۔ جب میں نے تمہیں اس کی گود میں پکڑایا تو اس کو تو گویا زندگی مل گئی۔ تمہیں پاکر اس کا پورا وجود جیسے ہواؤں میں اڑتا پھرتا تھا۔ اس کو اس طرح خوش دیکھ کر میں بہت پرسکون ہوگیا تھا مگر اندر ہی اندر ایک گناہ کا احساس مجھے بری طرح کاٹ رہا تھا۔ میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ میں نے تمہیں یتیم خانے سے حاصل کیا ہے۔ سچ بولنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ تمہارے ہماری زندگی میں آنے سے ہمارا خاندان مکمل ہوگیا تھا مگر صاعقہ کی زندگی نے وفا نہیں کی اور تمہاری پہلی سالگرہ کے کچھ دن بعد ہی وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی۔ صاعقہ کے جانے کے بعد میں بہت اکیلا رہ گیا تھا۔ مجھے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی تمہیں مجھ سے چھین نہ لے۔ میں نے اپنا سارا کاروبار آہستہ آہستہ آسٹریلیا منتقل کرنا شروع کردیا اور ایک روز میں تمہیں لے کر ہمیشہ کے لیے سڈنی منتقل ہوگیا۔ یہاں آکر اب میرے دل کو یہ اطمینان تھا کہ کوئی تمہیں مجھ سے چھین نہیں سکے گا۔ میرے والدین حیات نہیں تھے اور اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے میں تھوڑا مغرور ہوگیا تھا۔ آسٹریلیا آنے کے بعد میں ویسے بھی اپنے یا صاعقہ کے کسی رشتے دار سے کوئی تعلق قائم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اب میری زندگی کا مقصد تمہاری اچھی اور بہتر پرورش کرنا تھا اور علی تم میری توقع سے بڑھ کر فرمانبردار اور ذہین ثابت ہوئے ہو۔ تم سن رہے ہو نا علی میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔''

نواز جن کی حالت کچھ دیر کو سنبھلی تھی اور انہوں نے اس تھوڑی سی مہلت کو جو انہیں قدرت کی طرف سے ملی تھی غنیمت جانتے ہوئے علی کو وہ سب کچھ بتادیا جو وہ عام دنوں میں بتانے کا کبھی تصور بھی نہیں کرسکتے تھے مگر اب جب موت سے ان کی آنکھیں چار ہوئی تھیں تو انہوں نے علی کو حقیقت بتادینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اتنا سب کچھ کہہ دینے کے بعد اب ان کی سانسیں بہت بری طرح اکھڑنے لگی تھیں۔

''علی...... علی...... میرے پاس آؤ میرے بیٹے۔''

وہ علی کو بلا رہے تھے مگر علی ان سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا انہیں نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایمرجنسی سے باہر چلا گیا تھا۔ ڈاکٹرز نے ایک بار پھر مختلف طریقوں سے ان کی جان بچانے کی کوشش کی مگر اس بار ان کی کوئی کوشش بارآور ثابت نہ ہوئی اور نواز شاہ نے اپنی جان، جانِ آفرین کے سپرد کردی۔ اسپتال انتظامیہ نے مختصر سی کارروائی کے بعد ان کا جسد خاکی علی کے حوالے کردیا۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھے، ان کا شمار سڈنی کے اچھے کاروباری افراد میں کیا جاتا تھا۔ اس لیے ان کی تدفین

کے موقع پر ان کے کاروباری دوستوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ان سب کا یہی خیال تھا کہ اب وہ کاروبار علی ہی سنبھالے گا مگر اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ ابھی صدمے سے زیادہ حیرانگی کی کیفیت میں تھا۔ اسے نواز شاہ کی بے حسی اور خود غرضی پر بہت غصہ تھا۔ وہ جو کچھ ان کے لیے محسوس کر رہا تھا وہ نفرت سے بہت آگے کی چیز تھی۔ اب اسے اپنا سراغ لگانا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسا کر پائے گا یا نہیں مگر ایک کوشش تو اسے کرنی تھی۔

☆......☆

موسیٰ حیات کے لیے اپنے بیٹے کی تلاش کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہ اندازہ اسے چند ہی دنوں میں ہو گیا تھا کہ اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے کے لیے اسے بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی مگر وہ بہت پرعزم تھا اس کی زندگی کا بس اب ایک ہی مقصد رہ گیا تھا کہ وہ اپنے جسم کے اس حصے کو تلاش کر کے اپنی ذات کا ادھورا پن مکمل کرے۔ اس سلسلے میں وہ سب سے پہلے اس اسپتال گیا جہاں اس کے بچے کی پیدائش ہوئی تھی مگر اسپتال انتظامیہ نے اس کے ساتھ کچھ خاص تعاون نہیں کیا۔ اس بات کو پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور پانچ سال پہلے اسپتال میں کام لینے والے ملازمین کی اکثریت کام چھوڑ چکی تھی اور جو چند ایک تھے انہوں نے اس واقعے سے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ موسیٰ نے پولیس کی مدد بھی حاصل کی تھی جس کا اسے فائدہ ہو رہا تھا مگر پھر بھی کوئی واضح سراغ ابھی تک اسے مل نہیں سکا تھا۔ اسپتال کے پرانے ملازمین سے بھی اس نے تفتیش کی تھی چند اسی شہر میں تھے جب کہ کچھ شہر چھوڑ کر جا چکے تھے۔ موسیٰ نے پیسہ پانی کی طرح بہا دیا تھا۔

وہ جب اپنے ماضی کی طرف نظر دوڑاتا تھا تو سوائے شرمندگی کے اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا تھا۔ اس کے باپ نے اس سے رابطے کی بہت کوشش کی مگر موسیٰ اب اپنے باپ کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ وہ فی الحال صرف اپنے بیٹے کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اور سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے ہر جگہ گیا مگر ہر جگہ ناکامی ہی اس کا مقدر بنی ایک بار ایک ملازم کے ذریعے اسے پتا چلا کہ اسپتال کا ایک پرانا ملازم اس کے بیٹے کے اغوا میں ملوث ہے مگر اب وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ملازم ان دنوں کہاں ہے۔ موسیٰ نے پولیس کی مدد سے اس پرانے ملازم کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر لگتا تھا قدرت ابھی اس کا مزید صبر آزمانے کے موڈ میں تھی اس شخص کا کوئی واضح سراغ نہیں مل سکا۔ اس لاحاصل سی جدوجہد کے بعد موسیٰ جیسے تھک سا گیا تھا۔ ایک روز اسے پتا چلا کہ جس باپ سے وہ نفرت کرتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ ماں کو تو وہ پہلے ہی کھو چکا تھا اب باپ بھی اس سے بہت دور چلا گیا تھا۔ اس کا گھر اجڑ چکا تھا۔ اس کی محبت عروہ بھی اب اس کے ساتھ نہیں تھی۔ بیٹا ملنے سے پہلے ہی بچھڑ گیا تھا۔ اپنی قسمت پر سوائے افسوس کرنے کے وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد ساری دولت اب موسیٰ کے نام تھی مگر اسے اس دولت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ مختلف فلاحی اداروں کے نام کر کے وہ بیرون ملک منتقل ہو گیا تھا۔ وطن چھوڑنے سے پہلے وہ مائدہ کے گھر والوں سے معافی مانگنا چاہتا تھا مگر وہ لوگ موسیٰ کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ اسے اتنا تو پتا چل گیا تھا کہ وہ جہاں ہمیشہ کے لیے جا رہا ہے۔ مائدہ بھی وہیں پر ہے وہ اسے وہاں پر ملنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک اداس مائدہ کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ سڈنی میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گیا تھا۔ اس کی بنائی ہوئی تصویروں کی شہرت پاکستان میں تو پہلے سے تھی اسے یہاں پر بھی اپنے فن سے محبت کرنے والے بہت سے لوگ مل گئے

تھے۔ یہاں کے پاکستانی حلقوں میں اس کی پہچان موجود تھی اس کے بہت سے شناسا پہلے سے سڈنی میں موجود تھے۔ اس لیے موسیٰ کو وہاں رہائش پذیر ہونے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی اور اس نے وہاں اپنی نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔

☆......☆

نواز شاہ کا یوں اچانک چلے جانا علی کے لیے تکلیف دہ تھا۔ مگر جو انکشافات انہوں نے مرتے وقت علی کے سامنے کیے تھے ان کو سننے کے بعد علی کے لیے زندگی میں کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا باپ اتنا سفاک اور بے رحم ہو سکتا ہے جو محض اپنی خوشیوں کے لیے علی کو اس کے اپنوں سے دور کر دے، علی تو برسوں سے اسی شخص کو اپنا باپ مانتا آیا تھا اور محض چند لمحوں میں وہ اس کے لیے ایک اجنبی بن گیا تھا۔ علی سمجھتا تھا کہ اس کا باپ ایک محبت بھرا دل رکھنے والا انسان ہے مگر اب اسے احساس ہوا تھا کہ جو شخص اسے اپنا باپ کہتا تھا، وہ ایک انتہائی خود غرض انسان تھا، جو بیک وقت کئی انسانوں کا مجرم تھا۔ اس نے نہ صرف علی کو اس کے گھر والوں سے چھینا تھا بلکہ علی کے اصل ماں باپ کو بھی اس کی جدائی کا زخم لگا دیا تھا۔ ایک ایسا زخم جس کا درد انہیں کسی پل چین نہیں لینے دیتا ہوگا۔ علی سمجھتا تھا کہ وہ شخص اگر اسے بے خبر رکھتا، تو زیادہ بہتر ہوتا، اب یہ آدھی ادھوری داستان اسے ضرور بے چین کر رہی تھی اگر وہ شخص زندہ ہوتا تو علی کو اس کے ذہن میں اٹھتے تمام سوالات کے جوابات مل چکے ہوتے مگر اب وہ شخص اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ اب اس کہانی کے دیگر کرداروں کو اسی نے ڈھونڈنا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنی تلاش کا سلسلہ کہاں سے شروع کرے۔ ایک روز وہ اسی طرح پریشان حالت میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ گھر کا ایک پرانا ملازم اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس ملازم کے ہاتھ میں ایک فائل تھی جو اس نے علی کے بیڈ کے پاس پڑے ہوئے میز پر رکھ دی۔

"یہ کیا ہے؟" علی نے فائل کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ نواز شاہ صاحب نے مجھے کئی سال پہلے دی تھی۔ انہوں نے وصیت کی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد یہ فائل آپ کو دی جائے؟ ان کی زندگی میں ہم لوگ یہ فائل آپ کو دینے کے پابند نہیں تھے۔" اس ملازم نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

"کیا ہے اس فائل میں جو اسے اس قدر خفیہ رکھا گیا۔" علی نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

"یہ آپ خود دیکھ لیں۔ مجھے تو جتنا کہا گیا تھا میں نے اتنا ہی کیا ہے۔"

ملازم نے نہایت فرماں بردار لہجے میں جواب دیا۔ اب وہ کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ علی نے تجسس بھرے انداز میں فائل کو کھول کر دیکھا۔ یہ ایک نہایت بوسیدہ سی فائل تھی۔ جسے ایک خاکی لفافے میں لپیٹ کر رکھا ہوا تھا۔ فائل کے سرورق سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ فائل کئی سال پرانی ہے۔ فائل کے اندر چند خطوط پڑے ہوئے تھے جن میں تقریباً وہی باتیں لکھی ہوئی تھیں جو نواز شاہ علی کو بتا چکے تھے۔ علی کے لیے زیادہ اہمیت کی حامل وہ رسیدیں تھیں جن پر اسپتال کا نام پتہ درج تھا اور ساتھ میں کچھ لوگوں کے نام بھی تھے۔ علی سمجھ گیا تھا کہ یہ سب وہ نشانات ہیں جن پر چل کر وہ اپنے گھر والوں تک پہنچ سکتا تھا۔ علی نے نہایت احتیاط سے فائل کو دوبارہ سے اس خاکی لفافے میں منتقل کیا اور اسے اپنی الماری میں رکھ لیا۔ اپنے متعلق اتنے انکشافات سن کر جہاں اسے دکھ ہوا تھا وہاں اسے اب اپنے اصل ماں باپ سے ملنے کی بے

چینی بھی تھی۔ وہ جلد از جلد پاکستان کے شہر کراچی جا کر اپنے پیاروں سے ملنا چاہتا تھا اسے یقین تھا کہ وہ انہیں ڈھونڈ نکالے گا۔ وہ اکیلے رہ رہ کر اکتا سا گیا تھا۔ اس لیے اس نے کالج جانا بھی شروع کر دیا تھا مگر اپنے اندر کی تنہائی کو وہ کم نہیں کر سکا تھا۔ اسے سائرہ بھی نظر آئی تھی۔ ایرک کے معاملے میں وہ اب تک سائرہ کو ہی قصوروار سمجھتا تھا۔ سائرہ کے لیے اپنے دل میں وہ محبت اور نفرت کے ملے جلے جذبات محسوس کرتا تھا۔ اس بار اسے وہ بہت خاموش اور کھوئی کھوئی سی لگی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنی ماں کو کھو چکی ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا باپ مسلمان ہو چکا ہے۔ سائرہ کی زندگی میں آنے والی ہر تبدیلی سے وہ خود ہی واقف ہو جاتا تھا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر ایک جھجک سی تھی جو ان دونوں کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے مگر اپنے اپنے دکھوں کو سینوں سے لگائے ان کے خول میں بند ایک دوسرے سے بات کرنے سے گریزاں تھے۔ سائرہ نے تو علی کا غم نہیں بانٹا مگر کیتھی نے اس مشکل گھڑی میں علی کا غم جس طرح بانٹا تھا اس نے علی کی نظروں میں اس کی اہمیت اور مقام کو بہت بڑھا دیا تھا۔ علی وہ وقت کیسے بھول سکتا تھا جب اس کے ٹوٹے اور بکھرتے ہوئے وجود کو کیتھی نے ہی سہارا دیا تھا۔ وہ اب زیادہ تر وقت علی کے ساتھ ہی گزارتی تھی۔ اس کی تسلی اور دلاسے بھرے جملوں نے اس کا حوصلہ بہت بڑھایا تھا۔ علی وہ وقت کیسے بھول سکتا تھا جب اس کے ٹوٹے اور بکھرے ہوئے وجود کو کیتھی نے ہی سہارا دیا تھا۔ خود پر گزرنے والی تمام کیفیات وہ کیتھی کے گوش گزار کر چکا تھا۔ اس نے کیتھی کے علاوہ کسی سے اپنے دل کا حال بیان نہیں کیا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اپنے دل میں اس لڑکی کے لیے دوستی کے علاوہ کوئی اور جذبہ محسوس نہیں کرتا تھا۔ بہت بار کیتھی کھلے لفظوں میں اس سے اظہار محبت کر چکی تھی۔ وہ اس کی باتوں کو ہر بار ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا مگر علی کو اب وہ اپنے معاملے میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ نظر آنے لگی تھی۔ علی اب اپنے والدین کی تلاش میں کراچی جانے لگا تھا اور کیتھی بھی اس سلسلے میں اس کی ہم خیال تھی۔ علی کو اپنے گھر والوں کو ڈھونڈنے کی بہت بے چینی تھی۔ بالآخر وہ دن آ ہی گیا جب اس نے کراچی شہر میں اپنا پہلا قدم رکھا۔ یہ وہی شہر تھا جہاں کی فضاؤں میں اس نے اپنی پہلی سانس لی تھی۔

☆......☆

سائرہ اپنے گھر واپس آ گئی تھی۔ اب کی بار گھر میں ماں کے بغیر اسے ایک عجیب سے سناٹے کا احساس ہوا تھا۔ اپنے باپ کے بدلے ہوئے روپ کو دیکھ کر اسے خوشی کے ساتھ ساتھ بہت حیرت بھی ہوئی تھی۔ اس کا باپ اب پیٹر نہیں محمد عبداللہ کہلاتا تھا۔ اس کی شخصیت کا وہ روپ صرف ظاہری ہی نہیں تھا بلکہ وہ باطنی طور پر بھی بہت بدل گیا تھا۔ جس کا اندازہ سائرہ کو چند ہی دنوں میں ہو گیا تھا۔ زندگی رفتہ رفتہ اپنے معمول پر آ گئی تھی۔ سائرہ نے کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ اپنی پڑھائی پر مکمل توجہ دینا چاہتی تھی۔ صحیح معنوں میں پڑھائی میں یکسوئی اسے اب ہی نصیب ہوئی تھی۔ اسے ابھی بھی میتھیو اور ایرک سے خطرہ محسوس ہوتا تھا مگر ان کی طرف سے ابھی راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ علی اسے بہت بار کلاس میں خاموش اور گم صم سا بیٹھا نظر آتا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ علی کے والد اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ وہ اسے تسلی دینا چاہتی تھی اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ بھی اپنی ماں کے چلے جانے پر ایسے ہی افسردہ ہے مگر جن نظروں سے وہ سائرہ کو دیکھتا تھا۔ ان میں نفرت اور بیگانگی کے کتنے ہی رنگ چھپے ہوئے ہوتے تھے وہ اس کی ان نظروں سے ڈر جایا کرتی تھی کیتھی کے ساتھ علی کی دوستی ہنوز برقرار تھی بلکہ اب تو اس میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ان دونوں کی

بڑھتی ہوئی قربت اسے کچھ اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔ سائرہ کے لیے ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھنا بہت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ انہی دنوں اسے پتا چلا کہ علی کچھ عرصے کے لیے پاکستان گیا ہوا ہے۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ علی کا بھی کچھ نہ کچھ تعلق پاکستان سے ہے۔ وہ اپنے امتحانات کی تیاری میں مصروف تھی کہ ایک روز اس کا سامنا ایرک سے ہو گیا۔

سڈنی کے لوگ آرٹ، موسیقی اور رنگوں سے محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ یہاں کے مشہور شاپنگ مالز، ہوٹلز اور ریسٹورنٹس میں جا بجا مختلف فن پارے اپنے رنگ بکھیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں کے مختلف آرٹ میوزیم اور آرٹ گیلریوں کی رونق بھی دیکھنے والی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پر جو تہوار منائے جاتے ہیں ان میں بھی نوجوان مصوروں کو موقع دیا جاتا ہے کہ اس موقع پر وہ اپنے فن کا مظاہرہ کریں اور یہاں کی دیواروں، گلیوں اور شاہراؤں کو رنگوں سے بھر دیں۔ موسیٰ جیسے آرٹ سے محبت کرنے والے شخص کے لیے اس شہر میں بہت سے مواقع موجود تھے۔ اسے پڑھانے کا تجربہ تھا سو اسے اس شہر میں بھی نوجوان مصوروں کو پڑھانے اور سکھانے کا موقع مل گیا۔ اس نے ایک آرٹ اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا تھا جو کہ ایک پاکستانی نے ہی کھولا تھا۔ وہاں سے واپس آ کر وہ اپنے کینوس پر اپنے شاہکار تخلیق کرنے میں مصروف ہو جاتا تھا۔ وہ سڈنی کے ایک ہوٹل کے لیے بھی تصویریں بنانے کا کام کرتا رہتا تھا۔ اس کی بنائی گئی تصویروں میں اب جا بجا اداسی کے رنگ نظر آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے اپنا سارا درد اپنی تصویروں میں منتقل کر دیا ہو۔ اپنے بیٹے کی تلاش کے سلسلے میں ابھی وہ مکمل طور پر مایوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے پاکستانی دوست کو جو کہ پولیس میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور اس کے بیٹے کی تلاش میں اس کی مدد کر رہا تھا کو ہدایت کی تھی کہ جیسے ہی اس کے بیٹے کا کوئی سراغ ملے اسے فوراً اطلاع کی جائے۔ وہ عروہ کے گھر والوں سے بھی رابطے میں تھا۔ اس نے عروہ کے بھائی کو ایک بہت اچھے ادارے میں ملازمت دلوادی تھی اور ہر ماہ اس کے گھر والوں کو ایک مخصوص رقم بھیجا کرتا تھا۔ وہ عروہ کو واپس تو نہیں لا سکتا تھا مگر اس کے گھر والوں کی مدد کر کے وہ اپنے دل کو سکون پہنچانے کی کوشش تو کر سکتا تھا۔ سو وہ یہی کر رہا تھا۔ خود کو بہت زیادہ مصروف رکھ کر وہ اپنے غم بھلانے کی کوشش کر رہا تھا مگر مصروف رہنے سے دکھ کم تھوڑی ہوتا ہے۔ وہ تو اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ بس مصروفیت کی گرد اس پر کچھ دیر کے لیے جم جاتی ہے اور جیسے ہی وہ گرد اڑتی ہے غم پھر دوبارہ اسی شدت سے اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ وقت اچھا ہو یا برا کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتا ہے سو موسیٰ حیات کا بھی کٹ رہا تھا۔ روز و شب کے آنے اور جانے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے لیے سب دن ایک جیسے تھے۔ اس کی تصویریں دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے وہ خود سے جنگ لڑ رہا ہو۔ خود سے یہ جنگ لڑتے لڑتے اسے کئی سال گزر گئے مگر جو گوہر نایاب وہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے نہیں ملا۔ اب تو اسے لگتا تھا کہ اس کی حیات کا سفر بھی ایسے ہی تمام ہو جائے گا اور اس کا بیٹا اسے نہیں ملے گا۔ سڈنی میں موجود پاکستانی مصوروں میں اب اس کا ایک مقام تھا۔ اس کی بنائی گئی تصویروں پر وہاں کے مختلف آرٹ میگزینز میں مقالے شائع کیے جاتے تھے۔ اس کی بنائی گئی تصویروں کا انعقاد صرف آسٹریلیا میں ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی کیا جاتا تھا۔ نوجوان مصوروں کے لیے اس کے کام میں سیکھنے کے بہت سے مواقع تھے۔ وہ جتنا اچھا مصور تھا اتنا ہی فلاحی کاموں میں اس کی شہرت تھی۔ اس نے کئی رفاہی اداروں کا بیڑہ اٹھایا ہوا تھا۔ اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ

وہ مختلف فلاحی اداروں کو دیتا تھا اور اپنے طور پر بھی ضرورت مندوں کی مدد کرتا رہتا تھا۔ اپنے بیٹے کی جدائی ایک ایسا غم تھا جس نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہر نوجوان چہرے میں اپنے بیٹے کو ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اس کے بیٹے کے خدوخال میں نہ جانے کس کی شبیہہ ہوگی۔ اس نے اپنے بیٹے کی کئی تصویریں بنا رکھیں تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا بیٹا ان تصویروں جیسا ہی ہوگا۔ اسے اکثر مائدہ بھی بہت یاد آتی تھی مگر اس نے مائدہ کو ڈھونڈنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ مائدہ کا سامنا کرے۔ وہ خود کو اس کا مجرم سمجھتا تھا۔ مائدہ کی شکوؤں سے بھری نظروں سے اسے خوف آتا تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا مگر وقت نے اسے بزدل بنا دیا تھا۔ اس لیے اگر کہیں اسے لگا کہ مائدہ اس کے آس پاس موجود ہے تو وہ فوراً وہاں سے چلا آیا، اس کی دلی تمنا تھی کہ مائدہ جہاں ہے وہاں پر خوش رہے اور موسیٰ حیات کا سایہ بھی اس پر نہ پڑے۔ وہ مائدہ کے حالات سے ناواقف تھا اگر واقف ہوتا تو کبھی بھی اس سے لاتعلقی نہ برتتا۔ وہ ان دنوں سڈنی کے ایک ٹی وی چینل کے لیے ایک آرٹ ڈاکومنٹری پر کام کر رہا تھا جس میں مختلف ادوار میں کیے جانے والے آرٹسٹوں کے کام کا احاطہ کرنا تھا۔ اس سلسلے میں مختلف معروف مصوروں کے کام کو ایک فلم کی شکل میں پیش کرنا تھا۔ موسیٰ کے ساتھ چند اور مصور بھی اس پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے اور اسے لگتا تھا کہ آرٹ کے قدردانوں کے لیے یہ ڈاکومینٹری فلم کسی تحفے سے کم نہیں ہوگی۔ وہ اپنے پروجیکٹ میں مصروف تھا کہ ایک روز اس کی محسن سے ملاقات ہوگئی۔ محسن کو دیکھ کر برسوں پہلے کا وہ تلخ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ جس منظر نے موسیٰ کی زندگی کو اندھیروں میں لا کھڑا کیا تھا۔ یہی کچھ کیفیت محسن کی بھی تھی۔ موسیٰ کو دیکھتے ہی وہ اذیت، وہ دکھ دوبارہ سے جاگ اٹھا جس کو وہ کب سے بھلانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ موسیٰ اسے دیکھتے ہی اس کے گلے لگ گیا۔ وہ اس سے معافی مانگ رہا تھا اور محسن نے بھی اسے معاف کر دیا۔ اسے لگتا تھا کہ موسیٰ نے بہت طویل سزا کاٹ لی ہے۔ اب وقت آگیا تھا کہ وہ اپنے اس دوست کو معاف کر دیے۔ اس نے اپنے دل کی پکار پر نہ صرف موسیٰ کو معاف کر دیا تھا بلکہ اس کی دوستی کو بھی دل سے قبول کر لیا تھا۔ موسیٰ کی زبانی اس کی زندگی کی کہانی سن کر محسن کو بہت دکھ پہنچا تھا۔ وہ اپنے سارے شکوے اور شکایات بھول گیا تھا اور چند لمحوں کے بعد وہ دونوں دوبارہ سے پہلے جیسے دوست بن گئے تھے۔ محسن جیسے دوست کو دوبارہ اپنی زندگی میں شامل کر کے موسیٰ بہت خوش تھا۔ محسن نے ایک روز اسے مائدہ کے انتقال کی خبر سنائی جسے سن کر موسیٰ کو لگا کہ اس کی ذات ایک اور دکھ کے بوجھ تلے دب گئی ہے۔ عروہ کے بعد مائدہ کو بھی اس نے کھو دیا تھا۔

☆......☆

علی بہت چھوٹا سا تھا جب اس نے کراچی جیسے شہر بے مثال کو الوداع کہہ دیا تھا مگر اس کے ذہن کے ایک گوشے میں ابھی بھی اس شہر سے وابستہ کچھ یادیں موجود تھیں۔ سب سے پہلے یاد تو اس عورت کی تھی جسے اس کی ماں کا نام دیا گیا تھا۔ وہ اکثر اپنے البم میں موجود اس عورت کی تصویریں دیکھا کرتا تھا جسے وہ اپنی ماں سمجھتا تھا مگر اب اس کے دل میں اس عورت کے لیے محبت بھرے تمام جذبات اپنی موت آپ مر چکے تھے۔ وہ صرف اور صرف اپنے اصل ماں باپ کی تلاش میں تھا، جو اس دنیا کی بھیڑ میں نہ جانے کہاں گم ہوگئے تھے۔ اب ان کی تلاش ہی علی کی زندگی کا اصل مقصد تھا۔ کراچی کے ایک سستے سے ہوٹل میں اس نے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کام میں اسے کئی دن لگ سکتے ہیں۔ وہ جلد مایوس ہو

جانے والے لوگوں میں سے نہیں تھا وہ سب سے پہلے اس اسپتال گیا جہاں سے اسے اپنا کچھ سراغ مل سکتا تھا اسے اشرف مسیح کے بارے میں معلومات حاصل کرنی تھیں۔ کیوں کہ اس فائل میں سب سے اوپر اسی شخص کا نام لکھا تھا اور علی کو یقین تھا کہ وہ شخص اس کے گھر والوں کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہوگا۔ اسپتال جا کر اسے مایوسی ہوئی کیوں کہ وہاں پر کوئی بھی اس شخص کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسپتال کو ایک نجی ادارے نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور اس کی ساری انتظامیہ تبدیل ہو چکی تھی۔ علی روزانہ ہی اسپتال کے چکر لگاتا تھا کہ شاید اسے ان لوگوں کے متعلق معلومات مل جائیں جن کا ذکر اس فائل میں موجود تھا۔ اسپتال کا پرانا ریکارڈ بھی کسی حادثے میں ضائع ہو چکا تھا اس لیے وہاں سے بھی علی کو اپنے متعلق معلومات نہیں ملیں۔ وہ اپنی تلاش کے متعلق تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ ایک روز قدرت کو اس پر رحم آ ہی گیا اور اسے اس شخص کا پتا مل گیا جسے وہ ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ وہ حسب معمول اسپتال میں اشرف مسیح کے بارے میں لوگوں سے پوچھتا پھر رہا تھا کہ ایمرجنسی روم کے باہر بیٹھے ایک شخص نے اس کی بات سن کر اسے امید دلا دی تھی کہ وہ اسے اشرف مسیح سے ملوا دے گا۔ علی جو اب ہمت ہار بیٹھا تھا۔ اس شخص کی اس امید نے جیسے اس کے دم توڑتے وجود کے اندر ایک نئی زندگی کی روح پھونک دی تھی۔

معاشرتی تفریق کے حساب سے یہ ایک غریبوں کی بستی تھی۔ علی حیران کن نظروں سے وہ علاقہ اور وہاں پر موجود مکانات کو دیکھ رہا تھا۔ یہ جگہ واقعی میں اس کے لیے بہت مختلف تھی۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے شخص نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا اور علی وہاں رک گیا۔ اب وہ شخص اس مکان کے لکڑی سے بنے ہوئے دروازے پر کچھ دیر دستک دیتا رہا۔ دستک دینے کے بعد اب وہ دونوں منتظر تھے کہ جس شخص سے وہ ملنے کے لیے آئے ہیں وہ باہر آئے کچھ دیر بعد ایک شخص گھر کے اندر سے باہر نکلا قدرے سیاہی مائل رنگت، مناسب قد، چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور اپنے کمزور سے وجود کے ساتھ کھڑا وہ شخص پہلی ہی نظر میں علی کو بہت عجیب لگا تھا۔ علی کے ساتھ کھڑے شخص کے ساتھ اس کی بہت بے تکلفی لگ رہی تھی۔ وہ ان دونوں کو ساتھ لیے گھر کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ دو کمروں پر مشتمل یہ چھوٹا سا گھر بہت صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ علی اب اس شخص کے ساتھ اس گھر میں موجود ایک کمرے میں تھا۔ اتنا تو علی کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس شخص کا نام اشرف مسیح ہے اور یہ وہی اشرف مسیح ہے جس کی علی کو تلاش تھی۔ اشرف مسیح ان دونوں کے لیے چائے لے کر آگیا تھا۔ علی اس سے بات کرنے کے لیے بہت بے چین تھا مگر اس کے ساتھ آتے شخص نے علی کو پہلے ہی منع کر رکھا تھا کہ وہ بات نہ کرے۔ وہ شخص خود بات شروع کرے گا۔

''بھائی اشرف! یہ لڑکا جو میرے ساتھ بیٹھا ہے، اسے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔'' علی کے ساتھ بیٹھے شخص نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

''جی بیٹا! تو آپ کو مجھ سے کیا ضروری کام ہے؟''

اشرف مسیح نے اپنے سامنے بیٹھے اس لڑکے کو مخاطب کیا جو دیکھنے میں کسی اچھے گھر کا معلوم ہو رہا تھا مگر اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے وہ بہت زیادہ پریشان ہو، اس کے پورے وجود سے ایک عجیب سی قسم کی ویرانی، اداسی، خاموشی، تنہائی اور وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چھپا درد اشرف سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

''آپ نے کبھی اسپتال میں کام کیا ہے؟'' علی نے اس سے پوچھا۔

''ہاں! میں نے کچھ عرصہ وہاں پر کام کیا ہے مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اشرف نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ اسے باقاعدہ اب اس لڑکے سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ جو نہ جانے کون سے حساب مانگنے اشرف مسیح کے پاس چلا آیا تھا۔

''برسوں پہلے اس اسپتال سے ایک بچہ اغوا ہوا تھا۔ آپ بھی اس گھناؤنے کام میں شریک تھے۔ میں آپ کو کسی قسم کی سزا دینے نہیں آیا ہوں۔ بس آپ مجھے اس بچے کے اصل والدین سے ملوا دیں۔'' علی نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات مکمل کی۔

اشرف مسیح کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی بات کے جواب میں کیا کہے۔ برسوں پہلے جو گناہ اس سے سرزد ہو گیا تھا اب اس کے حساب کا وقت آن پہنچا تھا۔ سوال کرنے والا اس کی نظروں کے سامنے کھڑا اس سے جواب مانگ رہا تھا۔ اپنا ماضی اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا۔

''تم کون ہو؟'' اشرف مسیح نے پوچھا۔

''میں وہی بدنصیب ہوں۔ جسے کئی سال پہلے اس کے اپنوں سے جدا کر دیا گیا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے علی کی آنکھیں نم ہو گئیں تھیں۔

''میں تمہارے اصل والدین کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ تمہاری ماں تو تمہاری پیدائش کے ساتھ ہی اس دنیا سے چلی گئی تھی۔ تمہارے خاندان کے باقی افراد اب نہ جانے کہاں پر ہوں گے۔ لیکن میں تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ اس طرح میرے ضمیر کا بوجھ بھی کچھ ہلکا ہوگا۔''

اتنا کہہ کر اشرف مسیح اب اس نوجوان کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا جس کی حالت اسے ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اگلے کئی دن تک وہ اسے شہر کی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر پھرتا رہا مگر جتنے لوگوں کو وہ جانتا تھا ان میں سے اکثر شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے۔ اشرف مسیح کو یاد تھا کہ جن دنوں اس بچے کی تلاش کا کام جاری تھا۔ ان دنوں اس نے ایک نوجوان کو اسپتال انتظامیہ سے الجھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے اسپتال انتظامیہ سے معلوم ہوا تھا کہ وہ لڑکا اس بچے کا ماموں ہے۔ اشرف مسیح نے ان دنوں اس نوجوان کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کیوں کہ ان دنوں تو وہ خود سے بھی چھپتا پھرتا تھا اور پھر کچھ عرصے بعد وہ شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا مگر اب علی کی خاطر اس نے ہر اس جگہ جا کر اس کے گھر والوں کو ڈھونڈا تھا جہاں اسے تھوڑی سی بھی امید ہوتی تھی کہ ان کا کچھ سراغ مل جائے گا مگر اس کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی تھی۔ علی کے ساتھ مل کر اس نے اخبار میں ایک اشتہار بھی دیا تھا جس میں دیگر تفصیلات کے ساتھ ساتھ علی کی تصویر بھی تھی مگر کسی نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ چند لوگوں نے اگر رابطہ کیا بھی تھا تو ان کے پاس کوئی خاص ثبوت نہیں تھا۔ جس کی بنیاد پر وہ ثابت کر سکیں کہ وہی علی کے خاندان کے افراد ہیں۔ اشرف مسیح کو علی کے گھر والوں کی شکلیں اچھی طرح یاد تھیں۔ اس لیے وہ سب لوگ ناکام ہی ثابت ہوئے تھے۔ علی کے ویزے کی میعاد بھی ختم ہونے والی تھی۔ اس لیے اب وہ واپس جا رہا تھا مگر اب اس کے دل میں کوئی حسرت نہیں رہی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کی قسمت میں اپنے گھر والوں سے ملنا لکھا ہی نہیں ہے۔ وہ سب سے لڑ سکتا ہے مگر اپنی قسمت سے نہیں لڑ سکتا۔ وہ اس سارے معاملے میں اشرف مسیح کو بھی قصوروار نہیں سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سب ایسے ہی ہونا تھا کیوں کہ اس کی قسمت میں ایسے ہی لکھا تھا۔ وہ سڈنی واپس آ گیا تھا جہاں باقی عمر اس نے اسی کرب میں گزارنی تھی کہ وہ لاوارث ہے۔ اس کی کوئی شناخت نہیں ہے۔ زندگی نے جہاں اسے تنہائی اور اکیلا پن دیا تھا اس سے اس کے اپنے چھین لیے تھے وہاں کیتھی جیسے مہربان لوگ بھی اس کے پاس موجود تھے۔ جن کے ہوتے ہوئے اسے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ جب کراچی گیا تھا تو ایک ہنستی مسکراتی کیتھی نے اسے رخصت کیا تھا مگر جب واپس آیا تو اسے لگا کہ کیتھی کی آنکھوں میں سوائے آنسوؤں اور ویرانیوں کے کچھ بھی نہیں ہے۔ اپنی سوتیلی ماں کے سلوک سے تنگ آ کر اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک ہاسٹل میں رہنے لگی تھی۔ اس کے دکھ اور پریشانیوں کی داستان سن کر علی کو اپنا دکھ بہت معمولی لگنے لگا تھا۔ علی نے اپنی باتوں سے اس کا حوصلہ بڑھایا اور اسے مایوسی کے اندھیروں سے نکالنے کی کوشش کی۔ علی کی ہمدردی پاتے ہی ایسے ہی ایک بے اختیاری کے لمحے میں کیتھی نے ایک بار پھر بہت بھرپور انداز میں اس سے اظہار محبت کر دیا اور علی کو لگا کہ کیتھی کی محبت کو قبول نہ کرنا اس پر ظلم ہوگا وہ جو اپنے والدین کی دی ہوئی تنہائی اور اکیلے پن کو کب سے برداشت کر رہی تھی ایسے میں اگر وہ بھی اس کی محبت کو نظر انداز کرتا تو نہ جانے وہ اپنے ساتھ کیا کر بیٹھتی۔ علی کو اس لمحے سائرہ بہت شدت کے ساتھ یاد آئی تھی مگر اب کیتھی کے التفات اور لگاؤ کے آگے سائرہ کی محبت کہیں دور چلی گئی تھی۔ ان دونوں نے سڈنی کے سینٹرل پارک میں پھولوں کی ایک خوب صورت باڑ کے سامنے عمر بھر کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کا عہد کر لیا تھا۔ علی نے کیتھی کو منگنی کی انگوٹھی پہنا دی تھی۔ وہ شادی کرنے پر اصرار کر رہی تھی مگر علی چاہتا تھا کہ پہلے اس کی تعلیم مکمل ہو جائے۔ منگنی کے بعد ان دونوں نے اپنی ساری توجہ تعلیم پر مرکوز کر دی تھی۔ کالج میں ان کے دوستوں نے انہیں مبارک باد دی تھی۔ اس لمحے علی کو سائرہ کی آنکھوں میں اپنے لیے ڈھیروں شکوے نظر آئے تھے مگر اب وہ کیتھی کے علاوہ کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنی پڑھائی میں مصروف رہتا تھا۔ سائرہ سے اس کا سامنا کم ہی ہوتا تھا مگر ایک روز وہ اسے آکسفورڈ اسٹریٹ پر ڈری سہمی سی نظر آئی اور علی سوچتا تھا کہ اگر وہ اس دن نہ ہوتا تو نہ جانے سائرہ کے ساتھ کیا ہو جاتا۔

☆......☆

محمد عبداللہ کی زندگی کیا بدلی اسے لگا کہ لوگوں کے رویے بھی بدل گئے ہیں۔ اس کی داڑھی کی وجہ سے اب ہر کوئی اسے شک بھری نظروں سے دیکھنے لگا تھا مگر محمد عبداللہ کے استاد نے اس کی اتنی سخت تربیت کی تھی کہ اب لوگوں کے رویے اسے سیدھی راہ سے نہیں بھٹکا سکتے تھے۔ شروع شروع میں اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کام کرے۔ اس کی داڑھی کی وجہ سے کوئی بھی اسے اچھی ملازمت دینے کو تیار نہیں تھا مگر پھر اسے سڈنی کے ہی ایک اسلامک سینٹر میں کام مل گیا۔ اسے وہاں انتظامی معاملات کا نگران بنا دیا گیا تھا۔ یہ اس کی پسند کا کام بھی تھا اور تنخواہ بھی اچھی تھی، جس میں اس کا اور سائرہ کا بہت اچھی طرح گزارا ہو جاتا تھا۔ اسے سائرہ کی بہت فکر رہتی تھی۔ مائدہ کے جانے کے بعد اسے لگتا تھا کہ اس کی بیٹی بہت خاموش رہنے لگی ہے۔ وہ اسلامک سینٹر سے واپس آنے کے بعد سائرہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارتا تھا اور اکثر شام کے وقت وہ اسے لے کر ساحل پر گھومنے چلا جاتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سائرہ اپنے شعبے میں بہت نام کمائے اور پھر وہ کسی اچھی جگہ اس کی شادی کر دے۔ وہ سائرہ کی پسند معلوم کرنا چاہتا تھا مگر جب بھی وہ اپنی بیٹی سے اس سلسلے میں کوئی بات کرنا چاہتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے جنہیں وہ سمجھ نہیں پاتا تھا۔ وہ تو اسے ہر وقت خوش دیکھنا چاہتا تھا مگر نجانے کیوں وہ خوش نہیں رہتی تھی۔ اس کی تصویروں میں

اداسی اور مایوسی کے رنگ زیادہ نظر آنے لگے تھے۔ امتحانات میں کامیابی کے بعد اس نے آرٹ میگزین میں ملازمت اختیار کرلی تھی۔ محمد عبداللہ نے اسے کسی کام سے نہیں روکا۔ وہ تو بس یہ چاہتا تھا کہ سائرہ کی شادی ہوجائے مگر یہ ایک ایسی بات تھی جس پر وہ رضامند نہیں ہوتی تھی۔ محمد عبداللہ کو لگتا تھا کہ اسلامک سینٹر کی یہ ملازمت اب اس کی زندگی کا حصہ بن گئی ہے۔ اب تو سائرہ نے بھی اسلامک سینٹر جانا شروع کردیا تھا اور اپنی بیٹی کی زندگی کی یہ خوش گوار تبدیلی اسے اچھی لگی تھی مگر باوجود کوشش کے کہ وہ اپنی بیٹی کی زندگی میں موجود تنہائی کو دور نہیں کرپایا تھا۔

سڈنی کا موسم اس روز ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خوشگوار تھا اور سائرہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ لمبی سی واک کرے۔ اسے ایسے موسموں میں واک کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ ابھی اپنی پسندیدہ شاہراہ پر پیدل چلتے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اچانک اسے ایرک اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ ایرک کو اپنے ساتھ ساتھ چلتے دیکھ کر سائرہ کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی تھی۔ اچانک سے ایرک نے چاقو نکال لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سائرہ پر حملہ کرتا نہ جانے کہاں سے علی نے آکر اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے گھسیٹتا ہوا سائرہ کی نظروں سے دور لے گیا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ سائرہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ ایرک اور علی اب اس سے کافی دور چلے گئے تھے۔ اس وقت وہاں پر رش زیادہ تھا۔ اس لیے وہاں پر موجود لوگوں نے اس چیز کو محسوس نہیں کیا تھا۔ سائرہ کی رفتار میں اب تیزی آگئی تھی۔ وہ بہت خوف زدہ تھی اور جلد از جلد گھر چلی جانا چاہتی تھی کہ ایک بار پھر کوئی اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا اور اس خوشبو کو وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ علی کی خوشبو تھی جس کے قرب سے سائرہ کو اپنی دھڑکنیں منجمد ہوتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔

”سائرہ! تم نے کبھی ایرک کا بہت دل دکھایا تھا۔ وہ اسی لمحے کا بدلہ تم سے لینا چاہ رہا تھا مگر اب علی کا وعدہ ہے کہ ایرک کبھی بھی تمہارے راستے میں نہیں آئے گا۔ میں نے اسے بہت اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔“

علی چند جملے بول کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا اور سائرہ نم آنکھوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی وہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر اس کے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس روز کے بعد ایرک کبھی بھی اس کے راستے میں نہیں آیا۔ علی نے اور اس نے امتحانات میں ایک ساتھ کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ علی کو کبھی بھول نہیں سکتی تھی۔ اس لیے اس نے یہ کوشش ہی ترک کردی تھی۔ وہ اپنے فن پر توجہ دے رہی تھی۔ اسے ایک بہت مشہور آرٹسٹ بننا تھا اور اب یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا۔

کیتھی سے منگنی کے باوجود علی اکثر تنہائی میں صرف اور صرف سائرہ کے بارے میں ہی سوچتا تھا اور اس واقعے کے بعد تو علی کو وہ کسی ڈری سہمی ہوئی کسی خوف زدہ بچی کی طرح لگی تھی اور اس لمحے اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر سب سے دور لے جائے مگر محض چند لفظ بول کر وہ اس سے بہت دور چلا گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی محبت کو سائرہ دیکھ لے۔ امتحانات میں کامیابی کے بعد علی کا ارادہ مزید تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ اپنے والد کی فرم اس نے نہایت اچھے داموں پر فروخت کردی تھی۔ اس طریقے سے حاصل ہونے والی تمام رقم اس نے ایک خیراتی ادارے کو وقف کردی تھی۔ اس بات پر کیتھی سے اس کا جھگڑا بھی ہوا تھا مگر اس معاملے میں اس نے کیتھی کی کوئی بات نہیں سنی تھی۔ وہ ان پیسوں پر اپنا کوئی حق نہیں

سمجھتا تھا۔ اس نے ایک آرٹ فرم میں ملازمت اختیار کرلی تھی اور تعلیم مکمل ہوتے ہی اس کا ارادہ کیتھی کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا تھا مگر اب کیتھی کا رویہ اسے مایوس کررہا تھا۔ وہ اب کئی کئی دن اس سے بات نہیں کرتی تھی۔ علی ایک دوبار اسے اپنے ایک کلاس فیلو کے ساتھ انتہائی بے تکلف انداز میں گھومتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اس نے جب کیتھی سے بازپرس کی تو کیتھی نے تحمل سے اس کی بات سننے کے بجائے اس سے جھگڑا شروع کردیا۔ اب وہ بات بے بات علی سے الجھنے لگی تھی۔ ان کے درمیان اب روزانہ ہی کسی نہ کسی بات پر جھگڑا ہونے لگا تھا۔ علی کو اب بہت شدت سے محسوس ہونے لگا تھا کہ کیتھی نے اور دلچسپیاں ڈھونڈ لی ہیں اور اب علی کی ذات میں اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی اور پھر ایک روز اچانک اس نے علی سے وہ برائے نام تعلق بھی ختم کرلیا اور اس کی دی ہوئی انگوٹھی اسے واپس کردی۔ علی کو زندگی میں پہلی بار عورت کے نام سے ہی نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ پہلا دکھ اس کے شناسا ایرک کو سائرہ نے دیا تھا اور علی کو لگتا تھا کہ سائرہ نے صرف ایرک کو ہی نہیں بلکہ اسے بھی دھوکہ دیا تھا اور اب جو کچھ کیتھی نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے بعد تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ عورت کا دوسرا نام دھوکا ہے۔ کیتھی کو صرف اس کی دولت سے محبت تھی اور جب دولت کو اس نے خود سے دور کرلیا تو کیتھی بھی اس سے دور چلی گئی۔ علی کو لگتا تھا کہ کیتھی نے جو چوٹ اسے پہنچائی ہے اس کے بعد وہ زندہ نہیں رہ پائے گا مگر وہ زندہ تھا اور اسے زندہ رہنا تھا ابھی تو اس کی زندگی کے گلشن میں موسم بہار نے دستک دینی تھی۔ وہ دن بھر اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔ اس کی یونیورسٹی کی تعلیم بھی مکمل ہوگئی تھی۔ اس کے فن میں بھی نکھار آتا جارہا تھا۔ ایک روز اس کے گھر پر اس سے کچھ لوگ ملنے کے لیے آئے اور وہ کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ وہ بہت خاص لوگ تھے جن سے ملنے کے بعد علی کو لگا تھا کہ وہ اندھیروں سے نکل کر روشنیوں میں آگیا ہو اور ان روشنیوں نے صرف اس کی ذات کو نہیں بلکہ اس کے اردگرد کی سب جگہوں کو روشن کردیا ہو۔

☆......☆

موسیٰ حیات کو وہ نوجوان پہلی ہی نظر میں دوسروں سے بہت مختلف اور متاثر کن شخصیت کا حامل لگا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اسے اس نوجوان میں اپنی بیوی عروہ کی بہت شباہت نظر آئی تھی اور اسے دیکھ کر بے اختیار موسیٰ کے دل سے دعا نکلی تھی کہ کاش اس کا اپنا بیٹا بھی ایسا ہی ذہین ہو، موسیٰ کی علی سے پہلی ملاقات ایک آرٹ کانفرنس کے دوران ہوئی تھی جہاں اس کے کچھ فن پارے بھی رکھے تھے۔ موسیٰ کو نہ صرف علی کی شخصیت بلکہ اس کے کام نے بھی بہت متاثر کیا تھا، موسیٰ کو اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننے میں بہت دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی، موسیٰ صرف اتنا ہی جان سکا تھا کہ اس نوجوان کا نام علی ہے اور اس کے والد آسٹریلیا کی ایک مشہور کمپنی کے مالک ہیں جواب اس دنیا میں نہیں رہے، اس کے کوائف جان کر موسیٰ کو مایوسی ہوئی تھی۔ علی آسٹریلیا کی شہریت کا حامل تھا اور اس کا بچپن اور لڑکپن سب سڈنی میں ہی گزرے تھے۔ اس لیے موسیٰ نے اپنے ذہن میں آنے والے ان تمام خیالات کو رد کردیا جو علی کے سامنے آتے ہی موسیٰ کے دل و دماغ میں آکر شور مچانے لگتے تھے۔ موسیٰ کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ علی کے والدین کا تعلق پاکستان سے تھا مگر یہ کوئی ایسی وجہ نہیں تھی جس کی بنیاد پر وہ یہ کہہ سکتا کہ علی ہی اس کا بیٹا ہے کیونکہ سڈنی میں اور بھی بہت سے پاکستانی خاندان رہتے تھے مگر موسیٰ اس نوجوان کو کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ جب بھی اس کی بنائی ہوئی تصاویر دیکھتا تو اس کے دل میں خوشی کے بہت سے جذبات ابھرنے لگتے تھے

اور اسے لگتا تھا کہ یہ تصویر علی نے نہیں بلکہ اس نے خود بنائی ہے۔ موسیٰ نے اپنی اس کیفیت کا ذکر اپنے دوست محسن سے کیا تو اسے بھی بہت حیرت ہوئی۔ محسن کا خیال تھا کہ موسیٰ کو تو ہر نوجوان میں اپنا بیٹا نظر آتا ہے، ورنہ سڈنی میں رہائش پذیر اس نوجوان کا موسیٰ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ موسیٰ کے پاس محسن کے علاوہ کچھ خاص دوست نہیں تھے جن سے وہ اپنی اس کیفیت کا ذکر کرتا جو علی کو دیکھ کر موسیٰ پر طاری ہو جاتی تھی۔

وہ اس معاملے میں خود کو بہت بے بس محسوس کرتا تھا۔ اس کا اپنا خون دنیا کی بھیڑ میں کہیں گم ہو چکا تھا، یہ ایک ایسا زخم تھا جس نے موسیٰ کے پورے جسم کو مفلوج کر رکھا تھا جب وہ علی کو دیکھتا تھا یہ زخم پھر سے تازہ ہو جاتا تھا۔ ایک روز محسن نے اسے مائدہ کی بیٹی سائرہ سے ملوایا، وہ لڑکی اپنی ماں کی طرح ہی بہت خوب صورت اور ذہین تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک بہت اچھی مصورہ تھی۔ اس کی تصویروں کے آگے تو موسیٰ کو علی کی تصویروں کے رنگ بھی پھیکے نظر آتے تھے۔ مائدہ کے شوہر سے مل کر بھی اسے شدید قسم کی حیرت ہوئی تھی۔ محمد عبداللہ نامی یہ نومسلم سڈنی کے ایک اسلامک سینٹر میں کام کرتا تھا اور دینی معاملات میں اس کی معلومات نہایت قابل رشک تھیں۔ سائرہ کو دیکھ کر موسیٰ کے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ کاش ان کا بیٹا بھی ان کے پاس ہوتا تو وہ سائرہ کو اپنی بہو بناتے اور ہمیشہ کے لیے اسے اپنے بیٹے کی زندگی میں شامل کر لیتے۔ تھوڑے ہی عرصے میں سائرہ کی موسیٰ کے ساتھ بہت بے تکلفی ہو گئی تھی۔ وہ دونوں گھنٹوں بیٹھ کر مائدہ کی ہی باتیں کرتے رہتے تھے۔ سائرہ اکثر موسیٰ کو ملنے اس کے گھر آ جاتی تھی۔ موسیٰ کو لگتا تھا کہ سائرہ سے ملنے کے بعد ان کی زندگی بہت خوشگوار ہو گئی ہے مگر جب اپنے گمشدہ بیٹے کا خیال آتا تو ان کے دل میں دبے زخم ایک بار پھر سے تازہ ہو جاتے مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ سائرہ سے ملنے کے بعد ان کے جسم کے ساتھ چپکے ہوئے یہ اداسی کے خول آہستہ آہستہ اترنے لگے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ اب وہ ایک نارمل انسان بننے لگا ہے۔ محمد عبداللہ سے بھی ان کی بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ اب وہ اس کے ساتھ اکثر اسلامک سینٹر جانے لگے تھے۔ سائرہ کو دیکھ کر انہیں لگتا تھا کہ وہ بھی کسی ناکام محبت کے دکھ میں مبتلا ہے۔ وہ اکثر جب موسیٰ کے ساتھ باتیں کرتے کرتے بے انتہا ہنستی تو اس کی آنکھوں میں چھپے اداسیوں کے منظر موسیٰ کی نظروں کی گرفت میں آ جاتے تھے۔ موسیٰ نے تو خود اپنی زندگی میں کسی سے بے انتہا محبت کی تھی۔ تو وہ کیسے اس کی آنکھوں میں چھپی کسی کی محبت کو نہ کھوج پاتے موسیٰ کو اس دن کا انتظار تھا جب وہ خود ان سے یہ سب کہہ دیتی مگر اس دن کے آنے سے پہلے ہی موسیٰ کی زندگی میں ایک بہت بڑا دن آ گیا۔ ایک روز انہیں پاکستان سے بہت سالوں بعد ان کے ایک دوست کا فون آیا جو کہ پولیس میں تھا۔ برسوں پہلے موسیٰ نے اسی کے ساتھ مل کر اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ناکام رہے تھے۔ اتنے برسوں بعد اس نے فون پر موسیٰ کو جو خبر سنائی تھی۔ اسے سن کر ان کے مردہ وجود میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ انہیں لگا کہ ان کی زندگی کے حبس زدہ موسم میں اچانک سے نہایت ہی خوشگوار ہوا چلنے لگی ہو۔ ان کے دوست نے بتایا تھا کہ ان کے بیٹے کا سراغ مل گیا ہے۔ اب وہ عروہ کے بھائی اور ایک اور شخص اشرف مسیح کو لے کر سڈنی آ رہے ہیں اور یہ بھی کہ ان کا بیٹا ان ہی کے شہر میں ہے۔ موسیٰ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر اپنے بیٹے کے پاس پہنچ جائیں۔ وہ بہت خوش تھے اور انہیں ایسے لگ رہا تھا کہ ان کی خزاں رسیدہ ویران زندگی میں بہار مکمل طور پر اب اپنا رنگ جمانے لگی ہو۔

☆......☆

"کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟"

موسیٰ نے مسکراتے ہوئے اس نوجوان سے پوچھا۔ جسے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں ان کے دل نے گواہی دی تھی کہ یہی ان کے وجود کا وہ حصہ ہے جسے وہ برسوں سے تلاش کر رہا ہے اور اب پاکستان سے آئے ہوئے اس کے دوست نے موسیٰ کے گمان پر یقین کی مہر ثبت کر دی تھی۔ وہ تینوں اب علی کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئے تھے جہاں پر قدم قدم پر بکھری ہوئی بے ترتیبی دیکھ کر موسیٰ زیر لب مسکرانے لگا تھا کیوں کہ ایک زمانے میں وہ بھی ایسی ہی لاپرواہی سے چیزوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکا کرتا تھا۔ تب عروہ سے اس کی ہلکی پھلکی جھڑپ بھی ہو جایا کرتی تھی۔ عروہ کا سوچ کر موسیٰ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"علی بیٹا! آپ کیسے ہو؟" اشرف مسیح یہ کہتے ہوئے پھر اس نوجوان کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے موسیٰ کے پاس لے آیا۔

"علی! ان سے ملو۔ یہ موسیٰ حیات ہیں۔ یہ...... تمہارے والد ہیں علی۔" اشرف مسیح نے بغیر کسی لمبی چوڑی تمہید کے علی کو وہ بات بتا دی جس کو بتانے کے لیے وہ خاص طور پر سڈنی آیا تھا۔

علی کے لیے یہ تمام انکشافات کسی دھماکے سے کم نہیں تھے۔ وہ کسی مجسمے کی طرح اشرف مسیح کو بولتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس بات پر کیسے اپنے ردعمل کا اظہار کرے۔

"علی بیٹا! جب آپ سڈنی واپس چلے گئے تھے اس کے چند دن بعد ہی آپ کے ماموں میرے پاس آئے۔ ان کے ہاتھ میں اخبار کا وہ اشتہار تھا جس میں آپ کی موجودہ تصویر بھی تھی اور ساتھ میں آپ کی گمشدگی کے حوالے سے تمام تفصیلات موجود تھیں۔ میں انہیں دیکھ کر پہچان گیا تھا کیوں کہ میں نے آپ کی گمشدگی کے بعد اکثر انہیں اسپتال کی انتظامیہ سے الجھتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں انہیں آپ سے ملوا دوں گا۔ ان کا رابطہ پولیس کے ساتھ تھا۔ وہیں پر آپ کے والد کے ساتھ رابطہ ہوا اور اب میں آپ کے سامنے ہوں۔"

اشرف مسیح نے اپنی بات مکمل کر کے علی کی طرف دیکھا جو یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے کسی ردعمل کا اظہار کرتا۔ موسیٰ آگے بڑھا اور اس نے علی کو گلے لگا لیا۔ کہتے ہیں اس کائنات کا سب سے حسین منظر وہ ہوتا ہے جب کوئی ماں پہلی بار اپنے بچے کو گود میں اٹھاتی ہے۔ علی کی ماں نہیں تھی مگر جب باپ نے اسے آگے بڑھ کر گلے سے لگایا تو وہ بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پایا اور بچوں کی طرح زار و قطار رونے لگا۔ برسوں کے آنسو اس نے اپنی آنکھوں میں جمع کر رکھے تھے جو موسیٰ کے ملتے ہی اس کی آنکھوں سے ابل پڑے تھے۔ اشرف مسیح اور عروہ کے بھائی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ موسیٰ حیات کی برسوں کی تلاش مکمل ہوئی تھی اور علی کو سائبان مل گیا تھا۔ اس کی ذات کا ادھورا پن مکمل ہوا تھا۔ اب وہ اکیلا نہیں رہا تھا۔ اس کو اس کے اپنے مل گئے تھے۔ اسے لوگ نواز شاہ کے بیٹے کی حیثیت سے جانتے تھے مگر اب اسے اپنی پہچان ملی تھی۔ وہ معروف مصور موسیٰ حیات کا بیٹا تھا جن کو ایک دنیا جانتی تھی۔ علی کو خود پر بہت فخر محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک معروف شخصیت کا بیٹا ہے۔ جن کی پہچان صرف ان کی مصوری نہیں تھی بلکہ فلاحی کاموں میں بھی ان کی ایک شہرت تھی۔ علی کے لیے یہ احساس ہی بہت خوب صورت تھا کہ اس کی بھی کوئی شناخت ہے۔ اسے اس کے اپنے مل گئے تھے۔ اس سے بڑھ کر اسے کسی چیز کی حاجت اب نہیں رہی تھی۔ وہ اتنا خوش تھا کہ زندگی کے دیے ہوئے زخم کچھ دیر کے لیے

بھول گیا تھا۔ وہ موسیٰ کے ساتھ ایک بار پھر کراچی گیا تھا۔ وہاں پر اپنے باقی رشتے داروں سے مل کر وہ جیسے ہواؤں میں اڑتا پھرتا تھا۔ وہ اپنی ماں کی قبر پر بھی گیا تھا جہاں جا کر وہ غمگین تو ضرور ہوا تھا مگر موسیٰ کی محبت نے اس کے سارے غموں کو جیسے بھلا دیا تھا۔

سائرہ کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی تھی کہ علی موسیٰ حیات کا بیٹا ہے۔ وہی موسیٰ حیات جن سے مل کر اسے ایک انجانی سی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ بحیثیت مصور اور سماجی کارکن کے تو وہ انہیں جانتی ہی تھی مگر اپنی والدہ کے ایک پرانے دوست کی حیثیت سے جان کر اس نے ان کے اندر کا ایک خوب صورت انسان دریافت کیا تھا۔ اپنے والد کے بعد موسیٰ حیات وہ دوسرے شخص تھے جن کے ساتھ وقت گزارنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ لوگ موسیٰ حیات کو ایک خشک اور جذبات سے عاری انسان قرار دیتے تھے مگر سائرہ کو ایسا کچھ نہیں لگا تھا وہ تو جب بھی ان سے ملی تھی انہوں نے بہت اچھے طریقے سے اس سے بات کی تھی۔ ان کی تنہائی اور اکیلے پن کی داستان سن کر وہ بہت اداس ہو گئی تھی۔ وہ اپنی گفتگو سے ان کی اندر کی تنہائی کے احساس کو کم کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی اور اس سلسلے میں اسے اپنے والد محمد عبداللہ کا تعاون بھی حاصل تھا۔ اسے جو بھی وقت ملتا تھا وہ موسیٰ کے ساتھ کچھ وقت گزارتی تھی۔ وہ اس کے بہت اچھے دوست بن چکے تھے۔ اب اگر وہ کسی وجہ سے ان کے گھر نہ جا پاتی تو وہ خود اس کے گھر آ جاتے اور پھر اسے لے کر کہیں نہ کہیں گھومنے نکل پڑتے۔ وہ اپنی ذات کے خول سے اب باہر نکلنے لگے تھے اور اپنی اس بدلتی ہوئی کیفیت کی وجہ وہ صرف اور صرف سائرہ کو قرار دیتے تھے اس نے ان کا ایک خوبصورت پورٹریٹ بنا کر جب انہیں پیش کیا تو وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر ہر ایک کو وہ پورٹریٹ دکھاتے پھر رہے تھے اور اپنی ایک تصویری نمائش میں انہوں نے وہ پورٹریٹ خاص طور پر رکھا تھا اور سائرہ کو لگتا تھا کہ اس قدر خوب صورت تصویر اس نے آج تک نہیں بنائی۔ موسیٰ حیات کی تعریفیں سن کر اسے لگتا تھا کہ وہ واقعی میں بہت اچھی آرٹسٹ ہے۔ وہ اتنے بڑے آرٹسٹ تھے مگر سائرہ کو ان کے اندر غرور نام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ وہ بہت کم بولتے تھے مگر جس سے بھی ملتے تھے نہایت عاجزی اور انکساری سے بات کرتے تھے۔

☆......☆

جب سے علی ان کی زندگی میں آیا تھا۔ ان کے لب بات بے بات مسکرانے لگے تھے۔ سائرہ نے ان کو اس طرح خوش پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اب ان کے پاس کم ہی جاتی تھی۔ اسے لگتا تھا اب موسیٰ حیات کو سائرہ کی کمپنی کی ضرورت نہیں رہی۔ علی کا رویہ بھی اسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ علی اس کی موجودگی کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اس لیے اس نے بہتر یہی سمجھا کہ وہ موسیٰ حیات کی ذاتی زندگی سے دور ہی رہے اور ان دونوں باپ بیٹوں کو زیادہ سے زیادہ اکٹھے وقت گزارنے دے۔ برسوں بعد تو علی اپنے باپ کو ملا تھا۔ ایسے میں وہ اس کی کیفیت سمجھ سکتی تھی اس کو خود بھی مناسب نہیں لگتا تھا کہ وہ ان دونوں کے درمیان کباب میں ہڈی بن جائے مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ موسیٰ حیات اب کیا سوچنے لگے ہیں اور ان کے دماغ میں علی کو پالینے کے بعد کیا سوچ سر اٹھانے لگی ہے۔ اسے تو تب پتا چلا جب محمد عبداللہ نے اسے آ کر بتایا کہ انہوں نے سائرہ کو ہمیشہ کے لیے علی کی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے مگر وہ اس سلسلے میں اس وقت تک کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے جب تک سائرہ کوئی مثبت جواب نہیں دے گی۔ یہ بات سن کر سائرہ کے لبوں پر بے اختیار ایک حسین مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی اور اس کے بغیر کچھ کہے ہی محمد عبداللہ

سمجھ گئے تھے کہ ان کی بیٹی دل و جان سے اس خوب صورت بندھن میں بندھنے کے لیے تیار ہے اور پھر ایک خوب صورت شام میں چند مہمانوں کی موجودگی میں سائرہ کو علی کے ساتھ نکاح کے حسین بندھن میں باندھ دیا گیا۔ موسیٰ حیات نے سڈنی کے ایک مشہور ساحل کے کنارے علی اور سائرہ کے لیے ایک خوب صورت گھر خریدا تھا۔ موسیٰ کی خواہش تھی کہ وہ دونوں اپنی نئی زندگی کا آغاز اسی گھر سے کریں۔ اس لیے نکاح کے فوراً بعد وہ دونوں نئے گھر میں منتقل ہو گئے تھے۔

سائرہ کو اپنے خاندان کا حصہ بنا کر موسیٰ بہت خوش تھے۔ وہ مائدہ کو تو واپس نہیں لا سکتے تھے مگر انہیں یقین تھا کہ اس روز آسمانوں پر مائدہ کی روح بہت خوش ہو گی۔ انہیں اس روز عروہ بھی بہت یاد آئی تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ اب وہ کچھ عرصے کے لیے پاکستان چلے جائیں۔ وہ اپنے ملک کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے اور اب جب کہ ان کی زندگی میں کوئی حسرت نہیں رہی تھی۔ اس لیے اپنے لوگوں میں جا کر وہ ان کے دکھ کو کم کرنا چاہتے تھے۔ اس بار ان کا دوست محسن بھی ان کے ساتھ تھا۔ کراچی سے ان دونوں کی بہت تلخ یادیں وابستہ تھیں مگر وہ اور محسن ان تلخ یادوں کو بھلا کر ایک نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔ علی کے حوالے سے اب وہ بالکل بھی فکر مند نہیں تھے۔ انہیں اپنے انتخاب سائرہ پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ علی کی ایک بہترین ہمسفر ثابت ہو گی۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس رشتے کے حوالے سے علی کیا سوچ رہا ہے اگر انہیں اس کے ارادوں کی خبر ہوتی تو وہ اسے کبھی بھی اس رشتے کے لیے راضی نہ کرتے۔

سائرہ کو رخصت کرنے کے بعد محمد عبداللہ مائدہ کی قبر پر چلے گئے اور بہت دیر تک اس کی قبر کے پاس بیٹھ کر اپنی زندگی کے سود و زیاں کا حساب کرتے رہے، وہ جانتے تھے کہ مرتے وقت وہ ان سے ناراض تھی مگر اب انہوں نے ہر لحاظ سے ایک بہترین انسان کا سائرہ کے لیے انتخاب کیا تھا جس پر انہیں یقین تھا کہ مائدہ کی ساری ناراضی بھی ختم ہو گئی ہو گی۔ اندھیرا جیسے ہی بڑھنے لگا وہ اسلامک سینٹر چلے گئے۔ ان کا زیادہ تر وقت اب اسلامک سینٹر میں ہی گزرتا تھا۔ انہوں نے قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث اور فقہی علوم پر بھی عبور حاصل کر لیا تھا۔ لوگ اپنے دینی مسائل کے لیے اکثر ان سے رجوع کرتے تھے۔ وہ اپنی پچھلی زندگی کی طرف دیکھتے تھے تو انہیں احساس ہوتا تھا کہ انہوں نے کس قدر غلیظ اور گناہوں میں لتھڑی ہوئی زندگی گزاری تھی مگر اب ان کی زندگی کیا بدلی، ان کے اندر سے غم اور پریشانیوں کا احساس جیسے رخصت ہو گیا تھا۔ اب انہیں صرف ایک ہی بات کی فکر رہتی تھی کہ وہ اپنے کسی عمل سے اپنے رب کو ناراض نہ کریں۔ وہ ہر لحہ اپنے رب کو راضی کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ انہیں خوشی تھی کہ موسیٰ حیات نے لوگوں کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے۔ موسیٰ کے تمام فلاحی منصوبوں میں وہ ان کے ساتھ تھے۔ وہ اپنے استاد محترم کے پاس بھی کافی وقت گزارتے تھے۔ ان کے استاد کا حکم تھا کہ اب وہ آسٹریلیا سے باہر جا کر دین کی تبلیغ کریں۔ سو وہ ان کے حکم پر کچھ عرصے کے لیے فرانس چلے گئے۔ وہ بہت خوشگوار حالات میں فرانس گئے تھے مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ جب واپس آئیں گے تو ایک اور آزمائش ان کی منتظر ہو گی۔

☆......☆

”تم مجھے کتنا چاہتی ہو؟“ یہ وہ پہلا سوال تھا جو علی نے اپنے کمرے میں آتے ہی سائرہ سے کیا تھا۔ وہ دلہن بنی اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ اسے لگا کہ علی سب سے پہلے اس کے حسن کو سراہے گا مگر آنے والے نے تو بہت عجیب سا سوال اس سے کر دیا تھا۔ وہ خاموش رہی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے

یہ سوال ہی انتہائی غیر مناسب لگا تھا۔

''سائرہ! مجھے بتاؤ کہ تم مجھے کتنا چاہتی ہو؟'' اس بار علی کی آواز اونچی ہوگئی تھی۔ سائرہ کو اس کے لہجے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

''میں آپ کو بہت چاہتی ہوں علی!'' سائرہ نے علی کی طرف دیکھ کر کہا۔ اسے لگا کہ اس کا شوہر اب اس کے جواب سے مطمئن ہوا مگر علی کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ بالکل بھی مطمئن نہیں ہوا۔

''کوئی ثبوت؟'' اب اگلا سوال کیا گیا۔

''آپ کو کیسا ثبوت چاہیے؟'' سائرہ نے بھی اسی انداز میں پوچھا جس انداز سے علی اس سے سوال و جواب کا یہ کھیل کھیل رہا تھا۔

''اٹھو۔'' علی نے اب اسے حکم دیا۔

وہ اس کے حکم کی تعمیل میں بیڈ سے اتری تو علی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے میں موجود کھڑکی کے قریب لے آیا۔ اس کھڑکی سے سمندر کا نہایت شاندار نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

''اس کھڑکی سے نیچے سمندر میں چھلانگ لگا دو۔ مجھے تمہاری محبت کا یقین آ جائے گا۔'' علی انتہائی سنجیدگی سے کہتا ہوا کھڑکی کی دوسری طرف کھڑا ہو گیا۔

سائرہ نے ایک نظر کھڑکی سے نظر آتے خاموش اور گہرے سمندر کی طرف نگاہ ڈالی اور دوسری نظر اپنے شوہر کی طرف ڈالی جس کی ذہنی حالت اسے ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کھڑکی کے پاس کھڑی رہی اور پھر دوبارہ سے اپنے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ ساری رات علی اسے شدید قسم کے ذہنی تشدد کا نشانہ بناتا رہا۔ یہ سب کچھ اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ اس کا باپ اس کی ماں کو مرتے دم تک ذہنی و جسمانی تشدد کا نشانہ بناتا رہا تھا۔ مگر اب کی بار ہدف اس کی اپنی ذات تھی اس لیے تکلیف بھی زیادہ ہوئی تھی۔ علی تمام رات اسے وقفے وقفے سے کیتھی کی بے وفائی کی داستانیں سناتا رہا اور وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ علی اپنے اندر موجود تمام نفرت اور غصہ باہر نکل دے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ علی وہ تمام نفرت اور غصہ وقفے وقفے سے سائرہ کے اندر منتقل کرتا رہا۔ ہر لڑکی کے اپنی نئی زندگی کے حوالے سے کچھ خواب ہوتے ہیں اور ایسے ہی کچھ خوب صورت خواب سائرہ نے دیکھے تھے۔ علی موسیٰ حیات جس کے تاعمر ساتھ کی ہر لمحہ اس کے دل نے تمنا کی تھی کاتب تقدیر نے اس کے نصیب میں علی کا ساتھ لکھ دیا تھا مگر یہ وہ علی نہیں تھا جس کے دھیمے مزاج کی وہ گرویدہ تھی۔ یہ تو کوئی انتہائی اذیت پسند انسان تھا جسے سائرہ کو اذیت دینے میں لطف آتا تھا۔ وہ روزانہ ہی اسے اذیت دینے کے نت نئے طریقے ڈھونڈا کرتا تھا۔ اسے روکنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ محمد عبداللہ اور موسیٰ حیات دونوں ان دنوں سڈنی سے باہر تھے۔ ایسے میں علی کے پاس بھرپور موقع تھا کہ وہ سائرہ کو اپنے غصے اور نفرت کا نشانہ بناتے، وہ سائرہ کو تب تک اذیت دیتا رہا جب تک سائرہ کے صبر کی حد نہیں ہو گئی۔

پورے چھ ماہ تک سائرہ اس کے ہر ظلم اور تکلیف کو برداشت کرتی رہی۔ موسیٰ حیات اور محمد عبداللہ سے تقریباً اس کی روزانہ ہی بات ہوتی تھی اور ان دونوں کو اس نے یقین دلا رکھا تھا کہ وہ علی کے ساتھ بہت خوش ہے اور ایسا ہی یقین علی نے بھی ان دونوں کو دلا رکھا تھا۔ سائرہ اور علی کے درمیان ایک خاموش معاہدہ تھا کہ وہ دونوں اپنے جھگڑوں کی خبر اپنے بڑوں کو نہیں ہونے دیں گے اور چاہے جو کچھ ہو وہ اپنے جھگڑوں کو صرف اپنی ذات تک ہی محدود رکھیں گے مگر جب جھگڑے حد سے بڑھ جائیں تو جو لوگ ہمارے

دل کے قریب ہوتے ہیں انہیں کسی نہ کسی طرح خبر ہو ہی جاتی ہے۔ سائرہ اپنی محبت سے علی کی ذہنی حالت کو بدلنے کی کوشش کرتی رہتی تھی مگر علی ہر بار اس کو بہت بری طرح دھکارتا رہتا تھا۔ وہ علی کی بے رخی سہتے سہتے تھک سی گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ علی کو اس سے جتنے بھی شکوے ہیں وہ علی اب ختم کر دے اور وہ ویسا ہی علی بن جائے جسے پہلی نظر میں دیکھتے ہی وہ اپنا دل ہار گئی تھی مگر وقتی طور پر تو اسے ایسا کچھ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ علی کا تلخ رویہ ہی صبح و شام اس کا مقدر تھا۔ اس کی محبت، آنسو، آہیں، سسکیاں سب علی کا رویہ بدلنے میں ناکام رہے تھے۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے اندر کی آرٹسٹ بھی مر گئی ہے۔ اس تمام عرصے میں بحیثیت مصور علی کو بہت کام مل رہا تھا اور اس کی شہرت میں اضافہ ہو رہا تھا مگر سائرہ کے کینوس پر اب کوئی رنگ نہیں ابھرتا تھا۔ دن اور رات کا سفر جاری و ساری تھا۔ جتنا اذیت ناک دن نکلتا تھا، رات کے سیاہ رنگ میں بھی ویسی ہی تلخی ہوتی تھی۔ کچھ دنوں سے وہ بہت خاموش تھی۔ اس نے علی کے ساتھ الجھنا بھی اب ختم کر دیا تھا۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح گھر کے کام کرتی تھی۔ علی کی اذیت سہتی تھی اور اسی طرح دن کا اختتام ہو جاتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اب وہ کبھی بھی علی کو اپنی محبت کا یقین نہیں دلا سکے گی اور ایک روز مایوسی کے عالم میں اس نے خود کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا مگر سمندر کی لہروں نے اسے واپس اچھال دیا کیوں کہ ابھی زندگی کو اس کی ضرورت تھی۔

☆......☆

علی مسلسل کئی راتوں سے جاگ رہا تھا اگر ذرا سی دیر کو اس کی آنکھ لگ بھی جاتی تو ہوش کی دنیا میں آنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ وہ کئی روز سے سڈنی کے اس اسپتال میں موجود تھا جہاں اس کی زندگی سائرہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد کومہ میں چلی گئی تھی۔ علی روزانہ ہی گھنٹوں بیٹھ کر اسے دیکھتا رہتا تھا جو علی کی اذیت سہتے سہتے اس حال کو پہنچ چکی تھی۔ علی سے موسیٰ حیات اور محمد عبداللہ دونوں ہی سخت ناراض تھے۔ موسیٰ نے تو اسے خبردار کیا تھا کہ اگر سائرہ کو کچھ ہوا تو وہ ساری زندگی ان کی شکل دیکھنے کو ترس جائے گا۔ محمد عبداللہ اسے کہتے تو کچھ نہیں تھے مگر ان کی نظروں میں اب اس کے لیے اپنائیت کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ اس کا دل جانتا تھا کہ وہ ان دونوں کا سامنا کیسے کرتا تھا۔ وہ تو اپنے آپ سے چھپتا پھرتا تھا۔ اس کا اپنا حال بھی دیوانوں جیسا ہی تھا۔ ملگجے حلیے اور بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ پہلی نظر میں اسے دیکھ کر کوئی بھی پہچان نہیں سکتا تھا کہ وہ نامور مصور علی موسیٰ حیات ہے۔ اب تو اس کی ساری تصویریں اپنے رنگ کھو چکی تھیں۔ وہ کیسے سائرہ کو اپنی زندگی میں واپس لے کر آتا اسے تو خود اس نے اپنے ہاتھ سے موت کا راستہ دکھایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سائرہ آنکھیں کھول دے گی۔ وہ علی کی التجاؤں کو سن کر اس دنیا میں واپس لوٹ آئے گی اور تب وہ اسے بتائے گا کہ اسے سائرہ کے بغیر رہنا نہیں آتا حالانکہ اب تو وہ روزانہ ہی اس سے یہ بات کرتا تھا۔

سائرہ سے محبت تو اسے اسی دن ہو گئی تھی جب پہلی بار آرٹ اسکول کمپٹیشن میں اس نے سائرہ کو دیکھا تھا اور بے اختیار اس کے دل نے تمنا کی تھی کہ یہ لڑکی ہمیشہ کے لیے اس کی ہم سفر بن جائے، ابھی اس کا دل ایک خوشگوار سی تان پر دھڑکنا شروع ہوا تھا کہ ایک روز اس کی ملاقات سائرہ اور اس کے منگیتر ایرک سے ہو گئی تب اسے پہلی بار پتا چلا تھا کہ محبت کی پہلی چوٹ کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے اور وہ اس دن کے بعد کئی راتیں سکون سے سو نہیں پایا تھا۔ کچھ دنوں بعد اپنے کالج میں سائرہ کو ایک بار پھر اپنے سامنے

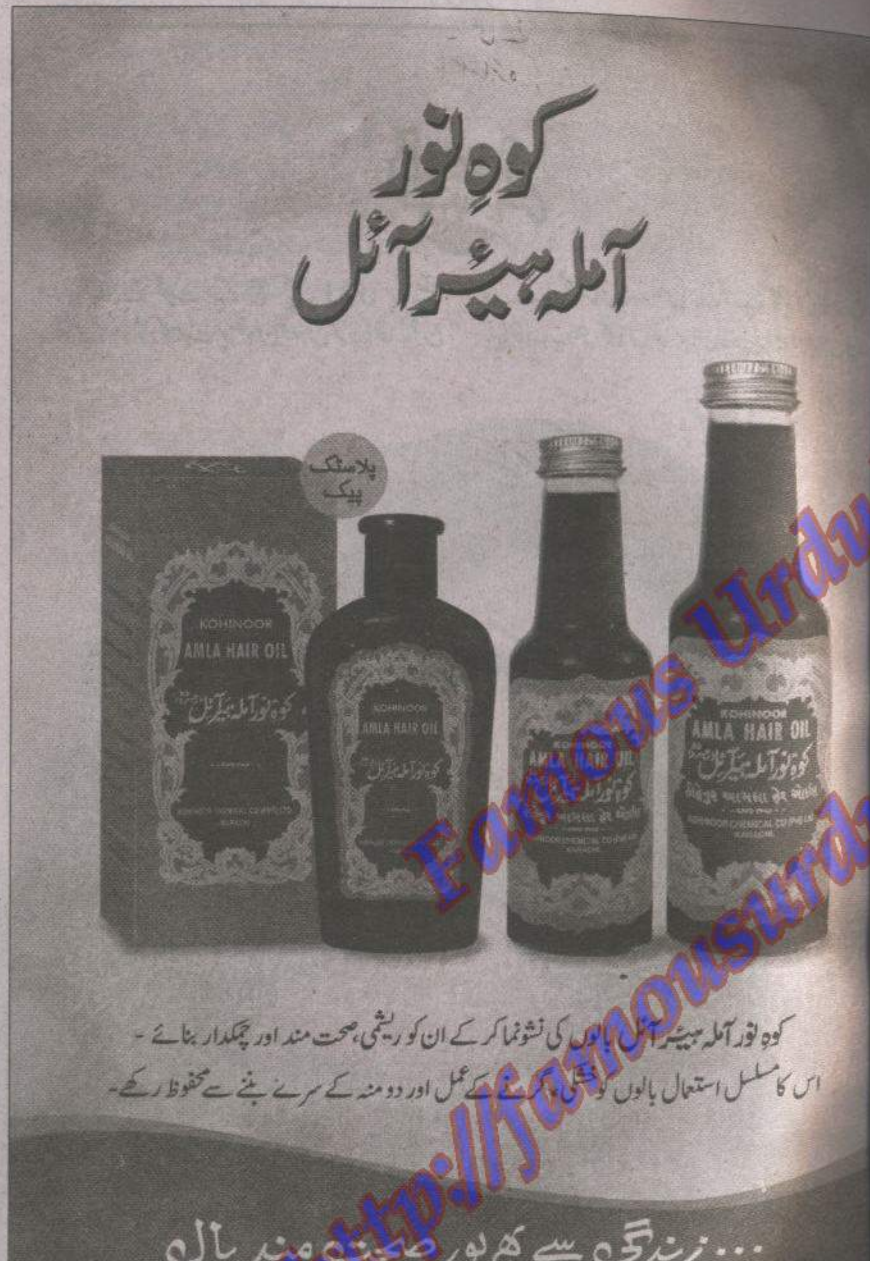
دیکھ کر اس کی آنکھوں نے پھر سے اس کے ساتھ کے سپنے دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ حالانکہ وہ جان چکا تھا کہ سائرہ عنقریب کسی اور کی دلہن بن جائے گی مگر وہ اپنے دل کو کیسے سمجھاتا جو ہر بار سائرہ کو دیکھ کر ایک خوشگوار انداز میں دھڑکنا شروع ہو جاتا، وہ اس سے دوستی کرنا چاہتا تھا، اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی، اسے تو بہت بعد میں پتا چلا کہ کیتھی کے ساتھ اسے دیکھ کر سائرہ اس سے بدظن ہوئی تھی ورنہ تو وہ کبھی بھی ہمدردی کی آڑ میں کیتھی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتا اگر سائرہ اس سے بدظن ہوئی تھی تو وہ بھی ایرک والے معاملے کو لے کو اس سے ناراض تھا۔ ایرک اس کا دوست نہیں تھا مگر آہستہ آہستہ وہ اس کا دوست بنتا چلا گیا۔ اس نے علی کو سائرہ سے مزید بدظن کیا۔ علی کے دل میں پلتی غلط فہمی کی دیواریں مزید وسیع ہوتی چلی گئیں اور وہ سائرہ کے نام سے بھی دور بھاگنے لگا۔ انہی دنوں اس کی زندگی میں کیتھی کا عمل دخل بہت زیادہ بڑھنے لگا تھا۔ وہ جو اپنے باپ کی موت کے بعد اپنی زندگی میں آنے والے کچھ بھیانک انکشافات کی زد میں تھا اور اپنی تلاش کے سفر پر نکلا تھا مگر اس سفر میں بھی سوائے آنسوؤں اور تنہائیوں کے اس کے ساتھ کچھ نہیں آیا تھا۔ ایسے میں کیتھی کی ہمدردی، تسلی اور دلاسے اس کے لیے اکسیر کا کام کرتے تھے۔ اسے لگتا تھا کہ جیسے کوئی اس کے زخموں پر مرہم رکھ رہا ہو۔ رفتہ رفتہ وہ کیتھی کا عادی ہوتا چلا گیا۔ ان دنوں اسے لگتا تھا کہ اگر کیتھی نہیں ہوگی تو وہ زندہ کیسے رہے گا۔ اس نے کیتھی سے منگنی کر لی تھی۔ اب سائرہ کے بارے میں وہ کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر سائرہ پھر بھی روزانہ ہی اس کے خوابوں میں چلی آتی تھی۔ کیتھی جس تیزی سے اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی اسی تیزی سے واپس بھی چلی گئی۔ علی نے تو اپنی اور کیتھی کی آئندہ زندگی کے حوالے سے بہت سے منصوبے بنا لیے تھے مگر کیتھی نے بہت جلد اپنی اصلیت علی پر ظاہر کر دی اور اسے بتا دیا کہ اسے صرف علی کی دولت سے محبت تھی، علی کی ذات میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کیتھی کا دیا ہوا زخم بہت گہرا تھا۔ اگر موسیٰ حیات اسے نہ ملتے تو وہ شاید اسی زخم کے زیر اثر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا مگر موسیٰ حیات سے ملنے کے بعد اسے زندگی خوب صورت لگنے لگی تھی۔ اسے احساس ہوا تھا کہ باپ کا رشتہ کیا ہوتا ہے۔ محبت تو نواز شاہ نے بھی اس سے بہت کی تھی مگر موسیٰ حیات کی محبت کے آگے اسے ان کی محبت بہت چھوٹی لگنے لگی تھی۔ اپنے باپ کے ساتھ سائرہ کی بے تکلفی دیکھ کر اسے ایک خوش گوار قسم کی حیرت ہوئی تھی مگر اپنے باپ کے ساتھ اب وہ اکیلے وقت گزارنا چاہتا تھا۔ ایسے میں وقت بے وقت سائرہ کی آمد اسے بری لگنے لگی تھی۔ سائرہ نے بھی شاید اس کے گریز کو محسوس کر لیا تھا، اس لیے اس نے اب ان کی طرف آنا بہت کم کر دیا تھا۔ وہ ابھی اپنے اس نئے رشتے کو ٹھیک طرح محسوس بھی نہیں کر پایا تھا کہ ایک روز اس کے باپ نے اس کی اور سائرہ کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ جو ابھی کیتھی کے دیئے ہوئے زخموں کو مکمل طور پر بھول نہیں پایا تھا۔ ایسے میں کسی لڑکی کے ساتھ ایک نارمل زندگی کیسے شروع کر دیتا اور وہ لڑکی بھی کوئی عام لڑکی نہیں بلکہ اس کی محبت سائرہ ہو، وہ اپنے باپ کو انکار کرنا چاہتا تھا مگر یہ بات کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں جو ننھے سے دیئے جلنے لگے تھے وہ ان کو بجھا نہیں پایا اور اس نے ان کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ سائرہ نے کیسے طریقے سے یہ پیغام اس کے باپ تک پہنچایا ہے۔ اسے سائرہ پر بہت غصہ تھا اور اسی غصے، نفرت اور انتقام کے ساتھ اس نے اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کر دیا۔ شادی کی پہلی ہی رات سے علی نے اسے شدید قسم کے ذہنی تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید وہ علی کو چھوڑ کر جا چکی ہوتی مگر

سائرہ نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی جو علی کے ہر ظلم کو ہنس کر سہہ جاتی تھی۔ وہ اس کی برداشت دیکھ کر کبھی کبھی بہت حیران رہ جاتا تھا۔ سائرہ کو اذیت دے کر وہ خود کہاں سکون سے سو پاتا تھا۔ اپنی بے سکونی کو ختم کرنے کے لیے وہ سکون آور ادویات کا استعمال کرتا، گھنٹوں گھر سے باہر رہتا مگر اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ دن رات اس کی ذات کو بے مول کرنے والا علی اکیلے میں خود کو ہزار بار لعنت ملامت کرتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ کوئی ذہنی مریض بنتا جا رہا ہے۔ اسے رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ نیند کی گولیاں بھی اسے پرسکون نیند دینے میں ناکام رہی تھیں۔ سائرہ کی اس کی زندگی میں آنے کے بعد اس پر تو جیسے کامیابیوں کے دروازے کھل گئے تھے۔ اس کی تصویریں ہاتھوں ہاتھ بکنے لگیں تھیں مگر وہ اس کامیابی کو ہمیشہ اپنی قسمت اور محنت قرار دیتا تھا۔ وہ گھر کے باہر ایک مہذب انسان تھا مگر گھر کے اندر اس کی ساری تہذیب دم توڑ جاتی تھی۔ سائرہ کو دیکھ کر اس پر ایک عجیب قسم کی وحشت سوار ہو جاتی تھی۔ اس کی اذیتوں کا سلسلہ تو ختم نہیں ہوا مگر اس کی سائرہ اب بہت خاموش رہنے لگی تھی اور پھر ایک روز جب وہ گھر سے باہر تھا اسے خبر ملی کہ سائرہ نے اپنی جان لینے کی کوشش کی ہے۔ زندگی میں پہلی بار اسے محسوس ہوا تھا کہ جیسے اس کی جان نکلی جا رہی ہو اور اسے لگتا تھا کہ اس کا پورا وجود پچھتاوے کی آگ میں جل کر ختم ہو جائے گا۔

سائرہ کے کومے میں جانے کے بعد اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ کتنی معروف آرٹسٹ ہے۔ اس کے کمرے کے اندر اور باہر ہر وقت پھولوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ پھولوں کا تحفہ دینے والے تمام لوگ اس کے پرستار تھے جو اس کی زندگی کی دعائیں مانگتے نہیں تھکتے تھے۔ علی جب اس کے پاس بیٹھا ہوتا تو اسے اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رہتا تھا۔ اس کے دل میں اور زیادہ شدت سے یہ احساس بیدار ہو جاتا تھا کہ اس نے سائرہ کو ہمیشہ اپنی نفرت اور انتقام کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ اس کے پاس بیٹھ کر روتا رہتا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر کتنی ہی بار اس سے معافیاں مانگ چکا تھا کہ ایک بار وہ آنکھیں کھول کر اس کی معافی کو قبول کر لے وہ دوبارہ کبھی بھی اسے دکھ نہیں دے گا مگر وہ آنکھیں ہی تو نہیں کھولتی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ بہت پرسکون نیند لے رہی ہے مگر علی کو اب اس کی اس طویل نیند سے شدید قسم کی الجھن ہونے لگی تھی مگر وہ بے بس تھا، اس کی اس حالت کو دیکھ کر موسیٰ حیات کا دل بھی پسیج گیا تھا۔ محمد عبداللہ کا رویہ بھی اب اس کے ساتھ بہتر ہو گیا تھا۔ ان کی زبانی سائرہ کی ایرک کے ساتھ زبردستی شادی کی باتیں سن کر وہ اپنے رویے پر مزید شرمندگی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اب ان کے ساتھ اسلامک سینٹر بھی جانے لگا تھا۔ اسے خدا سے دعا مانگنے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ محمد عبداللہ نے اسے وہ طریقہ سکھایا، خدا کے آگے اس نے کتنے ہی سجدے کر ڈالے تھے۔ اس کے سجدوں، دعاؤں اور التجاؤں کو ایک روز شرف قبولیت مل ہی گیا جب اس کے سامنے اس کی زندگی نے آنکھیں کھول دیں۔ بہار نے اپنی آمد کا اعلان کر دیا۔ خزاں کے طویل موسم نے بالآخر رخصت باندھ ہی لی تھی۔ سائرہ نے آنکھیں کھول دی تھیں اور اس کے ساتھ ہی علی کی ڈوبتی سانسوں کو قرار مل گیا اور اب کی بار اس نے سائرہ کو اس کے حصے کی خوشیاں لوٹائی تھیں۔

”آپ مجھے کتنا چاہتے ہیں؟“ علی نے اس سوال پر بے اختیار گردن گھما کر سائرہ کی طرف دیکھا جسے اسپتال سے گھر منتقل ہوئے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے اور اس وقت بستر پر دراز سائرہ نے ایک نہایت ہی عجیب سوال اس سے کر دیا تھا۔

”علی! آپ مجھے بتائیں کہ آپ مجھے کتنا چاہتے ہیں؟“ سائرہ نے دوبارہ وہی سوال کیا۔ اس کا لہجہ



انتہائی سنجیدہ تھا۔ نہ جانے وہ علی سے کیا کہلوانا چاہ رہی تھی۔

''میں تمہیں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ چاہتا ہوں سائرہ۔'' علی نے نہایت گھمبیر لہجے میں اس کو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا مگر علی کو لگا اس کے اس محبت بھرے جملے کا سائرہ پر کوئی اثر نہ ہوا ہو۔

''کوئی ثبوت!'' ایک اور سوال پوچھا گیا۔

''تمہیں کیسا ثبوت چاہیے۔'' علی نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آئیں...... میرے ساتھ چلیں۔'' سائرہ یہ کہہ کر بیڈ سے اتری اور علی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس لے آئی۔ اس کھڑکی سے روزانہ کی طرح سمندر اپنا خوب صورت نظارہ کروا رہا تھا۔

''اس کھڑکی سے نیچے سمندر میں چھلانگ......'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ علی نہایت غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اسے ماضی کے کچھ اذیت ناک لمحات یاد کروا رہی ہے مگر وہ اپنی محبت کو ثابت کرنے کے لیے کسی بھی آزمائش سے گزرنے کے لیے تیار تھا اور اگر سائرہ کو اس کے چھلانگ لگانے سے محبت کا یقین آتا ہے تو علی نے سوچ لیا تھا کہ وہ یہ بھی کر گزرے گا۔

''اس کھڑکی سے نیچے سمندر میں چھلانگ مت لگائیں بلکہ جو نیچے خوب صورت سا ریسٹورنٹ نظر آ رہا ہے، وہاں لے جا کر مجھے اچھا سا کھانا کھلائیں۔'' اتنا کہہ کر وہ مسکرا کر علی کی طرف دیکھنے لگی۔

علی کو اس کی مسکراہٹ دیکھ کر یوں لگا کہ جیسے پوری کائنات مسکرا رہی ہو۔ سڈنی کے ساحل سمندر کے قریب اس ویران گھر میں بھی بالآخر بہاروں نے دستک دے ہی دی تھی اور وہ بھی محبت کی انوکھی خوشبوؤں سے مہکنے لگا تھا۔

میرے دل میرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا

☆......☆

علی اور سائرہ کے درمیان تلخیوں کا خاتمہ کیا ہوا، موسیٰ حیات کی زندگی میں بھی سکون کے پل لوٹ آئے تھے۔ وہ اب مستقل طور پر کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ ہاں البتہ اپنے بیٹے اور بہو سے ملنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ محمد عبداللہ کی تبلیغ کا سفر جاری و ساری تھا۔ ان کے استادِ محترم ان پر جو ذمہ داری لگاتے تھے وہ اسے احسن طور پر نبھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنی بیٹی کو خوش دیکھ کر انہیں لگتا تھا کہ اب انہیں کوئی غم نہیں ہے۔ زندگی میں ایک طویل سفر کے بعد ان مسافروں کو ستانے کا موقع مل گیا تھا مگر کون جانے کسی مسافر پر پھر کوئی آزمائش آ جاتی اور وہ ایک نئے سفر پر نکل پڑتا اور پھر ایک نئی کہانی کسی مسافر کا انتظار کر رہی ہوتی۔ زندگی نے ان سب کو آزمائشوں کے طویل سفر کے بعد سکون کی چھاؤں میں لا بٹھایا تھا اور وہ سب پُرامید تھے کہ آنے والے پل بھی اتنے ہی خوب صورت ہوں گے۔ کیوں کہ وہ سب محبت کی ڈور سے بندھے تھے اور انہیں یقین تھا کہ اب یہ ڈور کبھی نہیں ٹوٹے گی۔

......☆ختم شد☆......

ناولٹ

فیصلہ

لہلاتے کھیت کے بیچ پگ ڈنڈی پر چلتے ہوئے وہ خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ آج پورے پانچ سال بعد اس نے اپنے گاؤں کا رخ کیا تھا۔ یہ وہی گاؤں تھا جہاں وہ پیدا ہوا جہاں وہ بڑا ہوا وہ اپنی ہی دھن میں چلتا جا رہا تھا۔ اس کو آج بھی اس کے گلی کوچے نہیں بھولے تھے۔ آخر بھولتا بھی کیوں اس کا سب کچھ تو یہیں تھا۔ جیسے جیسے حویلی قریب آ رہی تھی ویسے ویسے اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں اس کے خیال میں سب اسے معاف کر دیں گے مگر کیا وہ اسے معاف کرے گی جس کے لیے وہ آج لوٹ آیا تھا۔

☆......☆

''بس کر دو مہرو نہ کرو اس قدر ماتم اپنی قسمت پر تقدیر میں جو لکھا ہے وہ تو ہونا ہی ہے نہ کرو خود کو اس قدر ہلکان اس قدر رو رو کر۔'' شہر بانو اور ماہ رخ کب سے اس کو بس یہی سمجھا رہی تھیں اور مہرو تو جیسے عقل و خرد سے بے گانہ ہو چکی تھی کچھ سمجھ ہی نہیں رہی تھی اس کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے بس اب اس کو رونا ہے اور صرف رونا ہے۔

''کیسے نہ روؤں میرے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ کیا کسی کو نظر نہیں آ رہا، کیا دادا سائیں کو کوئی نہیں





روک سکتا کب تک وہ ہمیں اپنے غلط فیصلے کے بھینٹ چڑھاتے رہیں گے۔'' مہرو جیسے پھٹ پڑی تھی۔

''نہ میری دھی یہ غلط فیصلہ نہیں یہ تیری ادھی کی زندگی کا سوال ہے۔'' اماں سائیں نہ جانے کب سے دروازے پر کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھیں اس کی آخری بات سن کر اندر آ کر اس کو سمجھانے لگیں۔

''اماں سائیں اس حویلی میں وہی ہوتا ہے جو اس حویلی کے مرد چاہتے ہیں۔ یہاں کی عورتوں کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہے اماں سائیں آپ ہماری بڑی ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں سب کچھ پھر کیوں ہو رہا ہے ایسا میرے ساتھ یہ کہتے ہوئے وہ اماں سائیں کے قدموں میں بیٹھتی چلی گئی۔

''میری دھی میں بے بس ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اماں سائیں کمرے سے چلی گئیں۔

''دیکھو مہرو اگر بھائی نے واپس آنا ہوتا تو وہ جاتے ہی کیوں اور جانے والے تو کبھی لوٹ کر آتے ہی نہیں ہیں۔'' ماہ رخ اس کو سمجھانے لگی کیوں کہ وہ بھی اس مقام سے گزری تھی جہاں پر آج مہرو کھڑی تھی شاہ ویز بھی اس کے ساتھ وعدہ وفا کر کے گیا تھا اور لوٹ کر نہیں آیا اور بالآخر دادا سائیں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ اس کی شادی شاہ میران سے کر دی جائے۔

''دیکھو مہرو میری بہن شاہ سکندر تجھے چاہتا ہے تجھے خوش رکھے گا وہ۔'' شہر بانو اس کے گال پر پھیلے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''نہیں ادھی اس کی آنکھوں میں سوائے حرص و ہوس کے کچھ بھی نہیں ہے ادھی میں مر جاؤں گی مگر اس رشتے کو قبول ہرگز نہیں کروں گی۔'' مہرو ایک دفعہ پھر پھوٹ کر رو دی۔

☆......☆

''شاہ سائیں شاہ سائیں! خوش خبری سائیں۔'' اللہ رکھا ہانپتا کانپتا اوطاق میں ہی آ گیا جہاں حویلی کے سب ہی مرد بیٹھے ہوئے تھے۔

''کیا بات ہے اللہ رکھا اس قدر ہانپ کیوں رہا ہے تو۔'' دادا سائیں نے اس سے گرج کر پوچھا۔

''وہ سائیں باہر شاہ سوار سائیں آئے ہیں۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑتے ہوئے کہا۔

اس کا یہ کہنا تھا کہ گویا اوطاق میں بھونچال آ گیا۔

''یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟ اللہ رکھا۔'' شاہ سائیں کو شاہ سوار کا نام سن کر ایک دم غصہ آ گیا۔

''شاہ سائیں میری گناہ گار آنکھوں نے شاہ سوار سائیں کو حویلی کے باہر دیکھا ہے۔'' اللہ رکھا نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''تم سچ کہہ رہے ہو ناں اللہ رکھا میرا شاہ سوار آیا ہے باہر۔'' شاہ زاوار کو یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''جی سائیں بالکل سچ۔'' اللہ رکھا نے جواب دیا۔

''شاہ زاوار یہ سن کر باہر کی جانب جانے لگے تو شاہ سائیں کی آواز پر انہیں رکنا پڑا۔

شاہ زاوار ہم نے اسے اس حویلی سے ہی نہیں بلکہ اپنی زندگیوں سے بھی نکال دیا ہے اس لیے اسے حویلی کے اندر بلانے کی ہرگز کوشش نہیں کرنا اس نے اور شاہ ویز نے ہمیں بہت دکھ دیے ہیں۔'' دادا سائیں نے گرج دار آواز میں کہا۔

''مگر بابا سائیں میرا بیٹا ہے وہ۔ وہ یہی کہہ کر گیا تھا کہ وہ لوٹ کر آئے گا کیسے اسے ہم اپنی زندگی سے نکال سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر شاہ زاوار نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے تھے۔

''ٹھہرو شاہ زاوار تم نے سنا نہیں بابا سائیں نے کیا کہا ہے۔'' اب کے شاہ نواز نے انہیں روکنا چاہا۔

وہ اس حویلی کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ ہم اسے اپنی زندگی سے نہیں نکال سکتے میرے جگر کا ٹکڑا ہے وہ۔'' شاہ زاوار نے اپنے بھائی کے سامنے سخت لہجے میں مگر نظریں نیچی رکھ کر جواب دیا۔

''شاہ زاوار تم بھول رہے ہو شاید اس نے ہماری حکم عدولی کی ہے اور جو ہمارے حکم کو نہیں مانتے ہم اسے اپنی نظروں میں برداشت نہیں کرتے۔'' شاہ زاوار کی بات پر دادا سائیں کا غصہ ساتوں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔

''ہم نے آپ کی حکم عدولی نہیں کی دادا سائیں بلکہ اپنا حق مانگا تھا آپ سے۔'' شاہ سوار نہ جانے کب سے اوطاق کے دروازے پر کھڑا تھا بالآخر اندر آتے ہوئے بولا۔

''تمہیں حویلی کے اندر گھسنے کی اجازت کس نے دی اس حویلی کے دروازے تم نے اپنے لیے خود بند کیے تھے۔'' دادا سائیں اس کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئے تھے۔

''نہیں دادا سائیں اس حویلی سے ہمارا بھی اسی طرح رشتہ جڑا ہے جیسے باقی سب کا بس میں نے اور شاہ ویز نے حصول علم کے لیے جو قدم اٹھائے تھے شاید اس کا طریقہ غلط تھا۔'' شاہ سوار یہ کہتے ہوئے دادا سائیں کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''حصول علم نہیں لڑکے انگریزی تعلیم کہو جس سے ہمیں سخت نفرت ہے۔'' دادا سائیں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

''آپ کو انگریزی تعلیم سے نہیں بلکہ شاید آپ کو علم سے ہی نفرت ہے۔'' وہ یہ صرف سوچ سکا تھا مگر بولا کچھ نہیں۔

''معاف کر دیجیے دادا سائیں اب آ گیا ہوں ناں آپ کے سب حکم مانوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے دادا سائیں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''معاف کر دیجیے ناں بابا سائیں وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔'' شاہ بختیار جو کب سے ہونے والی اس کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔ باپ کے سامنے آ کر بھتیجے کی وکالت کرنے لگے۔ یوں تو شاہ ویز کے دیے ہوئے زخم ابھی ان کے دل میں تازہ تھے مگر اس حویلی کے ایک اور بیٹے کو شاید وہ کھونا نہیں چاہتے تھے وہ کیا بلکہ کوئی بھی نہیں۔ دادا سائیں کہتے تھے سب ہی لڑکے اس حویلی کے مان ہیں تو کون اپنا مان کھونا چاہے گا۔

''تم لوگ بھی ناں بہت دکھ دیتے ہو اور ہمیں بھی نہ چاہتے ہوئے معاف کرنا پڑتا ہے۔'' یہ کہہ کر دادا سائیں نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''اللہ وسائی اللہ وسائی! شاہ زاوار نے حویلی کی سب سے بڑی نوکرانی کو آواز دی۔

''جی سائیں حکم!'' اللہ وسائی، شاہ زاوار کی آواز پر بھاگی دوڑی چلی آئی۔

جاؤ اندر جا کر سب کو بتاؤ شاہ سوار آیا ہے۔'' شاہ زاوار نے بیٹے کو سینے سے لگاتے ہوئے اسے حویلی کے اندر اطلاع دینے کو کہا۔

''بابا سائیں یہ تیاری کیسی ہے حویلی میں کسی کی شادی ہے کیا؟'' حویلی میں ہوتی چہل پہل کو دیکھ کر پوچھا تھا۔

''ہاں شادی ہے مہرو کی۔'' شاہ زاوار نے اپنے لخت جگر سے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا جسے سن کر شاہ سوار کے دل کو ایک دم کچھ ہوا تھا۔

☆......☆

شاہ امان اپنے بھائیوں اللہ داد اور میر داد کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے جہاں ان کے باپ دادا کی بہت بڑی حویلی تھی ان کے والد نے انتقال کے وقت شاہ امان کو

یہی گدی نشینی کا فرض سونپا تھا۔

شاہ امان مزاجاً ایک سخت گیر انسان تھے جو صرف اپنے بارے میں سوچتے تھے۔ کسی اور کا ان کو خیال ہی نہ تھا جس کی وجہ سے ان کے بھائیوں نے بہت ہی جلد ان کا ساتھ چھوڑ دیا مگر پھر بھی بھائی ہونے کے ناطے ملنے آتے رہتے تھے۔

اللہ داد اور میر داد طبیعتاً نرم مزاج واقع ہوئے تھے۔ وہ گاؤں والوں کا خیال رکھتے تھے۔ جب کہ شاہ امان کو اس چیز سے کوئی غرض نہیں تھی کہ کون کیسے جی رہا ہے۔

شاہ امان کے تین بیٹے تھے۔ شاہ نواز، شاہ بختیار اور شاہ زاوار جب کہ ایک بیٹی مہر النساء تھی۔

شاہ امان بھی انہی میں سے ایک مرد تھے جو بیٹوں کو بیٹیوں پر فوقیت دیتے تھے۔

اللہ داد کی تین اولادیں تھیں۔ ایک بیٹا شاہ زمان اور دو بیٹی زہرہ بیگم اور زینت بی بی جب کہ میر داد کی دو اولادیں تھیں۔ ایک بیٹی آمنہ بی بی اور بیٹا شاہ داور۔

شاہ امان کی حویلی میں تعلیم کا کوئی رواج نہ تھا۔ یہاں کی بیٹی ہی نہیں بلکہ بیٹے بھی اس زیور سے محروم تھے وہ کہتے تھے کہ تعلیم سے انسان میں شعور پیدا ہوتا ہے اگر لوگ پڑھے لکھے ہوں گے تو ان کے سامنے آواز اٹھائیں گے جو ان کو بالکل بھی گوارہ نہ تھی۔

حویلی میں ہی نہیں بلکہ پورے گاؤں میں شاہ امان کی دہشت پھیلی ہوئی تھی گاؤں والے ان کو ادب سے شاہ سائیں کہہ کر بلاتے تھے۔

جب ان کے بچے بڑے ہوئے تو انہوں نے ان کی خوب دھوم دھام سے شادی کروادی۔

شاہ نواز کی شادی زہرہ بیگم سے ہوئی۔ شاہ بختیار کی شادی آمنہ بی بی سے ہوئی اور شاہ زاوار کی شادی زینت بی بی سے ہوئی۔

شاہ نواز کو شادی کے بعد اللہ نے دو بیٹوں شاہ سجاول اور شان میران اور بیٹیوں شہر بانو اور مہرو بانو سے نوازا۔

شاہ بختیار کی تین اولادیں تھیں۔ شاہ ویز، گل افشاں اور شاہ سانول۔ جب کہ شاہ زاوار کی بھی تین ہی اولادیں تھیں۔ شاہ میر، ماہ رخ، شاہ سوار۔

شاہ امان نے بیٹوں کی تو شادی کردی مگر بیٹی کو نظر انداز کر دیا تھا انہی دنوں ان کا بھتیجا شاہ داور اپنی بہن امینہ بی بی سے ملنے اکثر حویلی آتا تھا۔ اس نے مہر النساء کو دیکھا اور اسے اپنا دل دے بیٹھا یہ سوچے بنا کہ اس کا انجام بہت برا ہوگا۔

جب اس بات کا علم بے جی کو ہوا تو انہوں نے اپنی بیٹی کو سمجھایا مگر وہ بھی کیا کرتی۔ محبت جب ہوتی ہے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کہاں رہتی ہے۔ اس میں یا تو انسان ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے یا پھر مکمل ہو جاتا ہے اور جو ٹوٹتے ہیں اور نہ مکمل ہوتے ہیں وہ فنا ہو جاتے ہیں۔

اور مہر النساء شاہ داور کے عشق میں پور پور ڈوبتی چلی گئی لیکن جب اس کا علم شاہ امان کو ہوا تو گویا حویلی میں قیامت برپا ہو گئی۔ بیٹی تو انہیں پہلے ہی پسند نہ تھی سو انہوں نے اسے حویلی کے تہ خانے میں بند کروا دیا اور ایک رات اللہ وسائی جب کھانا دینے تہ خانے میں گئی تو وہاں مہر النساء مردہ حالت میں پڑی تھی اس نے خواب آور گولیوں سے خود کو ختم کرلیا تھا۔ مہر النساء، شاہ داور کی محبت میں فنا ہو گئی تھی۔

مگر شاہ امان کو اس کا نہ کوئی دکھ ہوا نہ ملال البتہ بے جی یہ صدمہ برداشت نہ کرسکیں اور وہ بیٹی کی جدائی میں ہمیشہ کے لیے اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

اس واقعے کو پندرہ برس بیت گئے تھے کوئی بھی اس واقعے کو ذہن سے نہیں نکال سکا تھا۔ مہرو کے ذہن میں بھی ہلکے ہلکے نقوش موجود تھے۔

جب یہ واقعہ پیش آیا تب مہرو کی عمر سات سال تھی۔ جب کہ شاہ سوار نو سال کا تھا۔

شاہ امان نے اپنے بیٹوں کو علم کے نور سے محروم رکھا تھا مگر چاہتے تھے کہ ان کے پوتے کم از کم دس جماعتیں ہی پاس کرلیں بے جی جب تک زندہ رہیں حویلی کے سب بچوں کو قرآن شریف پڑھاتی رہیں۔

جیسے جیسے بچے بڑے ہوتے گئے ویسے وہ شعور کی منزلیں طے کرتے گئے ماہ رخ اور شاہ ویز ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ شاہ سوار اور مہرو بھی ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے اور ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھانے لگے یہ سوچے بنا کہ اس حویلی میں محبت کرنا ایک جرم ہے اور اس کی سزا موت ہے مگر یہ محبت کے پروانے انجام سے بے خبر منزل کو پانے کی جستجو کرنے لگے۔

شاہ سوار اور شاہ ویز کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ وہ اسکول سے آکر نہ صرف خود پڑھتے بلکہ گل افشاں، ماہ رخ، شہر بانو اور مہرو کو بھی چھپ کر دادا سائیں سے پڑھادیا کرتے تھے۔ وہ دونوں فیصلہ کر چکے تھے دسویں پاس کرنے کے بعد وہ شہر جائیں گے مزید پڑھائی کے لیے۔

شاہ ویز ان دنوں میٹرک پاس کر چکا تھا۔ جب کہ شاہ سوار ابھی نویں جماعت میں تھا شاہ ویز نے دادا سائیں سے کالج میں داخلے کی بات کی تو انہوں نے صاف لفظوں میں منع کر دیا مگر انسان بھی کیا کرے جب کسی چیز کا شوق چڑھ جائے تو پھر کہاں وہ کسی کی سنتا ہے اور یہ تو بات ہی تھی علم کی پھر شاہ ویز نے کہاں رکنا تھا۔ سو ایک دن وہ بنا کسی کو بتائے گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ماہ رخ کے دن انتظار میں گزرنے لگے اور اس کے ایک سال بعد ہی شاہ سوار بھی شاہ اماں کے سامنے دستِ سوالی بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''تمہیں بھی ہماری اجازت کی کیا ضرورت ہے تم بھی نکل جاتے شاہ ویز کی طرح کسی دن بن بتائے۔'' دادا سائیں شاہ سوار کی بات سن کر خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بولے تھے۔

''نہیں دادا سائیں آپ اجازت دیجیے میں آپ کی اجازت سے جانا چاہتا ہوں۔'' اس نے التجائیہ لہجے میں کہا اور دادا سائیں کو خاموش پاکر ایک دفعہ پھر بولا۔

''دادا سائیں علم حاصل کرنا ہمارا شوق بھی ہے اور ہماری ضرورت بھی ہے اب جس دور میں ہم جی رہے ہیں وہاں ہم ایک ہی جگہ پر نہیں رک سکتے ہمیں اس حویلی سے باہر نکل کر دنیا کو دیکھنے دیجیے۔''

''واہ لڑکے واہ ابھی تو تم گئے بھی نہیں ہمیں تو ابھی سے سبق دینے لگے۔'' دادا سائیں اس پر طنز کرتے ہوئے بولے تھے۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی یہیں پر رہ کر اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر زمینیں دیکھو کیوں کہ یہ سب تم لوگوں کا ہی تو ہے پھر ہم تم سب کی خوب دھوم دھام سے شادی کروائیں گے۔'' دادا سائیں اس کو خاموش پاکر محبت سے بولے تھے۔

''معاف کیجیے گا دادا سائیں میں ابھی سے ان زمینوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ پہلے میں پڑھوں گا پھر آکر اسے بھی دیکھ لوں گا۔'' وہ بھی آخر انہی کا پوتا تھا اپنی بات پر بضد رہا۔

''ٹھیک ہے چلے جاؤ تم بھی دو کے چلے جانے سے ہماری حویلی ویران نہیں ہو جائے گی۔ مگر یاد رکھو اس حویلی میں دوبارہ قدم رکھنے کی ضرورت

نہیں ہے تمہیں بھی اور اسے بھی۔" یہ کہہ کر وہ رکے نہیں تھے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

"بیٹا تمہارے دادا سائیں جو کہہ رہے ہیں اس کو مانو۔" شاہ زاوار بیٹے کو جانے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ کر بولے تھے۔

"بابا سائیں آپ بھی! آپ تو ایسا نہ کہیں میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے آپ سب۔" شاہ سوار باپ کے سامنے التجائیہ لہجے میں بول رہا تھا۔

"تم جانتے ہو تمہارے اس فیصلے سے مہرو پر کیا اثر پڑے گا۔ ادھر میں ماہ رخ کے لیے الگ پریشان ہوں۔ شاہ ویز نے شاید کبھی نہ آنے کی قسم کھا لی ہے کتنی زندگیاں برباد کرو گے تم لوگ آخر۔" شاہ زاوار جانتے تھے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور ان کے دل کی بھی یہی خواہش تھی کہ مہرو کی شادی شاہ سوار سے ہو اور ماہ رخ کی شاہ ویز سے مگر یہاں تو شاید قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

"بابا سائیں کچھ نہیں ہو گا میں واپس ضرور آؤں گا۔ تعلیم مکمل کر کے اور شاہ ویز بھی ضرور آئے گا دیکھ لیجیے گا آپ۔" وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے مگر کہیں دیر نہ ہو جائے میرے لخت جگر یاد رکھنا مہرو کی آنکھوں میں تمہاری محبت کے عکس دیکھے ہیں میں نے کہیں ماہ رخ کی طرح اسے بھی انتظار کی سولی پر نہ چڑھا دینا۔" شاہ زاوار بیٹے کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لیتے ہوئے بولے تھے۔

زینت بی بی کو کوئی اعتراض نہ تھا مگر بیٹے کی جدائی سے افسردہ ضرور ہو گئیں تھیں آخر کو خاندان بھر میں چھوٹا بیٹا تھا وہ۔ اور پھر تیار ہو کر وہ آنے کا کہہ کر چلایا مگر جاتے ہوئے مہرو سے ضرور ملا تھا۔

مہرو نے جب سے اس کے جانے کا سنا تھا اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ شاہ سوار کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا اس کو کیسے حوصلہ دے۔

"کیا حال بنا لیا ہے تم نے اپنا مہرو۔ میں ساری زندگی کے لیے تو نہیں جا رہا سنبھالو خود کو۔" وہ خود مہرو کی حالت سے پریشان ہو گیا تھا۔

"کیسے سنبھالوں خود کو اگر تم بھی بھائی شاہ ویز کی طرح لوٹ کر نہ آئے تو جانتے بھی ہو کہ کیا ہو گا۔" وہ آنے والے دنوں سے شاید کچھ زیادہ ہی خوف زدہ تھی۔

"ارے پگلی، شاہ ویز تعلیم مکمل کر کے آئے گا اور میں بھی اور دیکھنا تمہیں بھی اس حویلی سے دور بہت دور لے جاؤں گا۔" وہ اس کے ہاتھوں کو تھامے محبت سے کہہ رہا تھا۔

"سچ کہہ رہے ہو ناں تم۔" مہرو بے یقینی سے بولی تھی۔

"ہاں بالکل سچ۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بول رہا تھا۔

اور وہ چلا گیا۔ کتنے ہی ماہ و سال گزر گئے ان کے بغیر زندگی ہی بے رونق لگ رہی تھی سب کو دادا سائیں نے شاہ ویز کی طرح شاہ سوار سے بھی کوئی رابطہ نہ رکھنے دیا۔ ان چند سالوں میں بہت کچھ بدل گیا۔

شاہ زمان کے تین بچے تھے ایک بیٹی زیب النساء اور دو بیٹے شاہ داد اور شاہ سکندر۔

جب کہ شاہ داور نے مہر النساء کے بعد کسی سے شادی ہی نہ کی۔

دادا سائیں نے فیصلہ کیا کہ شہر بانو اور زیب النساء کی شادی وٹے سٹے میں کر دی جائے سو اس فیصلے کے مطابق شاہ سجاول کے لیے زیب النساء کو بیاہ کر لے آئے اور شہر بانو کی شادی شاہ داد سے ہو گئی شاہ سکندر بھی مہرو سے شادی کا خواہش مند تھا

مگر شاہ نواز نے اتنی جلدی اپنی بیٹی کی شادی سے انکار کر دیا شاہ مہران کی شادی ماہ رخ کی ہزار دہائی دینے کے باوجود اس سے ہو گئی جب کہ گل افشاں کی نسبت شاہ مہر سے جوڑ دی گئی سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا مگر پھر بھی سب کے دلوں میں کہیں نہ کہیں خلش باقی رہ گئی تھیں۔

پھر ایک دن شاہ زمان اپنے بیٹے شاہ سکندر کے لیے مہرو کا ہاتھ مانگنے آ گئے تھے۔ اپنے تایا سائیں کے سامنے جسے سن کر اماں سائیں (زہرہ بیگم) کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں اگر شاہ سکندر بھتیجا تھا ان کا تو شاہ سوار بھانجا۔ ان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا مگر ان کا دل کہیں سے نہیں مان رہا تھا کہ وہ شاہ سکندر کے حق میں فیصلہ دیں کیوں کہ وہ ایک اوباش قسم کا آدمی تھا۔ عیاش پسند جسے عورتوں کی عزت کا ذرا پاس نہ تھا۔ سو زہرہ بیگم کیسے اپنی پھول سی بچی کو اندھیرے کنویں میں دھکیل دیتیں مگر انہیں اس کے مستقبل کی شدید فکر تھی کہ اگر شاہ سوار نہ آیا تو کیا ہو گا۔

"تایا سائیں میرا سکندر اتنا برا نہیں ہے بس ذرا بگڑ گیا ہے مگر دیکھ لیجیے گا شادی ہو گئی ناں اس کی وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔" شاہ زمان اپنے تایا کے سامنے اصل مدعا بیان کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

"ہاں! میرا پوتا مہرو کو رانی بنا کر رکھے گا۔" اللہ داد بھی اپنے آوارہ پوتے کی وکالت میں بول رہے تھے۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے مگر ابھی اس حویلی میں ایک لڑکا موجود ہے ہم چاہتے ہیں کہ مہرو کی شادی اس سے ہو۔" دادا سائیں کا اشارہ شاہ سجاول کی طرف تھا۔

"ہاں یہ تو ہم جانتے ہیں تایا سائیں مگر ہم اپنے سکندر کے لیے بہت امید لے کر آپ کے پاس آئے ہیں سکندر مہرو کو خوش رکھے گا تایا سائیں۔" شاہ زمان کسی بھی طرح اپنے تایا کے منہ سے انکار نہیں سننا چاہتے تھے۔ اسی لیے ایک بات بار بار دہرا رہے تھے۔

"دیکھو چاچا اللہ داد اور بھائی زمان میں اپنی بیٹی کو حویلی سے باہر نہیں بیاہنا چاہتا ابھی اس حویلی میں لڑکے موجود ہیں اس لیے۔" ابھی شاہ نواز نے بھی باتوں میں حصہ لیا ہی تھا کہ شاہ زمان بیچ میں بول پڑے۔

"ارے کن لڑکوں کی بات کرتے ہو تم وہ جو باہر جا کر بیٹھے ہوئے ہیں ان کے آنے کی امید لے کر بیٹھے ہوئے ہو تم اور یہ کیا تم نے حویلی کی بات کی ہم کیا حویلی سے باہر رہتے ہیں یا ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں ہے حویلی سے۔" شاہ زمان غصے میں بولتے ہوئے کھڑے ہو گئے تھے۔

"بس کرو تم لوگ کیا بچوں کی طرح لڑ رہے ہو اللہ داد سمجھاؤ شاہ زمان کو اس طرح کے مسئلے لڑائی جھگڑوں سے حل نہیں ہوتے۔" دادا سائیں نے دونوں کو چپ کرواتے ہوئے کہا تھا۔

"مسئلہ! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے اس کو تو مسئلہ آپ لوگ بنا رہے ہو بس فیصلہ ہو گیا مہرو ہماری ہی بہو بنے گی ورنہ...... شاہ زمان اپنی بات پر بضد تھا جبھی بات کو ادھوری چھوڑ کر سب کی طرف دیکھنے لگے۔

"ورنہ کیا؟ کیا کرو گے تم؟" شاہ زمان کی بات پر شاہ نواز اور شاہ زاوار ایک ساتھ بولے تھے۔

"ورنہ یہ کہ ہم یہ رشتہ ابھی اور اسی وقت ختم کر دیں گے میں زیب النساء کو لے جاؤں گا اور شہر بانو کو ہمیشہ کے لیے اس گھر میں بٹھا کے رکھ لینا تم لوگ۔" یہ کہہ کر شاہ زمان جانے کے لیے اٹھ

کھڑے ہوئے تھے جب کہ اللہ داد انہیں روکتے رہ گئے کہ فیصلے اتنی جلد بازی میں نہیں کرنے چاہئیں۔

''دیکھو شاہ زمان ایک لڑکی کے لیے تم دو دو زندگیاں تباہ نہیں کر سکتے شاہ سکندر کو پہلے اس قابل بناؤ کہ وہ ایک اچھی زندگی گزار سکے۔'' شاہ امان بھتیجے کے فیصلے سے خوف زدہ ہو گئے تھے اور پھر ایک دفعہ سب کو خاموش پا کر بولے۔

''ہمیں سوچنے کا وقت دو ہم تمہیں اپنا فیصلہ بعد میں بتائیں گے۔''

اور پھر وہی ہوا جس کا سب کو ڈر تھا سب کے منع کرنے کے باوجود دادا سائیں کا فیصلہ شاہ سکندر کے حق میں ہی ہوا۔

''بابا سائیں آپ کو سکندر کے حق میں فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ جانتے ہیں اسے اچھی طرح کس قدر آوارہ مزاج ہے وہ میری بیٹی کو برباد کر دے گا۔'' شاہ نواز کو اپنی مہرو بہت عزیز تھی جبھی ان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

''اس کے حق میں فیصلہ نہ کروں تو اور کیا کروں اس ایک لڑکی کی وجہ سے دو گھر برباد کر دوں۔ شاہ نواز مت بھولو کہ شاہ سجاول اور شہربانو تمہاری ہی اولاد ہیں۔ اگر وہ برباد ہو گئے تو اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔'' دادا سائیں نے شاہ نواز کو قائل کرنے کے لیے باقی دو بچوں کا حوالہ دیا تھا۔

''ہاں شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بابا سائیں! ٹھیک ہے آپ چاچا اللہ داد اور شاہ زمان کو پیغام بھجوا دیجئے۔'' اور بالآخر دادا سائیں شاہ نواز کو منانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اور آج جب شاہ سوار لوٹ کر آیا تھا جس کے لیے وہ تو بہت دور جا رہی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ محض اتفاق تھا کہ شادی کی تاریخ بھی اسی دن رکھی گئی جس دن اس نے آنا تھا اور کس کو خبر تھی کہ وہ بھی آئے گا اور اس کے ساتھ ایک خاموش طوفان بھی آ جائے گا اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے جائے گا۔

☆......☆

اللہ وسائی نے زنان خانے میں جا کر شاہ سوار کی آمد کی اطلاع دی تو ڈھولک پر بجتے ہوئے گل افشاں کے ہاتھ یک دم رکے تھے ماہ رخ جو پھولوں کی تھال لیے ڈھولک بجانے والی لڑکیوں کی طرف آ رہی تھی اس خبر کو سن کر سناٹے میں آ گئی۔ زینت بی بی کی خوشی کا کہیں کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ خوش تو اماں سائیں بھی بہت تھیں مگر بیٹی کی طرف سے سخت پریشان ہو گئی تھیں۔

''تجھے پتہ ہے مہرو بھاء واپس آ گیا ہے۔'' گل افشاں اور ماہ رخ نظر بچا کر اماں سائیں سے مہرو کے کمرے تک گئیں تھیں اور جو خبر مہرو کو سنائی تھی اس سے مہرو کا انگ انگ خوشی سے جھوم گیا تھا۔

''کیا تم ٹھیک کہہ رہی ہو؟ میں نے کہا تھا ناں شاہ سوار ضرور آئے گا اور دیکھا وہ آ گیا۔ مجھے اس سے ملنا ہے۔'' یہ کہہ کر جیسے ہی وہ باہر نکلنے لگی اماں سائیں اس کے کمرے میں آ گئیں۔

''گل اور ماہ رخ جاؤ باہر کی تیاری دیکھو تم دونوں۔'' یہ کہہ کر اماں سائیں نے ان دونوں کو جانے کو کہا۔

''اماں سائیں! مجھے ایک دفعہ اس سے ملنے دیں صرف ایک بار اس سے ملنے دیں۔'' اس سے پہلے کہ اماں سائیں کچھ کہتیں مہرو ان کے سامنے شاہ سوار سے ملنے کی ضد کرنے لگی۔

''پاگل ہو گئی ہے تو مہرو کل تیرا شاہ سکندر کے ساتھ نکاح ہے اور تو شاہ سوار سے ملنے کو بے تاب ہو رہی ہے۔'' اماں سائیں نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

''اماں سائیں میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں مجھے صرف ایک بار اس سے ملنے دیں۔'' اس نے باقاعدہ اماں سائیں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

''بس کر مہرو، ضد نہ کر تو جو میرے بس میں نہیں مت مانگ مجھ سے وہ۔'' اماں سائیں اس کے سامنے بے بس تھیں۔

''بڑے دادا سائیں کو پتہ چلے گا تو تو بھی نہیں بچے گی اور میں بھی......'' ابھی اماں سائیں کی بات ادھوری تھی مہرو بیچ میں بول پڑی پھر تو ایسی زندگی جینے سے بہتر ہے میں مر ہی جاؤں میں نہیں رہ سکتی اس کے بغیر۔'' وہ ہچکیوں میں رو رہی تھی۔

''بس کر بے حیا بے شرم۔'' یہ کہہ کر زوردار تھپڑ اماں سائیں نے اس کے منہ پر جڑ دیا۔

''تیرے دادا سائیں تک یہ باتیں پہنچ گئیں تو تجھے زندہ زمین میں گاڑ دیں گے۔'' یہ کہہ کر اماں سائیں رکی نہیں تھیں اور جاتے جاتے دروازہ باہر سے لاک کر گئیں تھیں تا کہ صبح تک مہرو باہر نہ آ سکے اور اندر مہرو چیختی رہ گئی مگر اس کی یہ چیخ و پکار سننے والا سوائے کمرے کے در و دیوار کے کوئی نہ تھا تب مہرو نے ایک فیصلہ کیا اور اس فیصلے پر عمل کرنے کے لیے وہ اپنے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھی تھی۔

☆......☆

''یہ سب کیا ہو رہا ہے اماں سائیں کچھ دن اور انتظار کر لیتے تو کیا ہو جاتا۔'' وہ زینت بی بی کے قدموں میں بیٹھا ان سے شکوہ کر رہا تھا۔

''مجھے معاف کر دے میرے پتر میں تیرے لیے کچھ نہ کر سکی۔'' زینت بی بی اپنے بیٹے سے شاید کچھ زیادہ ہی شرمندہ تھیں۔

''دیکھ پتر جو قسمت میں لکھا ہو وہی ہوتا ہے شاید تیرے اور مہرو کی قسمت میں بھی یہی لکھا تھا۔'' اماں سائیں شاہ سوار کو دلاسا دیتے ہوئے بول رہی تھیں۔

''ہاں شاید جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہی ہوتا ہے ماہ رخ کے قسمت میں بھی یہی تھا شاویز کی قسمت میں بھی یہی تھا۔ اب مہرو کی قسمت اور میری قسمت میں بھی یہی لکھا ہے۔ اس حویلی میں رہنے والے بھی لوگوں کی قسمت خراب ہے۔'' یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر جاتے ہوئے آمنہ بی بی کے پاس رکا تھا۔ ''بھول جائیں شاہ ویز کو چچی سائیں شاہ ویز اب نہیں آئے گا لوٹ کر کیوں کہ اب کچھ نہیں رکھا اس حویلی میں اس حویلی کے مکینوں کو ہم پر ترس نہیں آتا تو ہم کیوں ترس کھائیں۔'' یہ کہہ کر وہ آنسو صاف کرتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆

وہ کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کرے بالآخر اس نے فون نکالا اور شاہ ویز کو فون کرنے لگا۔

''ہیلو شاہ ویز۔''

''ہاں ہیلو شاہ سوار، کیا حال ہے خیریت سے تو پہنچ گئے ناں تم؟'' دوسری جانب سے شاہ ویز کی آواز ابھری تھی۔

وہ دونوں بیرون ملک میں بھی اکٹھے ہی رہے تھے جس کی وجہ سے ان کی دوستی مزید گہری ہو گئی تھی۔

''ہاں پہنچ گیا خیریت سے۔'' اس نے کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''کیا بات ہے شاہ سوار تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے حویلی میں تو سب ٹھیک ہیں ناں؟'' اس نے شاہ سوار کی آواز سے اندازہ لگا لیا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔

''کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ حویلی میں تجھے پتہ ہے مہرو کی شادی ہے کل اور میں کچھ نہیں کر سکتا۔

میں دادا سائیں کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔" وہ ہچکیوں میں رو رو کر کہہ رہا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے شاہ سوار کس کے ساتھ ہے اس کی شادی اور سنبھال تو خود کو۔" وہ بھی اس کی بات سن کر صحیح معنوں میں پریشان ہو گیا تھا۔

"شاہ سکندر کے ساتھ لیکن میں مہرو کی شادی اپنے سوا کسی اور کے ساتھ ہونے نہیں دوں گا۔ میں آج رات کو ہی مہرو کو لے کر حویلی سے نکل آؤں گا۔" وہ انتہائی جذباتی لہجے میں بول رہا تھا۔

"پاگل پن کی باتیں مت کر شاہ سوار اور شاہ سکندر شاہ زمان تایا کا بیٹا ہے ناں وہ جو آوارہ مزاج اور انتہائی بدتمیز اور مغرور ہے۔" شاہ ویز کو شروع سے شاہ سکندر پسند نہیں تھا۔ اس کا نام سن کر چونکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں وہی شاہ سکندر جس کو فضول کاموں کے سوا اور کوئی کام نہیں آتا۔" اس نے انتہائی بے زاری سے جواب دیا۔

"دادا سائیں کو اس میں آخر نظر کیا آ گیا ہے جو وہ تجھے چھوڑ کر اسے منتخب کر بیٹھے ہیں۔" شاہ ویز کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"پتا نہیں اماں سائیں کہہ رہی تھیں شہر بانو اور شاہ سجاول کا گھر بچانے کے لیے دادا سائیں نے کیا ہے یہ فیصلہ۔" شاہ سوار اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"کیا ان سب کی شادی ہو گئی ہے اور اگر میں غلطی پر نہیں تو کیا شہر بانو کی شادی شاہ داد سے ہوئی ہے۔" شاہ ویز کچھ کچھ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔

"ہاں اور سجاول کی شادی زیب النساء سے مگر اس کے باوجود تایا شاہ زمان کو اپنے آوارہ بیٹے کے لیے میری مہرو ہی ملی تھی یار مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا میں کیا کروں۔" شاہ سوار کو لگ رہا تھا جیسے وہ مزید کچھ کہے گا تو اس کا دل پھٹ جائے گا۔

"اچھا تو بس کر اور حوصلے سے کام لے ٹھیک ہو جائے گا سب انشاءاللہ اور میں بھی کوشش کرتا ہوں کہ ایک دو دن میں پاکستان آسکوں پھر دونوں مل کر کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیں گے۔" شاہ ویز اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔

"نہیں تو نہیں آنا تب تک بہت دیر ہو جائے گی اور ویسے بھی کچھ نہیں رکھا ادھر نہ تیرے لیے اور نہ میرے لیے اور میں نے تجھے اسی لیے بولا ہے کہ تو نہیں آئے گا۔" وہ انتہائی مایوس کن لہجے میں بولا۔

"لیکن تو نے یہ کیوں کہا۔" شاہ ویز اس سے پوچھ رہا تھا۔ "تاکہ ماہ رخ تجھے بھول جائے میں نے آج بھی اس کی آنکھوں میں تیری محبت کے عکس دیکھے ہیں جانتا ہے تو اس کی شادی شاہ میران سے ہو گئی ہے۔" وہ اسے ایک اور نئی اطلاع دے رہا تھا جسے سن کر شاہ ویز کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

شاہ سوار جانتا تھا شاہ ویز اور ماہ رخ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں وہ حویلی کے دیگر مردوں کی طرح نہیں تھا سب سے بڑھ کر اس کی اپنی خواہش یہی تھی کہ ماہ رخ کی شادی شاہ ویز سے ہو کیوں کہ وہ اور شاہ ویز بچپن کے دوست تھے۔

"اچھا یہ بتا اماں سائیں اور بابا سائیں کا کیا حال ہے؟ اور گل افشاں اور شاہ سانول ٹھیک ہیں ناں۔" شاہ ویز اب والدین اور بہن بھائی کی خیریت دریافت کر رہا تھا۔

"ہاں سب ٹھیک ہیں گل افشاں کی شادی ادھا شاہ میر سے ہوئی ہے مگر شاہ سانول نے ابھی تک شادی نہیں کی۔" شاہ سوار نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سب کچھ بتا رہا تھا۔

"کیا گل افشاں کی بھی شادی ہو گئی آہ کاش میں یوں دیر نہ کرتا پتا نہیں اماں سائیں کے دل پر

کیا گزری ہو گی میرے آنے کے بعد کاش کہ ہم یوں پردیس میں نہ آئے ہوتے تو یوں آج ہمیں رشتوں کی دوری نہ سہنی پڑتی۔" وہ ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوا بولا تھا۔

"لیکن اب کیا ہو سکتا ہے جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا مگر اب جو ہونے والا ہے اسے روکنا ہے مجھے ہر حال میں خیر میں اب فون رکھتا ہوں ٹھیک ہے اور ہاں تو جلدی آنے کے لیے کوشش کرنا۔" یہ کہہ کر وہ فون بند کرنے لگا تو شاہ ویز کی آواز پر وہ رکا تھا۔

"سن تو، کیسے روکے گا دیکھ شاہ سوار تو نے جو فیصلہ کیا ہے مہرو کو حویلی سے نکالنے کا اس کو ترک کر دے کیوں کہ تو جانتا ہے ناں دادا سائیں کے بندے ساری ساری رات جاگتے ہیں سمجھ رہا ہے ناں تو۔" شاہ ویز اس کو سمجھاتے ہوئے بولا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے، OK اللہ حافظ۔" یہ کہہ کر اس نے ایک لمبی گفتگو کے بعد فون بند کر دیا۔

☆......☆

رات کے تین بج گئے تھے اور وہ ابھی تک کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے تب وہ ایک فیصلہ کرتے ہوئے اٹھا اور مہرو کے کمرے کی جانب بڑھا تھا اور کمرے تک پہنچ کر آہستگی کے ساتھ دروازہ بجایا تھا مگر اندر سے کوئی آواز نہ آئی اس نے پھر بجایا اور کوئی آواز نہ آئی۔

"مہرو دروازہ کھولو میں شاہ سوار پلیز مہرو دروازہ کھولو۔ ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔" وہ دروازہ بجانے کے ساتھ ساتھ آوازیں بھی دینے لگا۔ اس بات سے بے خبر کہ دروازہ مہرو نے اندر سے بند نہیں کیا بلکہ باہر سے لاک کیا گیا ہے۔

وہ بہت دیر تک دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ اس امید سے کہ شاید مہرو دروازہ کھول دے مگر اندر گہری خاموشی تھی جیسے اندر کوئی تھا ہی نہیں اور وہ بالآخر ناکام اپنے کمرے میں چلا آیا۔

"آخر مہرو نے دروازہ کیوں نہیں کھولا۔ کیا وہ نہیں جانتی کہ میں آیا ہوں کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔" وہ خود سے سوال کر رہا تھا اس کے دل میں خطرے کی گھنٹی بجی تھی مگر وہ بے بس تھا۔

☆......☆

صبح ہو چکی تھی۔ حویلی میں خوب چہل پہل ہو رہی تھی مگر شاہ سوار کے اندر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاہ سوار کے علاوہ سبھی مرد اوطاق میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آج مہرو کا نکاح شاہ سکندر سے ہونا تھا۔ شاہ میر نے شاہ سوار سے اوطاق میں چلنے کو کہا اس نے منع کر دیا اور اب شاہ میر اس کو سمجھانے بیٹھ گیا تھا۔

"دیکھو شاہ سوار تو میرا بھائی ہے اور دوستوں کی طرح ہے۔ ہم سب نے دادا سائیں کو بہت روکا مگر وہ نہیں مانے۔ میرے بھائی خود کو سنبھال یہ رونا دھونا زنانیوں کا کام ہے۔ مرد بن مرد، تیرے لیے کوئی لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے مہرو سے اچھی لڑکی سے تیرا بیاہ کر دیں گے ہم۔" شاہ میر اس کو سمجھا رہا تھا۔

"بس کرو یہ میری زندگی کا معاملہ ہے۔ مہرو محبت ہے میری نہیں رہ سکتا میں اس کے بنا اور آپ کہتے ہو کہ میرے لیے اچھی لڑکی کی کمی نہیں ہے۔ میں مہرو کے علاوہ کسی کے ساتھ جینے کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔" وہ اپنے بھائی کو تاسف بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اچھا اب تجھے پتا چلا ہے کہ تو اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اُدھر پردیس میں پانچ سال کیسے رہا؟" شاہ میر اس کی بات پر طنز کرتے ہوئے بولا۔

''بھائی تب مجھے اس بات کا ڈر نہیں تھا وہ تب میری تھی لیکن اب وہ مجھ سے دور جا رہی ہے میں باہر کوئی عیاشی کرنے نہیں گیا تھا۔ صرف اس کے لیے اپنے مستقبل کو بہتر بنانے گیا تھا۔'' وہ شاہ میر کی بات پر بھڑک اٹھا۔

''تب تو میرے بھائی تو یہ سمجھ تو نے اپنی محبت کو علم کے لیے قربان کر دیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رکا نہیں اور پیچھے اس کو سوچتا ہوا چھوڑ گیا۔

☆......☆

''شہر بانو، ماہ رخ، گل افشاں جاؤ جلدی سے مہرو کو تیار کر دو نکاح کے لیے۔'' اماں سائیں نے تینوں لڑکیوں کو بلا کر ہدایت دی تھی۔

''جی اماں سائیں ہم ابھی جاتی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ تینوں کمرے کی طرف چل دیں۔

''لیکن سن شہر بانو چابی تو لیتی جا کمرے کی۔'' یہ کہہ کر اماں سائیں نے اس کو چابی پکڑا دی۔

''کیا تائی سائیں نے کمرے کو لاک کیا ہوا تھا۔'' شاہ سوار جو کمرے سے نکل کر ادھر ہی آ رہا تھا اماں سائیں کی بات سن کر ٹھٹکا تھا۔

''بھر جائی کیا آپ نے کمرہ باہر سے بند کر دیا تھا؟''

''ہاں تا کہ وہ کمرے سے باہر نہ آ سکے۔'' اماں سائیں نے روکھے پن سے جواب دیا۔

''ادھی تم تو اس حویلی کے مردوں کی طرح سنگدل نہ بنو۔'' زینت بی بی تڑپ کر بولی تھیں۔

''نہیں میں سنگدل نہیں ہوں وہ میری دھی ہے۔ مجھے اس کی زندگی بہت پیاری ہے اسے میں نے......'' ابھی ان کی باتیں ادھوری تھیں کہ شہر بانو کی دردناک چیخ سنائی دی۔

''اللہ سائیں خیر۔'' تینوں خواتین کے منہ سے ایک دم نکلا تھا اس کے ساتھ ہی تینوں مہرو کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں اور ان کے پیچھے ہی شاہ سوار بھاگا۔

شہر بانو! ماہ رخ اور گل افشاں زمین پر پڑی مہرو کی لاش کے گرد بیٹھیں دھاڑیں مار رہی تھیں اور اس کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں دادا سائیں اور حویلی کے باقی لوگوں کے نام ایک خط لکھا تھا جو کہ سائیڈ ٹیبل پر پڑا تھا۔ اس پر شاہ سوار کی نظر پڑی تو جا کر اٹھا لیا مگر پڑھا نہیں۔

''آہ میری دھی۔'' یہ کہتے ہوئے اماں سائیں غش کھا کر زمین پر گرنے ہی لگی تھیں کہ شاہ سوار انہیں سنبھالنے کے لیے آگے بڑھا تھا۔

''یہ تم نے کیا کیا مہرو، میرا انتظار تو کیا ہوتا۔'' شاہ سوار صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔

اللہ وسائی جو اماں سائیں کو ڈھونڈتی مہرو کے کمرے میں ہی آ گئی تھی مہرو کی لاش کو دیکھ کر چیخ مارتی او طاق کی طرف بھاگی تھی اور وہاں جا کر مہرو کی موت کی اطلاع دی۔ پوری حویلی میں کہرام مچ گیا تھا۔ حویلی میں پندرہ سال بعد ایک اور جوان لڑکی کا جنازہ اٹھا تھا۔

''کاش کہ کمرے کو باہر سے بند نہ کرتی میں۔ تو شاید آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔'' اماں سائیں اپنے کیے پر سخت پچھتا رہی تھیں۔

اس کی لاش کو دفنا دیا گیا تھا۔ حویلی کا ایک ایک مکین سوگوار تھا۔

☆......☆

ہفتے ہونے کو آئے تھے مگر حویلی کی افسردگی اور سوگواری ابھی باقی تھی۔ دادا سائیں اپنے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔ شاہ ویز مہرو کی موت کا سن کر واپس آ گیا تھا دادا سائیں نے اسے معاف نہیں کیا مگر اسے نکالا بھی نہیں تھا۔

تھوڑے دنوں بعد حالات کچھ بہتر ہوئے تو شاہ سوار کو اس خط کا خیال آیا جو مہرو کے کمرے

میں ملا تھا۔ اس نے خط نکالا اور پڑھنا چاہا مگر یہ سوچ کر رکھ دیا کہ خط سب کے سامنے پڑھ کر سنانا چاہیے۔

پھر ایک دن دادا سائیں سمیت سبھی افراد اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے تب شاہ سوار نے خط نکالا۔

''میں آپ لوگوں کو کچھ پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں اگر آپ سب اجازت دیں تو۔'' اس نے دادا سائیں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا سنانا چاہتے ہو تم۔'' شاہ نواز اس کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''اس دن جب ہم مہرو کے کمرے میں گئے تھے وہاں سے ایک خط ملا تھا مجھے، میں نے سوچا وہ آپ سب کو پڑھ کر سنایا جائے۔'' اس نے جیب سے خط نکالتے ہوئے کہا۔

''خط...... کیسا خط جلدی پڑھ کر سناؤ ہمیں۔'' دادا سائیں خط کے بارے میں سن کر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولے تھے۔

''شاہ ویز یہ خط پڑھ کر سنا دو۔'' یہ کہہ کر اس نے شاہ ویز کی جانب خط کو بڑھایا۔

شاہ ویز نے سب کے چہروں کو دیکھا اور خط پڑھنا شروع کیا۔

''دادا سائیں آج آپ کو میری لاش دیکھ کر پندرہ سال پہلے والی مہر النساء یاد آ گئی ہو گی۔ دادا سائیں میں آج وہی کہانی دہرا رہی ہوں جو پندرہ سال پہلے آپ کی بیٹی نے دہرائی تھی۔ آپ ہی تو کہتے تھے مہرو شاہ نواز بالکل مہر النساء جیسی ہے تو میں نے کام بھی وہی کرنا ہے جو انہوں نے کیا۔ آہ دادا سائیں آج میں آپ کے فیصلے کی بھینٹ چڑھ گئی۔

دادا سائیں آج مجھے پتا چلا ہے اس حویلی میں محبت کرنا جرم ہے اور اس کی سزا موت ہے وہ چاہے کسی بھی طرح سے ملے۔

اماں سائیں اور بابا سائیں مجھے معاف کر دیجئے گا۔ میرے اس فعل سے آپ کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی ہو گی۔ بہت شرمندہ ہونا پڑا ہو گا آپ سب کو مگر اماں سائیں آپ تو سب جانتی تھیں اور اس کے باوجود مجھے آپ سب ایک ایسے شخص کے ساتھ باندھ رہے تھے جسے عورتوں کی عزت کا کوئی پاس نہیں جو انتہائی عیاش پسند ہے بابا سائیں چاچا شاہ زاوار نے تو کئی بار مجھے آپ سے مانگا تھا اور آپ نے تو حامی بھی بھری تھی پھر ایسا کیوں کیا آپ سب نے۔ شاہ سوار ہمیشہ کے لیے تو باہر نہیں گئے تھے انہوں نے یہی کہا تھا ناں کہ وہ واپس آ جائیں گے پھر آپ لوگوں نے انتظار کیوں نہیں کیا؟ اور پھر یہی فیصلہ دادا سائیں نے ماہ رخ کے لیے کیا مگر اس نے اس فیصلے پر سر جھکا دیا کیوں کہ آپ سب نے شاویز ادھا کو جائیداد سے ہی عاق کر دینے کی دھمکی دی تھی مگر مجھ میں شاہ سوار کے بغیر زندہ رہنے کی ہمت نہیں۔ ادھی شہر بانو اور ادھا سجاول مجھے معاف کر دینا کہ میں آپ دونوں کے لیے کچھ نہ کر سکی۔

بس اس حویلی کے تمام مردوں سے یہی کہوں گی کہ آپ لوگوں کے فیصلوں نے ہم عورتوں کو مار ڈالا ہے ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔''

آپ کی مہرو شاہ نواز

خط پڑھ کر شاویز نے سب کے چہروں کو ایک بار پھر بغور دیکھا تھا۔ جہاں حزن و ملال کے سوا کچھ نہ تھا۔ سب ہی سر جھکے ہوئے تھے اور دادا سائیں بنا کچھ کہے ایک دفعہ پھر اپنے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔

☆......☆

فرحین اظفر

افسانہ

لاپرواہ

اس کی شخصیت کو اگر کسی ایک لفظ میں واضح کیا جاتا تو بلاشبہ وہ لفظ ہوتا ''لاپرواہ''۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ خود سے لاپرواہ تھی۔نہیں...... وہ اپنے باطن سے لاپرواہ تھی نہ اپنے اطراف سے، ہاں



لیکن اس کی ظاہری شخصیت اس کی توجہ کی اکثر محتاج نظر آتی لیکن چونکہ وہ تھی ہی لاپرواہ۔اس لیے اس طرف دھیان دینے کی اسے کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

اس کے دھیان دینے کے لیے دوسری فکریں ہی کافی تھیں۔

امی کی دوائیں وقت پر دینی ہیں، ختم تو نہیں ہو رہیں، کتنی باقی ہیں؟

ابا کا بلڈ پریشر کب گر رہا ہے۔کب آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔

بڑے بھائی کے کپڑے آفس کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔

خود اس کی اپنے بارے میں فکریں کچھ اس انداز کی ہوتی ہیں۔

کل ٹیسٹ ہے......افوہ ایک لفظ بھی یاد نہیں۔ رات میں کاپی پر ذرا کی ذرا نگاہیں دوڑائیں۔لو بس اتنا سا ہی تو ہے اور پٹ کاپی بند......

''چھوڑ یار! کل کی کل دیکھیں گے، ابھی کون



دماغ لڑائے......اونہہ......خوار......"

"اے شٹ یار! تو تھ برش تو کل نالی میں گر گیا تھا چلو ابا کا منجن زندہ باد، اب ایک برش کے لیے کون بازار جائے خوار......"

اور یہ خوار تو اس کا پسندیدہ لفظ تھا۔ اپنے لیے کوئی بھی کام ہل کر کرنے سے اسے اپنی خواری کا شدید خدشہ لاحق ہو جاتا اور وہ خود کو خوار ہونے سے بچانے کے لیے کبھی بھی وہ کام نہ کرنے کا عہد کر لیتی اسے دوسرے وہ سب لوگ بھی خوار نظر آتے جو ایسی چیزوں کے پیچھے بھاگتے جو اس کے نزدیک انسان کی خواری کا ذریعہ تھیں۔

لڑکیاں جو ہر مہینے باقاعدگی سے فیشل لیتیں۔

"گھر پر کلیزنگ کر لیں اگر اتنا ہی چسکا ہے تو پیسے کی بربادی اور ٹائم کی الگ......ہونہہ......خوار۔"

"کتنا ٹائم ہے فالتو، ان خواروں کے پاس۔"

"اور تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے تم تو اپنے منگیتر سے کبھی بات ہی نہیں کرو گی۔" کالج میں اس کی بات سن کر گروپ کی ایک لڑکی تپ گئی۔ اس کا منگیتر بھی اسے روز فون کرتا تھا۔

"یا اللہ! یہ تین گھنٹے کی فلم کیسے دیکھو گے تم لوگ اور وہ بھی ایک ایک سین یا اللہ...... اتنی خواری!" وہ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔

محلے کی وہ عورتیں جنہیں گھر گھر پھر کر غیبتیں کرنے کی بیماری تھی۔ اس سے خاص طور پر دور دور رہتیں۔ کیوں کہ ذرا سی دیر کسی کی برائی سن کر فوراً ہی بیچ میں کود پڑتی۔ پھر امی "ہیں...... ہیں......" کرتی رہ جاتیں اور وہ بات مکمل کر کے یہ جا وہ جا۔

"دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی خالہ! اور آپ ابھی تک یہی سوچ لے کر بیٹھی ہیں کہ ماسی زرینہ نے اپنی بیٹی کی شادی اتنے اونچے گھرانے میں کیسے کر دی۔ چھوڑیں بھی۔ نصیب تھا لڑکی کا مل گیا اسے۔ آپ خواہ مخواہ میں سوچ سوچ کر خوار ہو رہی ہیں۔"

محلے والیوں کا منہ بن جاتا کزنز اس کی کمپنی میں بور ہو جاتیں اور بڑی بہن یعنی آپی اسے نصیحتیں کرتے کرتے تھک جاتی۔

وہ لاپرواہ تھی، کبھی کان پر سے مکھی اڑا دیتی۔ کبھی او کے کہہ کر آنکھیں پٹپٹا دیتی۔

☆......☆

"تم خود ہی لے آنا ناں اپنی پسند سے۔" وہ بڑی جانفشانی اور لگن سے امی کے دوپٹے کے کنارے پر کروشیے سے مرہ بنا رہی تھی۔

"اور اگر تمہیں پسند نہ آیا تو؟" کسی کی شادی پر پہننے کے لیے سوٹ کی بات ہو رہی تھی۔

"تو بھی خیر ہے، کوئی بات نہیں۔"

اس نے آپی کو اپنے سوٹ کے تمام جملہ حقوق دیتے ہوئے کروشیے کا دھاگہ توڑا اور دوپٹہ کو پھیلا کر قدرے دور سے ڈیزائن کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔

"اوں...... دیکھو آپی۔" آپی نے جواب نہیں دیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"کیا ہوا اب؟"

"کچھ توجہ خود پر بھی دے لو۔" حمنیٰ بڑی بہن ہونے کے ناطے سنجیدہ تھی۔

"کیوں کیا ہوا؟" اس نے سامنے ڈریسنگ کے آئینے میں خود پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔

"پچ روشی! تمہیں نظر نہیں آ رہا تمہاری اسکن رف اور ڈل ہو رہی ہے۔ بالوں کا حشر دیکھو ٹرمنگ کرواؤ۔ آخر کب کرواؤ گی۔"

"کروالوں گی ناں۔" وہ اب لاپروائی سے سوئی میں دوسرا دھاگا ڈال رہی تھی۔

"کب آخر؟" وہ زچ ہو گئی۔ "شادی سر پر آ گئی ہے۔"

"تو کون سا میری شادی ہے۔"

"تو کیا اپنی شادی سے پہلے خود پر توجہ دینا حرام

ہے۔" حمنیٰ کا جی چاہا اپنے بال نوچ ڈالے اسے حمنیٰ کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

"اچھا جب تم جاؤ پارلر تو مجھے بھی لے چلنا۔" اس نے رضامندی دے ڈالی اور فوراً ہی پھنس گئی۔

"چلو پھر آج ہی۔"

"کیا...... آج......" اس کی آواز چیخ سے مشابہ تھی۔

"کیوں آج کیا یوم کشمیر ہے؟"

"کیوں یوم کشمیر کو شاپنگ منع ہوتی ہے۔" انداز بہت ہی دل جلانے والا تھا۔

"جی نہیں عام تعطیل ہوتی ہے۔ مارکیٹیں بند ہوتی ہیں۔" حمنیٰ چڑ ہی تو گئی۔

"اچھا اچھا...... نہیں میں تو اس لیے منع کر رہی ہوں کہ آج تو تمہیں اپنے اور میرے لیے کپڑے بھی لینے ہیں ناں، تو میں کہاں خوار ہوتی پھروں گی۔" وہ سنجیدہ ہوئی۔

"ہاں تم گھر میں ہی خوار ہوتی رہو۔"

"جی نہیں میں گھر میں خوار نہیں ہوتی، بلکہ اپنے گھر میں کوئی بھی خوار نہیں ہوتا، گھر تو جنت ہوتا ہے۔ جنت پر سکون...... آرام دہ...... آہ۔"

اس نے امی کا دوپٹہ طے کر کے رکھا اور خود بستر پر اپنی گردن سہلاتی ہوئی گر گئی۔

"تو تم نہیں چلو گی؟" اس کے انداز بتا رہے تھے۔ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

"پلیز آج نہیں، پہلے اپنی شاپنگ کر لو، پھر کسی دن میں تمہارے ساتھ نکلوں گی تو یہاں سے سیدھا پارلر اور پارلر سے سیدھا گھر واپس۔"

حمنیٰ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، پھر امی کو آتے دیکھ کر روئے سخن ان کی طرف کر لیا۔

"امی! آپ اس روشی کی بچی کو سمجھاتی کیوں نہیں کتنا کہہ لوں ساتھ چل کر اپنی مرضی سے کپڑے لے لو لیکن اس گھر گھسنی کو تو سمجھ ہی نہیں آتی۔" رشنا نے جلدی سے پیر سمیٹ کر امی کے لیے جگہ بنائی اور کروشیے کی خوب صورت بیل سے سجا دوپٹہ ان کی گود میں رکھ دیا۔

"او ہو! آج تو میری بیٹی تھک گئی ہے پھر کسی دن چلی جائے گی۔" دوپٹہ دیکھ کر امی تعریفی نظروں سے اس پر ہاتھ پھیرنے لگیں اور پھر خلاف توقع حمنیٰ کی مخالفت اور اس کی حمایت میں بول گئیں۔ ورنہ عام طور پر وہ اپنی بڑی بیٹی کی ہم نوا نظر آتی تھیں۔

رشنا کی ہنسی نکل گئی۔ حمنیٰ بھی اس کی ہنسی کا مطلب سمجھ کر مسکرا دی۔

"اور سنو پلیز بلیک یا وائٹ سوٹ مت لانا۔" اس نے اٹھ کر بولتے ہوئے مزے سے امی کی گود میں سر رکھ دیا۔

☆......☆

حمنیٰ اس کے لیے بے حد خوب صورت گہرے کاہی سبز رنگ کا سوٹ لائی تھی۔ ساتھ ہی چوڑیاں اور سینڈل بھی خود ہی لے آئی۔ رشنا نے بے حد آسانی سے اپنی پسندیدگی کی سند دے دی۔ اس کی تو ہمیشہ کی عادت تھی۔ خود ہر وقت اور پیسہ صرف کرنا اسے ہمیشہ ہی خواری لگتی تھی۔ بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے فیشل اور ہیئر کٹنگ کے لیے بھی حمنیٰ کو روانہ کر دیتی مگر تیسرے ہی دن حمنیٰ پھر آ دھمکی اور اسے گھسیٹ کر پارلر لے گئی۔

اس بار امی بھی بار بار سختی سے تاکید کر رہی تھیں۔

"ذرا ڈھنگ کی شکل نکال کر لانا۔"

"تو کیا پارلر والوں نے ڈبے میں شکلیں ڈال کر رکھی ہوئی ہیں کہ جو جتنا زیادہ پیسے دے گا اسے اتنی ہی اچھی شکل نکال کر دے دیں گی۔"

"فضول کی باتیں مت کرو۔"

"لو میں کب...... وہ تو امی ہی بول رہی تھیں۔" وہ حمنیٰ کی سنجیدہ شکل دیکھ کر مزید بک بک کا ارادہ کینسل

کر کے خاموش ہوگئی۔

☆......☆

عصر کے بعد ان کی واپسی ہوئی تھی۔ جب تک امی نے چائے تیار کی ابا اپنی دکان اور بڑا بھائی احمد بھی جاب پر سے واپس آچکا تھا۔

"دیکھا کتنی اچھی شکل نکلی ہے میری بیٹی کی؟" امی کے کمنٹس اسی انداز کے تھے۔

"اور نہیں تو کیا۔ اب لگ رہی ہے تھوڑی انسان کی بچی۔" حمنیٰ نے بول کر زبان دانتوں میں دبالی ابا سامنے ہی بیٹھے تھے اور اس وقت شام کی چائے پی جارہی تھی۔

"ابا! سن رہے ہیں آپ۔" اس نے جھٹ سے حمنیٰ کی بات پکڑی۔ ابا مسکرا دیئے۔

"بات کو غلط رنگ مت دو اچھا، بھیا دیکھیں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں کتنی اچھی لگ رہی ہے روشی۔" حمنیٰ کو اپنی بہن پر بار بار پیار آرہا تھا۔

"ارے میری بہن تو ہے ہی اچھی۔" احمر نے بھی مسکرا کر رشنا کو دیکھا وہ اترانے لگی۔ امی بار بار نظروں ہی نظروں میں اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔

اور یہ سچ ہی تھا کہ جس طرح رنگ روپ خدا کی دین ہوتا ہے اور بندے اپنی محنت سے اس میں چار چاند لگاتے ہیں تو رشنا کو یہ چار چاند والی محنت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ خود سے جتنی بھی غافل رہتی مگر حقیقت یہ تھی کہ اللہ نے اسے بہت پیاری من موہنی صورت سے نوازا تھا رنگت اگرچہ سرخ و سفید نہ تھی مگر چمکتی دمکتی رہتی تھی دن میں ایک بار ہی وہ اپنے فیس واش سے منہ دھوتی جو حمنیٰ اس کے لیے لائی تھی لیکن اسی سے اس کی صحت مند جلد دمکنے لگتی، کبھی عید اور شادی بیاہ کے موقعوں کے علاوہ فیشل تو دور کی بات وہ کبھی بلیچ تک استعمال نہیں کرتی تھی۔ اس کی پسند بھی بے حد محدود تھی۔

چن والی آستینیں اور چوڑی دار پاجامہ بس ہر سوٹ میں یہ دو چیزیں نمایاں رہتیں، باقی جو بھی رنگ اور ڈیزائن پہنتی اس پر اٹھ جاتا جیولری سے اسے خاص شغف نہ تھا، حمنیٰ ہی تھی بے چاری جو ہلکان ہوتی رہتی۔

وہ تو کانوں میں بالے پہن کر بھی خاص نظر آتی اور ٹاپس پہن کر بھی۔ رہے بال تو وہ بھی قدرت کی مہربانی سے اس قدر سلکی اور سیدھے تھے کہ اسے ہیئر اسٹائل کے لیے بھی کبھی فکر مند نہ ہونا پڑا۔ رات میں تقریب ہے تو صبح شیمپو کر لیا اور برش کر کے کھلے چھوڑ دیئے۔ بہت تردد کیا تو بیچ کی مانگ کو سیدھے اور کبھی الٹے ہاتھ کی طرف سے نکال لیا، لو جی بن گیا ہیئر اسٹائل۔"

گہرا کاجل، موٹا آئی لائنر اور گلوز میک اپ مکمل۔

پورے خاندان میں اس سے زیادہ سادی اور پرسکون کوئی لڑکی دکھائی نہیں دیتی تھی اور وہ اس سادگی میں بھی سب کو دکھائی دے جاتی۔

شاید خود سے لاپرواہ رہنے کی ایک بڑی وجہ وہ تعریفی نظریں بھی تھیں۔ جو ہر محفل میں اس کا احاطہ کر لیتیں، وہ خود شناس تھی۔ جانتی تھی کہ قدرت نے اسے بہت فرصت میں نہیں تو اتنی جلدی بھی نہیں بنایا۔ ہر چیز مکمل، خوب صورت اور اپنی جگہ فٹ تھی۔ متناسب سراپا اور قد بھی نمایاں تھا۔ یوں خود سے لاپرواہ رہ کر بھی وہ دوسروں سے ان کی غفلت چھین لینے کی صلاحیت تو رکھتی ہی تھی۔ دیکھنے والا پہلی نہیں تو دوسری تیسری نگاہ میں متوجہ ہو ہی جاتا تھا۔

☆......☆

شادی حمنیٰ کے سسرال میں تھی۔ یوں ان لوگوں کی اتنی قریبی رشتے داری بنتی نہیں تھی لیکن حمنیٰ نے اسے بہت اچھا سا میک اپ کر کے تیار کیا تھا۔ وہ خود بھی خود کو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ پھر پوری تقریب میں جس طرح حمنیٰ اسے لپٹے پھری گھر آتے آتے اسے وجہ معلوم ہو ہی گئی۔

حمنیٰ کے سسرال میں ہی سے ایک جگہ سے اس کے لیے پرپوزل آنے والا تھا اور یہ شادی کی تقریب ایک طرح سے اس کا بردکھوا تھا۔

وہ گھر آکر حمنیٰ پر خوب برسی کہ اسے پہلے سے کیوں نہ بتایا گیا۔

"تمہارا کوئی بھروسہ نہیں یا تو سن کر جانے سے ہی انکار کر دیتیں اونہہ...... خوار۔" حمنیٰ نے اس کی نقل اتاری۔

"یا پھر اس قدر کنفیوژ ہو جاتیں کہ ایک دم ہونق نظر آتیں۔"

بات غلط نہیں تھی اس کے ساتھ پہلے بھی اس طرح ہو چکا تھا کہ کسی تقریب کے دوران اسے پتا چلا کہ یہاں وہ موصوف خود بھی موجود ہیں جن کے لیے اسے تاڑا جارہا ہے اس کی شکل ایسی ہی قابل رحم ہو گئی تھی کہ حمنیٰ نے فون کر کے امی کو کہا تھا۔

"اگر ان کی جگہ میں ہوتی تو کب کا اسے ریجیکٹ کر چکی ہوتی۔ سمجھائیں اسے۔ ساٹھ کی دہائی کی ہیروئن کو جب گھر سے نکلنے ہی نہیں لوگوں سے ملے گی نہیں تو ایسے ہی کارٹون بن رہ جائے گی۔"

وہ سن کر بھی ساٹھ کی ہیروئن ہی رہی اور ہیروئن تو ہیروئن ہی ہوتی ہے چاہے ساٹھ کی ہو یا دو ہزار پندرہ کی یوں بھی پرواہ کرتی تھی اس کی جوتی۔

☆......☆

جن لوگوں نے اسے پسند کیا تھا آج حمنیٰ انہیں ساتھ لے کر ابا اور احمر سے ملوانے اور گھر دکھانے لا رہی تھی۔ موسم صبح سے ابر آلود تھا اور رشنا اس فکر میں ہلکان تھی کہ خدانہ کرے مہمانوں کے آنے سے پہلے یا ان کی موجودگی میں آندھی نہ آجائے۔

فضا میں حبس اور گرمی تو نہیں تھی لیکن نیلے بادلوں کی موجودگی نے اسے ٹھیک ٹھاک ہولا کر رکھا ہوا تھا۔

حمنیٰ نے دوپہر میں فون کیا تھا۔

"دیکھو روشی! اپنا حلیہ ٹھیک سے درست کرنا ورنہ تمہاری خیر نہیں ہوگی۔ یہ میرے سسرال والے ہیں اب میری عزت تمہارے ہاتھوں میں ہے۔" رشنا نے صبر سے اس کا بھاری بھر کم ڈائیلاگ سنا۔

"فکر مت کرو، میں نے صبح اٹھتے ہی ناشتے کے بعد کلینزنگ کر لی تھی اور جو کپڑے تم بتا کر گئی تھیں وہی پریس کر کے رکھے ہیں۔"

"گڈ۔" وہ مطمئن ہوگئی۔

جس وقت مہمانوں کی آمد ہوئی اور امی ابا اور احمر انہیں ریسیو کرنے گیٹ تک گئے اس احمق کو یہ یاد نہ رہا کہ مہمان سیدھے یہیں آئیں گے۔ یعنی ڈرائنگ روم میں، وہ آخری ناقدانہ نگاہ سب طرف ڈال رہی تھی۔ جب قریب آتی آوازوں پر اسے ہوش آیا۔

وہ تیزی سے باہر نکلنے لگی تھی کہ اس کا ہاتھ لگنے سے لمبا اور خوب صورت گلدان زمین بوس ہو گیا۔ دھات کا بنا ہوا تھا اس لیے ٹوٹا تو نہیں مگر سین خاصا فلمی ہو گیا۔

امی تو لڑکے کی ماں اور بہن کو لے کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں اور موصوف خود اپنے والد کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو ایک گھبرائی بوکھلائی حسینہ ہاتھوں میں پھول تھامے استقبال کو تیار کھڑی تھیں۔

شاہان حسن اس پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔ دل نے فوراً ہی سندِ قبولیت جاری کی اور وہ ہکلاتی ہوئی سلام کر کے پھول سینٹر ٹیبل پر تقریباً پھینکنے والے انداز میں وہاں سے نکل بھاگی۔

"معاف کیجئے گا میری بچی ذرا نادان ہے۔" ابا کی مسکراتی معذرت خواہانہ آواز کانوں میں پڑی تو دل میں افسوس کی لہر نے سر اٹھایا۔

"ارے صاحب! بچیاں تو سب ہی نادان اور

معصوم ہوتی ہیں۔" یہ یقیناً اس کے متوقع سسر تھے۔

"جی! چالاک، عیار تو آج کل کے بچے ہوتے ہیں۔" کچن میں گھستے ہوئے اس کے دل سے آواز آئی، کسی کی شبیہ نگاہوں میں لہرائی اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

☆......☆

"کہا بھی تھا امی کہ ڈھنگ سے تیار ہونا اور اس کی حالت دیکھیں۔ یہ...... نہ ہاتھوں میں چوڑی نہ انگلی میں چھلا کان ننگے...... اف!" حمنیٰ ان کے جانے کے بعد دانت کچکچا رہی تھی۔

"تم اتنی ہلکان کیوں ہو رہی ہو؟"

"ہلکان کیوں نہ ہوں میں آج کل لڑکیاں کتنا تیار ہو کر سامنے آتی ہیں معمولی شکل و صورت کی بھی خود کو کیا سے کیا کر لیتی ہیں اور ایک تم ہو اچھی خاصی شکل ہے اور یہ ماٹھا حلیہ۔"

امی چپ تھیں صاف ظاہر تھا کہ وہ حمنیٰ سے متفق ہیں وہ اطمینان سے احمر کی پینٹ پر جما جما کر استری کرتی رہی۔ پھر چند لمحوں کے بعد اس کی مسکراتی ہوئی آواز ابھری۔

"تم فکر مت کرو، مجھے پسند کر لیا ہے انہوں نے۔" حمنیٰ جو بدک کر پھر کچھ کہنے جا رہی تھی چونک گئی۔

"کیا مطلب...... تمہیں کیسے پتا۔" وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔ اب پھولوں والا قصہ حمنیٰ کے گوش گزار کرنا ناگزیر تھا۔ اس نے پلٹ کر امی اور حمنیٰ کو دیکھا پھر سر جھکا کر پوری روداد نشر کر دی۔

"یا اللہ امی! دیکھی آپ نے اس کی حرکت۔ یعنی ڈرائنگ روم میں جو اکلوتا ڈیکوریشن پیس تھا محترمہ نے گرا کر پھول ٹیبل پر پھینک دیے اف!" وہ سر پکڑ کر امی کے برابر میں گر گئی۔ اس کے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ ابھری جسے چھپانے کے لیے اس نے رخ موڑ لیا۔

☆......☆

"تمام مراحل بخیر و خوبی نمٹے دن پر لگا کر اڑ گئے۔ وہ اپنے بابل کی دہلیز ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر پیا سنگ رخصت ہو گئی۔ جہاں ایک چھوٹا سا پیارا سا گھر اس کا منتظر تھا۔ شاہان ایک بہت ہی محبت کرنے والا اور خیال رکھنے والا شوہر ثابت ہوا۔

وہ ہر ہر بات میں رشنا کی پسند ناپسند کو ترجیح دیتا، جب تک آفس کی طرف سے چھٹیاں ختم نہیں ہوئیں روز امی سے ملوانے لے جاتا رہا۔ ساس سسر جیٹھ کے ساتھ دوسرے شہر میں اپنے آبائی گھر میں رہتے تھے۔ چند دن اسی کے گھر گزار کر ساس نے اس سے کھیر پکوائی۔ گھر کا انتظام اس کے حوالے کیا اور اپنا رخت سفر باندھا۔

جانے سے ایک دن پہلے شام میں جب اس نے پہلی بار سب کے لیے خود چائے بنائی اور اپنے سسر سے انعام بھی وصول کیا۔ تب اس کی ساس نے محبت سے اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔

"تھک تو نہیں گئی میری بیٹی۔"

"نہیں امی! بھلا کام ہی کیا کیا ہے میں نے۔" وہ ذرا شرمندہ سی ہو گئی۔

"اچھا مگر چہرے سے تو بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔" اس کی جٹھانی بھی پاس ہی بیٹھی تھیں۔

"اچھا!" اس نے بے ساختہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ دل ہی دل میں ہلکی سی گھبراہٹ بھی ہوئی۔ بے ساختہ حمنیٰ کی نصیحتیں یاد آنے لگیں۔

"سسرال والے جب تک ہیں خوب بن سنور کر رہنا لوگ نئی نویلی دلہنوں کو بس دلہن کی طرح ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد بھلے اتنا کچھ لادنا مت خود پر۔ لیکن دن کے وقت شام میں جیسے ہی شایان کے آنے کا ٹائم ہو نہا دھو کر تیار ہو جایا کرنا۔"

"کیوں۔ میں کیا کوئی ماڈل گرل بن کر ان کی زندگی میں شامل ہوئی ہوں۔"

"ہاں شروع سال میں ہر آدمی اپنی بیوی کو ماڈل کے روپ میں ہی دیکھنا چاہتا ہے۔ سن لو کان کھول کر۔" حمنیٰ محض دو سال بڑی ہو کر کتنی سمجھ دار ہو گئی تھی۔

"توبہ ہے۔ تمہارے بچے نہیں ہیں آپی مگر تم باتیں بالکل اماں دادیوں کی طرح کرتی ہو۔" اسے کیا کچھ یاد آنے لگا۔

"کہاں کھو گئیں بی بنو، اس طرح بات بات پر بیٹھی سوچتی رہیں تو ہو گیا گزارا۔" جٹھانی بظاہر ہنس کر بولی تھیں ساس بھی مسکرا دیں۔

"جاؤ نہا دھو کر کپڑے بدلو تیار ہو جاؤ شاباش۔" وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ مبادا جٹھانی پھر کچھ کہہ دیں۔

"جی ابھی جاتی ہوں، وہ اصل میں آج ان کے سر میں کچھ درد تھا تو میں ڈسٹربنس کے خیال سے کمرے میں نہیں گئی۔" اس نے سرسری کا ذکر کیا لیکن اس کی جٹھانی پھر اچھل پڑیں۔

"کیا...... ارے امی! شایان کے سر میں درد ہے۔ تم نے کوئی ٹیبلٹ وغیرہ دی؟"

"جی انہوں نے پین کلر لے لی تھی۔" وہ گھبرا سی گئی۔

"اس کو تو میگرین ہوتا ہے پتا نہیں کتنی تکلیف ہو گی۔"

"میں دیکھتی ہوں۔"

کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو شایان اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ روشی کو اس کی طبیعت کافی بہتر محسوس ہوئی اور اپنی جٹھانی کی اتنی فکریں لمحہ بھر کے لیے فضول کا دکھاوا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ بھابھی کہہ رہی تھیں کہ آپ کو بہت خطرناک درد ہوتا ہے آدھے سر کا۔"

"ہاں لیکن اب طبیعت بہتر ہے۔ امی سے کہو چائے دے دیں۔"

"میں لاتی ہوں۔" اس نے بے اختیار اطمینان کا سانس لیا۔

زندگی اپنی مخصوص ڈگر پر چل پڑی تو جانے کب دن ہفتوں میں ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدل گئے۔ رشنا شاہان کا آنگن تین ننھے منے پھولوں کی قلقاریوں سے چہکنے لگا۔ شایان نے اسے خوب محبت دی حتیٰ المقدور خیال رکھا۔ شکایات کے مواقع بھی کم ہی آئے دوسری طرف رشنا نے بھی اس کے گھر کو جنت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پورا گھر اس کی محبت، سگھڑاپے اور محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

پردوں سے لے کر کشن کورز تک اس کے اپنے ہاتھوں کے بنے ہوئے، کیاریاں تھیں تو وہ مہکتی ہوئی، کچن تھا تو وہ آئینے کی طرح شفاف اور بیڈ روم کی تو بات ہی کیا تھی۔ ماں کے گھر میں جہاں اس پر کوئی خاص ذمہ داری نہیں تھی وہاں اسے خود بھی اپنی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں تھا۔ سر پر ذمہ داری پڑی تو جیسے کھل کر صلاحیتیں سامنے آئیں اور پھر نکھرتی چلی گئیں۔

اگر پورے گھر میں کوئی چیز ایسی تھی جو اس کی توجہ کو ترستی تھی تو وہ تھی اس کی اپنی شخصیت۔ کئی کئی بار حمنیٰ کے کہنے پر وہ پارلر کا چکر لگاتی ورنہ گھر میں پڑا ہوا کلینزنگ اور فیشل کا سامان بھی بس اپنی ایکسپائری ڈیٹ کا انتظار ہی کرتا رہتا۔

صبح صبح ایک بار اس کا منہ دھل جاتا پھر سارا دن وہ تین رنگ کے کپڑوں میں ملبوس پھرکی کی طرح ادھر سے ادھر کام نمٹاتی پھرتی۔ کئی بار شاہان نے اس کی توجہ اس طرف مبذول کروائی پھر جیسے اس کی عادت سے سمجھوتا کر لیا۔ روشی بھی مطمئن سی زندگی کے شب و روز میں مصروف ہو گئی لیکن یہ اس کی خام

خیالی تھی کہ شاہان نے اس کی عادت کے ساتھ سمجھوتا کرلیا تھا۔

ایسا نہیں تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں اس نے شاہان کو سمجھنے میں غلطی کردی تھی۔

☆......☆

"کل آپ ریسٹورنٹ میں کسی لڑکی کے ساتھ لنچ کررہے تھے؟" رات کے کھانے پر اس نے بہت سرسری انداز میں ذکر چھیڑا تھا۔

"کل!" شاہان سوچ میں پڑ گیا۔

"اوہ......وہ......ہاں میری ایک کولیگ ہے، تمہیں کس نے بتایا؟"

"حمنی آپی نے۔" روشی نے کھوجتی نظروں سے اپنے مجازی خدا کا چہرہ پڑھا مگر وہاں کوئی خاص تاثرات نہ تھے۔

"اچھا۔" شاہان کھانا کھاتا رہا۔

"اگر اس نے دیکھ ہی لیا تھا تو مجھ سے مل بھی لیتی۔"

"وہ سمجھی کہ آپ کا کوئی افیئر چل رہا ہے۔" شاہان نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ برتن اٹھانے لگی۔ شکل سے تو بہت سنجیدہ لگ رہی تھی۔

"اور تم کیا سمجھیں؟"

"میں تو وہی سمجھوں گی جو آپ سمجھا دیں گے۔" اس نے خود پر مصنوعی معصومیت طاری کرلی۔

"اوہ یار پلیز! دیکھو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم دونوں کو بھوک لگی تھی ایک کلائنٹ سے مل کر آرہے تھے تو راستے میں......" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ رشنا کے منہ سے قل قل ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا۔ شاہان چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس کی شرارت سمجھ گیا۔

"بہت بری بات ہے روشی! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔" وہ ریلیکس ہوکر اس کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھنے لگا۔

☆......☆

بچے ٹیوشن پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ مغرب سے پہلے کا وقت تھا۔

اس نے چائے دم پر رکھ کر ٹرالی کو نئے سرے سے جانچا۔ پھر کچن سے نکلنے سے پہلے اپنے نئے سوٹ کی میچنگ کا جارجٹ کا دوپٹہ سلیقے سے اوڑھا اور ڈرائنگ روم کی راہ لی۔

آج شاہان کے دو کولیگ جن میں وہ خاتون بھی شامل تھیں جنہیں حمنی نے شاہان کے ساتھ ریسٹورنٹ میں دیکھا تھا۔ شام کی چائے پر ملنے کے لیے آئے تھے۔ شاہان نے صبح سے ہی اسے بتا دیا تھا اور جتا بھی دیا تھا کہ آج اسے اسپیشلی ڈھنگ سے تیار ہوکر مہمانوں کے سامنے آنا ہے۔

"ہمیشہ کی طرح اس بے ڈھنگے حلیے میں مت اٹھ کر چلی آنا۔ وہ بہت ویل ڈریسڈ لڑکی ہے اور ہر چیز کو بہت غور سے دیکھتی ہے۔"

اسے یوں خاص طور پر شاہان کا جتانا بالکل برا نہیں لگا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں یا شاید ہفتوں سے وہ رشنا کے بے ہنگم پھیلتے وجود اور خود سے لاپروائی پر کچھ زیادہ ہی ٹوکنے لگا تھا۔ اور وہ تھی کہ ہمیشہ کی طرح ......اوہ...... کھانا پینا ہم سے نہیں چھوڑا جاتا بھئی۔ لاپروائی سے اس کی بات کو چٹکیوں میں اڑاتی۔

شامی کباب، چائنیز رول، کباب، میٹھے دہی بڑے اور یہاں تک کہ گلاب جامن تک اس نے گھر میں تیار کر ڈالے اگر شاہان اپنی کولیگ سے متاثر تھے تو آج وہ بھی اس کو متاثرین میں شامل کرکے ہی یہاں سے بھیجنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

صبح سے ان چیزوں کی تیاری اور گھر کی خاص الخاص صفائی نئے سرے سے سیٹنگ کی تبدیلی نے ہمیشہ کی طرح اسے خود سے بیگانہ کردیا تھا۔ نتیجتاً جب تک اس نے نہا دھو کر نیا سوٹ زیب تن کیا مہمان آچکے تھے۔ لیکن شکر تھا کہ ہر چیز وقت پر تیار اور بچے ٹیوشن کو روانہ ہوچکے تھے۔

اس نے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے لمحہ بھر رک کر ایک گہری سانس اندر کو کھینچی۔ وہ پہلی بار شاہان کے کسی آفس کولیگ سے ملنے جارہی تھی۔

"خیر تمہاری تو پرسنالٹی ہی سب سے الگ ہے۔" شاہان کے تعریفی کلمات نے اس کی سانس اندر کی اندر ہی گھونٹ دی۔

"بھلا میری وائف اور تمہارا کیا مقابلہ۔ پاگل ہو تم ابھی آئے گی تو دیکھنا اسے جب سے شادی ہوئی ہے شاذ و نادر ہی مکمل سوٹ میں دیکھا ہے۔" رشنا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

یہ اس کا محبوب شوہر تھا۔ جس کی خاطر وہ جان سے گزر سکتی تھی۔ جس کے گھر اور بچوں کو بنانے کی خاطر اس نے اپنا آپ مٹا ڈالا تھا۔ وہ کسی اور عورت سے اس کی تعریف کررہا تھا۔ اپنی بیوی کی برائی کے ساتھ اور وہ بھی اس قدر مبالغہ آمیزی سے کہ حد ہی کردی تھی۔

"یار یہ ہاؤس وائفز تو سب ہی ایک سی ہوتی ہیں، گھر اور بچوں کی فکر ہر وقت سر پر سوار کرکے بدحواس اور بوکھلائی ہوئی پھرنے والی۔"

یہ دوسرے مرد کی آواز تھی۔ رشنا کا جی چاہا اندر جاکر ایک زوردار طمانچہ مارے، اپنے شوہر کے منہ پر۔ جو بڑے طمطراق سے نامحرموں کی یہ محفل سجا کر بیٹھا خود بھی ایک غیر عورت کی مدح سرائی میں مصروف تھا۔ بلکہ دوسرے نامحرم مرد اس کی اپنی بیوی پر کمنٹس پاس کررہے تھے اور اسے ہوش تک نہیں تھا۔

اسے لگا وہ یہیں چکرا کر گر جائے گی اور ساری زندگی اٹھ نہ سکے گی۔

کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے دروازہ ناک کیا اور وہیں سے پلٹ گئی۔

☆......☆

"ارے رشنا! تم آئی نہیں وہاں وہ دونوں تمہارا......" کمرے میں داخل ہوتے ہی شاہان کے الفاظ منہ میں رہ گئے۔ ڈریسنگ کے سامنے بالکل مختلف حلیے والی رشنا کھڑی تھی۔

یہ اس کی وہ بیوی نہیں تھی جسے وہ روز آفس سے واپسی پر سر جھاڑ منہ پہاڑ کبھی بچوں تو کبھی کچن کے ساتھ مصروف دیکھتا تھا۔

یہ......یہ تو کوئی ماڈل گرل تھی شاید، جدید تراش کے سوٹ میں ایک سائیڈ پر دوپٹہ کھلے ہوئے سلکی اخروٹی بال، ڈارک لپ اسٹک اور بلش آن کے ساتھ چمکتا ہوا چہرہ۔ وہ یقیناً پہلے سے کچھ موٹی ہوگئی تھی۔ لیکن بدصورت نہیں۔

کانوں میں ننھے موتی جگمگا رہے تھے۔ ہاتھوں میں بریسلیٹ تھا۔

"چلیں میں ذرا تیار ہونے لگی۔"

اس کا لہجہ، انداز، آواز سب بے حد نارمل تھا۔ کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ کچھ لمحوں پہلے اس نے اپنے شوہر کی کوئی بات سنی تھی جو اس کی دل آزاری کا سبب بنی تھی۔ اس نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اپنے لڑکھڑاتے قدموں کو قابو کیا تھا۔ اپنی سرخ بھری ہوئی آنکھوں کو رگڑا تھا اور چند لمحے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد اپنے شوہر کو اس بے ایمانی پر معاف کردیا تھا۔ جی ہاں اس نے معاف کردیا تھا۔

شاہان کے شانہ بشانہ پروقار چال چلتے ہوئے اس نے غیر جانبداری سے سوچا۔

"غلطی میری ہی تھی۔ نہ میں خود سے اتنا غافل رہتی نہ یہ بات سننا پڑتی۔" ساری زندگی خود سے لاپرواہ رہنے والی کو شوہر کے ایک جملے نے سدھار کر رکھ دیا تھا۔

......☆......

سارہ راجکماری

افسانہ

جذبہ قربانی



رانی نے مسکرا کر دس کے نوٹوں کی گڈی دیکھی اور پھر مسکرا کر دو اور ایک کے سکوں کی جھنکار سنی' تو لب آپ ہی آپ مسکرا دیئے' اس کے گرد بیٹھے چاروں نفوس نے اشتیاق سے رقم جاننی چاہی۔

"آپا مطلوبہ رقم پوری ہوگئی ہے یا نہیں؟"

صدا کی بے صبری سوئی فٹ سے بولی۔ صبوحی' شان اور مان نے بھی امید بھری نگاہوں سے آپا کو دیکھا' دس ہزار سات سو پینتیس روپے سب کے چہرے کھل کر گلاب ہو گئے۔

اصغر اور آسیہ دونوں غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اصغر معمولی مزدور سے مستری بن گیا مگر اوپر تلے کے پانچ بچوں نے اس مہنگائی کے دور میں کمر توڑ دی۔ بیٹیوں کو آٹھ جماعتوں تک پڑھایا شان' مان دونوں دسویں جماعت میں پڑھ رہے تھے سو خرچے اس لیے قربانی کرنے سے رہ جاتے۔ بچوں کی بڑی خواہش تھی کے سب گھرانوں کی طرح ان کے گھر بھی ہفتہ بھر پہلے قربانی کا بڑا نہ سہی چھوٹا جانور تو ضرور ہو۔ برے ہوتے گئے حالات نے ان کی خواہش کو راکھ کر ڈالا مگر دبی دبی چنگاری باقی رہ گئی اس لیے ان پانچوں نے پچھلی عید پر عہد کیا کے عید قربان پر ان کے گھر بھی انشا اللہ قربانی ہوگی اماں ابا سے کہنا فضول تھا' بھی ڈانٹ دیتے بلوں کی فہرست ان کی سماعتوں میں انڈیل دیتے تبھی آپا نے پلان کیا ' وہ سب ملا کر پیسے جمع کریں گے تو اگلے سال انشاء اللہ وہ بھی قربانی کر سکیں گے۔ سبھی نے آپا کے ریڈ شیشے والے بکس میں سب بہنوں کی چاندی کی انگوٹھیاں اور بالیاں رکھی تھیں اپنی عیدی کا ایک جوڑا اپنے پاس رکھا اور تین جوڑے محفوظ کر لیے آپا سلائی کرتی تھیں محلہ کی عورتیں آ کر ڈیزائن دیتی یوں آپا نے سلائی کے سوٹ چھپا کر سینا شروع کر دیئے اور بکس میں پیسوں کا اضافہ ہونا شروع ہوتا گیا۔ سونی اور صبوحی نے کڑھائی کر کے پیسے بچانے شروع کر دیئے۔ شان اپنی اچھی میتھ کی بنا پر بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگا۔ مان جنرل اسٹور پر جاب کرنے لگا' اتنی دیر باہر رہنے پر اماں ابا نے ڈانٹا بھی آج ان سب کی محنت ان روپوں کی صورت میں سامنے تھی۔

"شان تم کل ہی جا کر منڈی سے ریٹ کا پتہ کرو۔"

"نہیں آپا! منڈی سے نہیں ہمیں کسی گاؤں سے پتہ کرنا ہوگا' ابھی تو ایک ماہ رہتا ہے۔" رانی نے مسرت سے پیسے سنبھالے اور بکس کے نچلی تہہ میں رکھ دیئے۔

"اف میرے خدا! اس سے پہلے کہ لائٹ جائے میں تم لوگوں کا یونیفارم استری کر دوں۔" صبوحی بھاگی، سونی اداس بیٹھی تھی۔

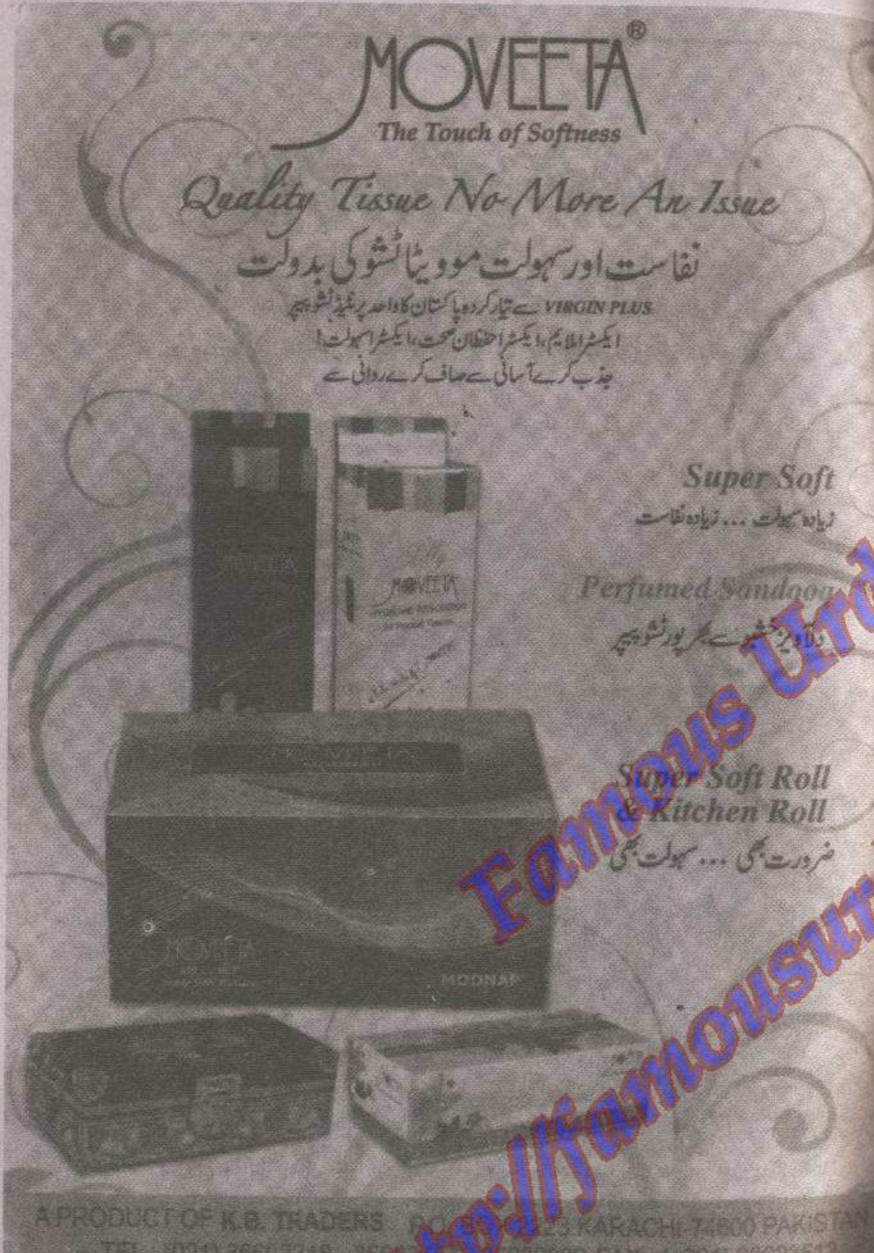
"کیا ہوا گڑیا؟" مان نے محبت سے پوچھا۔

"اتنے پیسوں میں بکرا آ جائے گا؟"

"ہاں بالکل انشاء اللہ، بس دعا کرو خدا ہمیں قربانی کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری قربانی کو قبول کرے۔"

اصغر جیسے ہی گھر آیا تو خلاف معمول خاموشی تھی ورنہ رانی سامنے بیٹھی سلائی مشین گھر گھر چلا رہی ہوتی' تو ان کا دل وہم سے بھر جاتا' صبوحی فل والیم میں ایف ایم چلائے خود بھی عینی اور ملکہ ترنم بننے کی کوشش کرتی، آسیہ مہنگائی کا دکھڑا رو رہی ہوتی' جسے سب ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے یا کبھی اماں کے ساتھ پریشان ہو جاتے۔ چھوٹی صبوحی بڑی بی بن کر تسلی دیتی تو سب کھلکھلا دیتے۔ اصغر نے رانی کو پکارا۔ "رانی او رانی! ایک گلاس پانی تو پلا۔"

"جی ابا لائی۔"



"سب کہاں ہیں؟"

"صبوحی اور اماں چھوٹی خالہ کے گھر گئی ہیں۔ سونی، مان اندر ہیں اور شان باہر گیا ہے، کہہ رہا تھا ذرا دیر سے آئے گا۔" رانی نے تفصیل بتائی ابا کو رانی کی صورت اتری ہوئی لگی۔

"کیا ہوا رانی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"جی ابا۔" رانی گھبرا گئی اور جلدی سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

بیس دن رہ گئے ہیں۔ شان نے بکرے کا پتہ کیا بکرا وہ بھی ٹھیک سا گیارہ ہزار روپے کا وہ بھی کسی گاؤں سے پتہ کیا تھا انہوں نے دو دن کا ٹائم دیا تھا ورنہ وہ اور کسی کو بیچ دیں گے۔

"کہاں سے دو دن میں نو سو پچھتر روپے لائیں۔ پانچ سو تو پک اپ والا مانگ رہا ہے، دو سو حاجی صاحب لیں گے۔ وہ پہلے بھی ساتھ گئے تھے بکرا بالکل قربانی لائق ہے۔"

اس لیے سب کے چہرے اترے ہوئے تھے، رانی نے رات میں دو سوٹوں کی سلائی کی اور اماں سے جھوٹ بولا کہ بس ایک ہی سلوایا ہے۔ اماں بھی کیا کرتی اس مہنگائی میں گزارا کرنا مشکل تھا۔ اس لیے ہر وقت بچت کی لگی رہتی اور پھر عید کا خرچ۔

"شان تم کچھ وقت مانگ لو۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے ان کا نمبر ہے، میں پی سی او سے فون کرتا ہوں اگر وقت دیا تو انشاءاللہ بات بن جائے گی۔"

"پانچ دن رک جائیں تو دو تاریخ کو تنخواہ مل جائے گی۔"

"ہاں میں بھی دو تین جوڑے سلائی کر لوں گی۔"

شان شام میں گھر آیا تو بہت خوش تھا۔

"وہ خود بھی عمرے پر جانے کے لیے پیسے جمع کر رہا ہے۔ ہمارا جذبہ قربانی سن کر پگھل گیا۔ مبارک ہو انشاءاللہ ہمارا جذبہ قربانی ضرور رنگ لائے گا۔"

اصغر گھر آیا تو خلاف معمول کنڈی اندر سے لگی تھی۔

"شان!"

دستک کے ساتھ انہوں نے آواز دی، تو فوراً رانی نے دروازہ کھولا اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتے ان کے کھلے منہ میں رس گلا آ سمایا۔ انہوں نے بچوں کو حیرانی سے دیکھا جو قطار میں کھڑے تھے اور پھر بیوی کو جو چہرے پر دھنک رنگ لیے مسکرا رہی تھیں مان نے فوراً کہا۔ "ابا آنکھیں بند کر لیں۔" سب دل میں دعا کر رہے تھے کہ ان کے بتانے سے پہلے بکرا نہ بول پڑے۔

"اب کھول دیں۔" سفید کالا بکرا فخر سے گھاس کھاتے ہوئے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"یہ" وہ بمشکل بولے۔

"یہ ہمارا بکرا ہے۔"

"یہ ہم سب کا جذبہ قربانی ہے اور انشاءاللہ خدا سے دعا ہے وہ ہم کو یہ سعادت ہر سال نصیب فرمائے۔ سونی بھیگی آواز میں بولی خدا کے حضور یہ چھوٹا سا نذرانہ ان کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر ان کی خود آنکھیں بھیگ گئیں اور محبت سے بیوی بچوں کو دیکھا اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی تو آنسو ڈھلک گئے۔

"خدایا تیرا شکر ہے جو تو نے مجھے اتنی صالح اولاد سے نوازا میرے بچوں کے دلوں میں جذبہ قربانی ڈالا میں تیرا شکر گزار ہوں خدایا۔"

وہ اپنے بچوں کو دیکھ کر رب کے شکر گزار تھے۔

......☆......

نائلہ طارق

سلسلہ وار ناول

قسط نمبر 30

جو عشق میں بیتی وہ عشق ہی جانے

احتیاط سے اپنی گرفت میں پھڑ پھڑاتے کبوتر کے پر تراشتے ہوئے وہ خرمن کی طرف متوجہ ہوا تھا، جو کرسی پر براجمان اپنے چہیتے کبوتر سے لاڈ کرنے میں مصروف تھی، کچھ کوفت کے ساتھ وہ دوبارہ کبوتر کے پروں کی تراش کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ایک دوسرے کبوتر کے پھڑ پھڑاتے پر اس کے چہرے سے ٹکرائے تھے، ہڑ بڑا کر اٹھتے ہوئے اس نے گرفت سے کبوتر کو آزاد کر دیا تھا، اور جھلائے انداز میں اپنے حملہ آور کی طرف بڑھا تھا مگر وہ کبوتر بھی ہوشیار تھا، پلک جھپکتے ہی پنجرے میں جا گھسا تھا۔

''یہ میرے ہاتھوں ذبح ہو جائے گا، جب سے میں نے تمہارے ان چہیتوں کی ذمہ داری لی ہے، ہر روز یہ مجھ پر جھپٹتا ہے، اس کی وجہ سے میرا چہرہ بگڑ جائے گا۔'' وہ شدید ناراضی کے ساتھ خرمن سے مخاطب تھا۔

''کچھ نہیں ہوتا تمہارے چہرے کو، حشر تو میرا بگڑ چکا ہے، اتنی بے ڈھب کہ گھر میں قید ہو کر رہ گئی ہوں۔'' خرمن نے خشمگین نظروں سے اسے دیکھا تھا جو بے ساختہ مسکرایا تھا۔

''مگر میری نظروں میں دنیا میں حسین ترین تم ہی ہو۔'' عارش نے وارفتہ نگاہوں سے اس کے جھلملاتے چہرے کو دیکھا تھا، ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی خاموشی ٹوٹ رہی تھی، چہرے پر طاری سوگواری میں کمی



آتی جارہی تھی، مگر دیکھا جائے تو حالات بدستور وہی تھے، بس یہ تھا کہ فاطمہ سے فون پر وہ رابطے میں رہتی تھی۔ احمد حسین نے ان کو فون پر خرمن سے بات کرنے سے نہیں روکا تھا، وہ خود بھی کس طرح اس کی آواز سنے بغیر، اس سے کٹ کر کس طرح دن گزار رہے تھے، یہ عارش جانتا تھا مگر نہ ہی وہ احمد حسین کو راضی کر سکا تھا اور نہ ہی خرمن نے اپنی ضد میں کوئی لچک بیدار کی تھی۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم ریڈیو اور مائک کو بہت مس کر رہی ہو گی، مگر میں بہت مطمئن ہوں تمہیں صبح و شام گھر میں دیکھ کر۔“

”تمہارا یہ اطمینان زیادہ دن تک نہیں رہنے والا۔“ خرمن فوراً بولی تھی۔

”جب وقت آئے گا تو دیکھ لیں گے۔“ مسکراتی نظروں سے اس نے خرمن کو دیکھا تھا، جو بس اسے دیکھ کر رہ گئی تھی، آخری کبوتر کو اس نے پنجرے میں ڈالا تھا، جب کال بیل کی آواز نے چونکا دیا تھا۔ عثمان کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ ٹیرس کی سمت ہی آ رہا ہے، لہٰذا اس نے گرم شال کو مزید اپنے گرد ٹھیک کر لیا تھا۔

”مبارک ہو بہت بہت، چاچو بن ہی گئے تم، کتنا اچھا ہو اگر انسان بھی بن جاؤ۔“ خرمن نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”تم بس خاموش بیٹھی ہوئی ہی اچھی لگتی ہو، ورنہ تمہاری زبان کے لشکارے کافی ہوتے ہیں، اچھے خاصے بندے کو انسانیت بھلانے کے لیے۔“

”تم بھی زبان کھولنے سے پہلے ذرا یاد رکھ لیا کرو کہ یہ تمہارے لیے کافی معتبر ہستی ہیں، یہ نہ ہوتی تو کون تم جیسے شیطان کو نماز، قرآن پڑھنا سکھاتا۔“ عثمان کی لائی ہوئی مٹھائی کھاتے ہوئے عارش نے اسے گھر کا تھا۔

”مجھے یاد ہے دوست، میرے اور استانی کے درمیان جو ببول کا کانٹا تمہاری صورت میں اگا تھا، مجھے تو وہ بھی یاد ہے۔“ استہزائیہ نظروں سے عارش کو دیکھتے ہوئے عثمان نے اس سے مٹھائی کا ڈبہ تقریباً چھین لیا تھا۔

”یہ لو پکڑو، ایسی نفرت سے کیوں دیکھ رہی ہو مجھے، اپنے بھائی کی خوشی میں شریک کرنے آیا ہوں، ورنہ تمہارا شوہر تو میرے بھائی کا نام سنتے ہی انگاروں پر لوٹ جاتا ہے۔“ خرمن کے گھورتے رہنے پر عثمان نے جلے کٹے انداز میں عارش کو چونکا دیا تھا۔

”جو گزر گیا سو گزر گیا، میں برہان بھائی کے لیے بہت خوش ہوں، وہ اب ایک بیٹی کے باپ بن چکے ہیں، ان کی بیٹی نے میرے دل کو ان کی طرف سے بالکل صاف کر دیا ہے۔“ عارش صاف گوئی سے بولا تھا۔

”سنو! تم نے منیزہ کو مبارک باد دی؟ وہ بھی ایک عدد بھتیجی کی پھپھو بن چکی ہے۔“ مٹھائی کھاتے ہوئے خرمن نے عثمان سے پوچھا تھا۔

”اس نے نوبت ہی کہاں آنے دی کہ میں اسے فون کرتا، اس نے تو شاید ہاسپٹل سے ہی مجھے فون کھڑکا دیا، اور تو اور خوشی میں ایسی پاگل تھی کہ مٹھائی بھی مجھ سے ہی مانگ رہی تھی، پھر میں نے اسے یاد دلایا کہ تمہارے بھائی صاحب باپ بنے ہیں، اصولاً تو ان کو مٹھائی تقسیم کرنی چاہیے، میری کیا ذمے داری ہے اس میں۔“ عثمان کے حشمگین انداز پر خرمن بے ساختہ ہنسی تھی۔

”تمہارے خاندان میں منیزہ جیسے اور کتنے نمونے ہیں جن کو صرف مانگنے کی عادت ہے؟“ مسکراہٹ چھپائے عثمان اس سے پوچھ رہا تھا، جو اسے ہی حشمگین نظروں سے گھورنے میں مصروف تھا۔

”خرمن! تم اس سے ناراض تھیں، تم کو یاد ہے کہ یہ کتنے دن بعد یہاں آیا ہے؟“ عارش کو بدلہ لینے کا اچھا موقع ملا تھا۔

”ان کو اپنی بیگم کے ناز نخرے اٹھانے سے اور تقریبات اٹینڈ کرنے سے فرصت ملے، تو یہ یہاں آ کر وقت برباد کریں۔“ خرمن کا لہجہ خشمناک تھا۔

”تقریبات اٹینڈ کرنے نہیں جاتا وہ کام ہے میرا، اور بیگم بے چاری کو درمیان میں نہ لاؤ، اس کا کیا لینا دینا تم لوگوں سے۔“

”کیا بول رہے ہو؟“ عثمان کی سنجیدگی پر عارش بے ساختہ ہنسا تھا۔

”یار! مجھ پر دراصل ہو رہا ہے نیند کا حملہ، بیلا نے زبردستی مٹھائی دے کر یہاں بھیجا ہے، ورنہ میں اتنا تھکا ہوا ہوں کہ تڑ سے گر کر پٹ سے سونے کے لیے تیار ہوں، پھر یہ خلش بھی تھی کہ اتنے دن گزر گئے اور میں نے استانی کو......“

”اس سے پہلے کہ نیند تمہارے مزید ہوش گم کر دے، تمہیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ عارش نے جس طرح اس کی بات کاٹ کر اٹھنے کا اشارہ دیا تھا وہ مسکراہٹ نہیں چھپا سکا تھا۔

”تمہارے لیے اتنی بے عزتی برداشت کرتا ہوں مگر تمہیں میری کوئی قدر نہیں۔“ جاتے جاتے وہ خرمن کو جتانا نہیں بھولا تھا۔

اپنا تکیہ درست کرتی وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی، جو نائٹ شرٹ کے بٹن بند کرتا ڈریسنگ کے سامنے جا رکا تھا۔

”خرمن! تم اپنی جادو بھری نظروں سے ایسے مت دیکھا کرو، ورنہ جانتی ہو میرا دل کیا چاہتا ہے؟“ ہیئر برش اٹھاتے ہوئے اس نے مسکراتی نظروں سے خرمن کو دیکھا تھا۔

”کہیں تمہارا دل یہ تو نہیں چاہتا کہ زمین پھٹے اور تم اس میں سما جاؤ؟“ وہ مسکراہٹ چھپائے پوچھ رہی تھی۔

”سن کر اچھا لگا۔“ اس کی حشمگین نظروں پر وہ دھیرے سے ہنسی تھی۔

”آج کچھ عجیب ہو رہا ہے، مجھے نہیں لگتا کہ نیند آج مجھ پر مہربان ہونے والی ہے۔“ بیڈ کی سمت آتا وہ الجھے لہجے میں بولا تھا جبکہ خرمن حیران نظروں سے مدھم روشنی میں اس کے چہرے کو تک رہی تھی۔

”میری چھٹی حس بار بار الارم دے رہی ہے، میرا دل نہیں چاہ رہا کہ میں آنکھیں بھی بند کروں۔“ اس کے بے بس انداز پر خرمن بس مسکرائی تھی۔ عارش کی چھٹی حس کے اشارے بالکل درست تھے، آدھی رات گزرنے کے بعد خرمن کی طبیعت بگڑنے لگی تھی، اسے ہاسپٹل جانے کی ضرورت توقع کے عین مطابق درپیش آئی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلتے تکلیف کے آثار نے عارش کے ہوش اڑا دیے تھے، مگر ہاسپٹل پہنچنے تک وہ راستے بھر خرمن کو حوصلہ اور تسلی و تشفی دیتا رہا تھا، اس وقت خرمن اسے بتا نہیں سکی تھی کہ اس کی آواز اور اس کے ہاتھ کا لمس کتنی ڈھارس دے رہا تھا، وہ چاہتی تھی کہ عارش اس کا ہاتھ تھامے رکھے، گھر سے نکلنے سے پہلے عارش نے فاطمہ کو بھی فون کر دیا تھا، بیلا اور عثمان ان کو پک کرتے ہوئے ہاسپٹل پہنچے تھے، فاطمہ کو دیکھتے ہی خرمن اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکی تھی۔

”گھبراؤ مت، تمہیں کچھ نہیں ہوگا، میں تمہارے لیے اللہ سے دعا کر رہا ہوں۔“ جس وقت اسے لیبر روم میں لے جایا جا رہا تھا، عارش نے اسے یہ کہا تھا، مگر اس کے پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے بھی وہ اپنے

آنسو نہیں روک سکی تھی۔

منیزہ اور صبیحہ آگے پیچھے ہی ہاسپٹل پہنچی تھیں اور اب ویٹنگ روم میں ایک ایک لمحہ قیامت بن کر گزر رہا تھا، فاطمہ ایک طرف جائے نماز بچھائے دعا میں مصروف تھیں، تو صبیحہ کے ہاتھوں میں تسبیح تھی، ورزیدہ نظروں سے ان کی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھتے ہوئے منیزہ کے اضطراب میں اضافہ ہی ہو رہا تھا، ونڈو کے پاس کھڑے عارش کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا، جانے اس وقت وہ فون پر کس سے بات کر رہا تھا، منیزہ کو بھی لگ رہا تھا کہ وہ احمد حسین سے بات کر رہا ہے، اس گھمبیر ماحول میں اور خرمن کی فکر میں منیزہ کا دل حلق میں آ رہا تھا، بیلا بھی پاس نہیں تھی، کیونکہ فاطمہ کی ہدایت پر عثمان اسے ساتھ لے کر گھر چلا گیا تھا، گہری سانس لیتی وہ کچھ چونک کر سیل فون کی طرف متوجہ ہوئی تھی اور پھر چپکے سے ہارون کی کال ریسیو کر لی تھی۔

"منیزہ تم اس وقت کہاں ہو؟" ہارون کے لہجے میں بے چینی نمایاں تھی۔

"میں ہاسپٹل میں ہی ہوں۔"

"سب خیریت ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی، سب بہت پریشان ہیں، آپ بھی اس کے لیے دعا کیجیے۔"

"میری زندگی کا کوئی دن ایسا نہیں گیا، جس میں میں نے اس کے لیے دعا نہ کی ہو، اسے میری دعاؤں کی ضرورت نہ بھی ہو، تو بھی مجھ پر فرض ہے کہ میں اس کی خوشیوں اور آسودگی کے لیے دعا مانگوں اور میں دعا کر رہا ہوں کہ اس کے لیے سب اچھا ہو۔" بوجھل لہجے میں بولتا وہ خاموش ہو گیا تھا۔

"انشاء اللہ آپ کی اور ہم سب کی دعائیں قبول ہوں گی، اسے آپ کی دعاؤں کی بھی ضرورت ہے اور آپ کی بھی، یہ اور بات کہ ابھی وہ آپ کی ضرورت اور اہمیت سے ناواقف اور انجان ہے مگر ایسا ہمیشہ نہیں رہے گا، اطمینان رکھیں۔" مدھم لہجے میں منیزہ نے اسے تسلی دی تھی۔

☆......☆

طلوع ہوتے سورج کی روپہلی سنہری کرنیں اپنے ساتھ انتہائی خوش کن اور دل کو نہال کر دینے والی نوید لے کر کائنات میں انوکھے رنگ بھر گئی تھیں۔ فاطمہ اور صبیحہ کے سجدے طویل ہو گئے تھے، یہ حسین صبح زندگی کو ایک نیا خوبصورت رخ دے گئی تھی، مگر عارش کی جان تو اب تک سولی پر ہی تھی، جسم میں جان واپس آنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ خرمن کو قریب سے دیکھ لے، اب انتظار ناقابلِ برداشت تھا، اس کے سر پر تلوار اس وقت تک لٹکتی رہی تھی، جب خرمن کو روم میں شفٹ نہ کر دیا گیا۔ رکی سانسوں کے ساتھ وہ بے تابی سے اس کے قریب پہنچا تھا، جو اردگرد سے غافل نظر آ رہی تھی۔ چہرے کے گرد لپٹے سفید دوپٹے میں اس کا چہرہ انتہائی زرد اور نڈھال تھا، اپنے چہرے پر محسوس ہوتے محبت بھرے پُرحدت لمس نے اس کی غفلت کو توڑ دیا تھا، بمشکل اپنی سوجی آنکھوں کو کھولتے ہوئے اس نے خود پر جھکے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کی تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟" اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ تا وہ پوچھ رہا تھا۔

"بابا......؟" بس اس کے لبوں سے آہ نکلی تھی، اس کی آنکھوں سے پھسلتے قطروں نے عارش کا دل جکڑ لیا تھا۔

"وہ بہت خوش ہیں، تم ان کی خوشی کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔"

"پھر بھی وہ نہیں آئے؟" اس کے لبوں سے سسکی نکلی تھی۔

"وہ آئیں گے، میں لے کر آؤں گا ان کو۔" اس کے چہرے سے آنسو صاف کرتا وہ بولا تھا۔

"اب نہیں رونا، بالکل نہیں، جانتی ہو، تم نے مجھے کتنا انمول اور خوبصورت تحفہ دیا ہے، میں تو اب اس قابل بھی نہیں رہا ہوں کہ تمہارا شکریہ ادا کر سکوں۔" اس کے ہاتھ چومتے ہوئے وہ تشکر آمیز لہجے میں بولا تھا۔

"تم نے اسے دیکھا؟" خرمن کی آواز بہت کمزور تھی۔

"ہاں، مگر بس کچھ دیر کے لیے وہ بھی دور سے، وہ بہت کمزور ہے، اسے چند گھنٹوں کے لیے انتہائی نگہداشت میں رہنا تھا، میرے علاوہ اسے ابھی تک کسی نے نہیں دیکھا، یہاں بہت ظالم ڈاکٹرز ہیں، مجھے میرے بیٹے کے قریب بھی نہیں جانے دیا ہے۔" اس کے بے بس لہجے میں شکایت کرنے پر ہلکی سی مسکراہٹ خرمن کے چہرے پر نمودار ہو کر غائب ہوئی تھی، تب ہی دروازے پر ہوتی آہٹ پر وہ سرعت سے خرمن کے پاس سے اٹھا تھا، روم میں داخل ہونے والی نرس تھی، جس نے گلابی کمبل میں اس کی پوری کائنات کو اٹھا رکھا تھا، نرس کے قریب آنے کا انتظار کیے بغیر وہ تیزی سے آگے بڑھا تھا، جبکہ اس کی بے تابی پر نرس نے مسکراتے ہوئے بچے کو خرمن کی طرف لے جانے کے بجائے اس کے ہی ہاتھوں میں منتقل کر دیا تھا۔

"آپ کا بیٹا بہت خوبصورت ہے، اسٹاف کا ہر فرد باری باری اسے ایک نظر دیکھنے آ تا رہا ہے۔" نرس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور خرمن کی طرف بڑھ گئی تھی، جبکہ عارش کو تو جیسے کچھ سنائی ہی نہیں دیا تھا، پہلی بار اپنے بچے کو ہاتھوں میں لیتے ہی اس کا دل پگھلنے لگا تھا، بے تحاشہ محبتوں کا سمندر سینے میں ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا، سانس روکے، بغیر پلک جھپکے وہ اپنے بچے کے چہرے کو دیکھ رہا تھا، ننھا سا دہانہ، نازک نازک سے سرخ و سفید نقوش، چھوٹی سی ناک، ریشمی لانبی لانبی سی پلکیں، اس کا پھول سا چہرہ نور کے ہالے میں قید جگمگا رہا تھا، اس کی پیشانی کے عین وسط میں ہلکا سا دودھیا نشان پھیلا پھیلا سا تھا، اس کے معصوم خوابیدہ سانس لیتے وجود نے عارش کو یکدم اتنا جذباتی کر دیا تھا کہ بہت چپکے سے اس کی آنکھ سے ٹپکتا ایک گرم قطرہ بچے کے گلابی رخسار پر گرا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کہاں چھپا کر رکھے گا، بے اختیار بچے کے چہرے پر بوسہ لے کر عارش نے اسے اپنے سینے سے لگایا تھا، روم سے نرس کے نکلتے ہی وہ خرمن کی طرف آیا تھا اور بچے کو اس کے حوالے کر دیا تھا، عارش کے سامنے اپنے بچے کو گود میں لیتے ہوئے بھی اسے شرم سی محسوس ہو رہی تھی، اس کے زرد چہرے پر گلال بکھرنے لگے تھے، چھلکاتی نظروں سے بچے کو دیکھتی وہ اس کے روئی کے گالوں جیسے چہرے کو ہی چھو سکی تھی، اس کے نقاہت سے چور چہرے پر بکھرتی روشنی اور انوکھے رنگوں نے عارش کو مبہوت کر دیا تھا، دل و نظر کو مسحور کر دینے والے اس منظر سے بڑھ کر حسین منظر کوئی اور اس کائنات میں نہیں ہو سکتا تھا۔

"عارش! یہ واقعی بہت کمزور ہے۔" خرمن کی آواز نے اسے چونکایا تھا۔

"تم خود دیکھو!، مجھ پر تم غصہ کرتی تھیں، مگر میرا بیٹا میرے لیے کس قدر کڑھتا رہا تھا، اندازہ لگاؤ ذرا۔" عارش کے مسکراتے لہجے پر وہ بھی کھل کر مسکرائی تھی مگر اگلے ہی پل دروازے کی طرف متوجہ ہوئی تھی، عارش فوراً ہی فاطمہ کے استقبال کے لیے بڑھا تھا، اسے گلے سے لگا کر فاطمہ نے مبارکباد دی تھی اور پھر خرمن کی طرف بڑھ گئی تھیں، جبکہ عارش عروسہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا، جو اپنے بچوں کے ساتھ وہاں آ پہنچی تھیں۔ صبیحہ اور منیزہ کو وہاں نہ پا کر وہ باہر آیا تھا، وہ دونوں اسے کاریڈور میں نظر آئی تھیں۔

"عارش! آنٹی جانا چاہتی ہیں۔" منیزہ کی اطلاع پر اس نے دنگ ہو کر صبیحہ کو دیکھا تھا۔

”میں جانتی ہوں، تمہیں ابھی میرا جانا اچھا نہیں لگے گا، مگر میرا یہاں سے جانا ہی بہتر ہے، ہارون مجھے لینے آچکا ہے۔“

”مگر میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گا، آپ اسے دیکھے بغیر کیسے جاسکتی ہیں، آپ میرے ساتھ چلیں۔“ وہ قطعی لہجے میں بولا تھا۔

”عارش! آج اللہ نے تمہیں بہت بڑی خوشی سے نوازا ہے اور میں خوشی کے اس ماحول کو بگاڑنا نہیں چاہتی، تم جانتے ہو خرمن......“

”میں کچھ نہیں جانتا، میرے بیٹے کو دیکھنے کے لیے آپ کو خرمن کی اجازت کی ضرورت نہیں۔“ عارش نے فوراً ان کی بات کاٹی تھی۔ ”میں اسے یہیں لے آتا ہوں۔ اگر آپ اسے دیکھے بغیر یہاں سے گئیں تو آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔“

”ضد مت کرو عارش!، میں بچے کو ضرور دیکھوں گی، مگر خرمن کی بے خبری میں اس کی رضا کے بغیر نہیں، میں جانتی ہوں تم مجھ سے ناراض نہیں ہو سکتے، سمجھ سکتے ہو میری بات کو اس لیے ابھی مجھے جانے دو، میں بہت خوش ہوں، اتنی بڑی خوشی ساتھ لے کر یہاں سے جا رہی ہوں، کیا یہ کافی نہیں ہے فی الوقت؟“ مسکرانے کی کوشش کرتیں وہ بولی تھیں۔

”میرے لیے یہ کافی نہیں ہے۔“ شکایتی نظروں سے عارش نے ان کو دیکھا تھا جو نظر چرا گئی تھیں۔

”چلیں پھر میں آپ کو ہارون کے پاس لے چلتا ہوں۔“ بالآخر عارش کو ہتھیار ڈالنے پڑے تھے، مگر وہ ان کے چہرے سے ہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی، اتنی اذیت اور تڑپ کے طویل سفر کے بعد ان کی گمشدہ خوشیاں سود سمیت ان کو مل رہی تھیں، مگر طویل سفر سے زیادہ کٹھن تھا یہ وقت کہ وہ ان خوشیوں کو ہاتھ بڑھا کر چھو بھی نہیں سکتی تھیں۔

منیزہ خاموشی سے صبیحہ کو عارش کے ہمراہ جاتے دیکھتی رہی تھی، اس کے نزدیک صبیحہ کا فیصلہ بالکل درست تھا، وہ جانتی تھی خرمن کے مزاج کو، اس کا کوئی بھروسہ نہیں تھا، اگر خرمن کی طرف سے ان کو مزید کوئی تکلیف پہنچتی تو اس کی تلافی عارش بھی کرنے کی پوزیشن میں اس وقت نہیں تھا۔

☆......☆

برآمدے میں رک کے وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے، جو فاطمہ کو ہاسپٹل سے لے کر گھر آیا تھا، اس کے بے حد سنجیدہ چہرے سے احمد حسین کو اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ ان کی طرف سے کتنا دلگرفتہ ہے۔

”مامی! آپ کو جو چیزیں لینی ہیں، وہ لے آئیں، عروسہ آپی خرمن کو ہاسپٹل سے گھر لے جائیں گی، میں آپ کو ڈائریکٹ گھر ہی لے جاؤں گا۔“ احمد حسین کو صرف سلام کر کے وہ اسی سنجیدگی سے فاطمہ سے مخاطب ہوا تھا، جو تذبذب میں مبتلا احمد حسین کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

”خدا کا شکر ہے کہ وہ خیریت و عافیت کے ساتھ آج گھر جا رہی ہے، میں نے منیزہ سے کہہ دیا ہے کہ وہ خرمن کے گھر پر رکے گی، اس کے لیے اب فاطمہ کا جانا ضروری نہیں ہے۔“ اس کی جانب دیکھے بغیر احمد حسین بولے تھے۔

”مگر میں چاہتا ہوں کہ مامی اس کے قریب رہیں، اسے آپ کی اور مامی کی ضرورت ہے، وہ مامی سے الگ ہونے کے لیے تیار نہیں، آپ کم از کم مامی کو تو نہ روکیں۔“ وہ شدید تاسف سے بولا تھا۔

”اس سے کہو کہ اس کی ایک ماں نہیں ہے، جب تک وہ اپنی دونوں ماؤں کو ایک درجہ نہیں دے گی، ان کی ضرورت کا اسے احساس نہیں ہوگا، وہ ایک سے بھی محروم رہے گی، جب تک فاطمہ کا اس کے قریب رہنا ضروری تھا، میں خاموش رہا، مگر اب تم فاطمہ کو گھر لے جانے کی بات مت کرو، سب جانتے ہو تم، بے خبر نہیں ہو۔“ دل پر پتھر رکھ کر ان کو یہ کہنا پڑا تھا۔

”میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آپ سب کے فیصلوں اور تکرار میں میری حق تلفی ہو رہی ہے، کیا قصور ہے اس بچے کا جو پس رہا ہے سرد جنگ میں؟ آپ میرے لیے بھی اسے ایک نظر دیکھنے تک نہیں آئے، وہ میری بھی اولاد ہے، مگر آپ میری خاطر چند لمحوں کے لیے بھی اپنے فیصلے میں نرمی نہیں لا سکے۔“ بالآخر آج عارش کا ضبط ختم ہوا تھا جو وہ پھٹ پڑا تھا۔ ”میری بیوی زندگی اور موت کے درمیان سے گزری ہے، اگر اسے یا میرے بچے کو کچھ ہو جاتا تب بھی آپ خود پر پہرے لگائے رکھتے، چہرہ تک نہیں دیکھتے ان دونوں کا؟“

”ایسا مت کہو عارش! ایسی باتیں زبان پر بھی نہیں لاتے۔“ فاطمہ نے دہل کر اسے ٹوکا تھا۔

”میں اور کیا کروں مامی! پریشان ہو چکا ہوں میں ان حالات سے، میں خوش بھی نہیں ہو پا رہا، کتنا بدقسمت ہے وہ بچہ کہ کوئی اس کا چہرہ تک دیکھنے کا روادار نہیں ہے، اس کے لیے بھی اصول نہیں توڑے جا سکتے۔“ سرخ چہرے کے ساتھ بولتا وہ رکا نہیں تھا۔

”عارش! رک جاؤ۔“ فاطمہ تڑپ ہی تو اٹھی تھیں، مگر وہ ان کی پکار پر بھی نہیں رکا تھا۔

”وہ ٹھیک ہی تو کہہ گیا ہے، وہ کب تک یہ سب برداشت کرے گا، بچے کو ایک نظر بھی آپ دیکھنے نہیں گئے، حالانکہ عارش خود آپ کو لے جانے یہاں آیا تھا، آپ کے انکار نے کتنا دکھ پہنچایا ہے اسے اور اب اس کے سامنے مجھے بھی روک کر حد کر دی ہے آپ نے۔“ شکایتی لہجے میں بولتے ہوئے فاطمہ آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

”میں سب جانتا ہوں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں نے کس طرح خود پر جبر کیا ہوا ہے، اگر اس وقت میں کمزور پڑ گیا تو میری ساری کوششیں بے ثمر رہیں گی، کیا چہرہ دکھاؤں گا میں ان دو انسانوں کو جن کی کڑی آزمائشوں کے سامنے عارش کا دکھ، میرا صبر اور تمہاری تڑپ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔“ احمد حسین بجھے بجھے لہجے میں بولے تھے۔

”میں جانتی ہوں کہ آپ یہ سب کس کے لیے کر رہے ہیں، مگر میں اب خرمن سے اس کے بچے سے اور عارش سے لاتعلق ہو کر نہیں رہ سکتی۔“ فاطمہ کی بھرائی آواز پر احمد حسین نے ان کو دیکھا تھا اور پھر تھکے تھکے انداز میں تخت کے کنارے بیٹھ گئے تھے۔

”فاطمہ! تم نے زندگی کے ہر کٹھن دور میں میرا ساتھ دیا ہے، اب اگر اپنی اولاد کی وجہ سے تم یہ کام نہیں کر سکتیں تو مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی، تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ، میں زبردستی تمہیں نہیں روک سکتا۔“

”اب اگر میں جاؤں گی تو آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی، ورنہ کس طرح عارش کا سامنا کروں گی؟“ فاطمہ بولی تھیں اور پھر فوراً کمرے کی جانب بڑھ گئی تھیں۔

☆......☆

گیٹ کھول کر ایک طرف ہٹتے ہوئے اس نے عثمان کو اندر آنے کا راستہ دیا تھا۔

”اچھا ہوا تم آ گئے، عارش کا موڈ ابھی تک خراب ہے، وہ زبردستی منیزہ کو اس کے گھر لے جا رہا ہے،

جبکہ وہ خرمن کے پاس رکنے پر مصر ہے۔" بیلا نے عجلت میں اسے اطلاع دی تھی۔ حیران ہوتا وہ لاؤنج میں آیا تھا، جہاں منیزہ شدید ناراضی سے عارش کو گھور رہی تھی۔

"عارش! یہ کیا سن رہا ہوں میں، تم زبردستی پر اتر آئے ہو، وڈیرے کے بیٹے ہو رہے ہو بالکل۔" غیر سنجیدگی سے عثمان نے اسے گھرکا تھا۔

"میں تم سے کہہ چکا ہوں، تم یہاں نہیں رکو گی، تم کسی کے حکم کی پابند نہیں ہو۔" عثمان کی بات نظر انداز کیے وہ بہت سنجیدگی سے منیزہ سے مخاطب تھا۔

"عارش! وہ اپنی مرضی سے یہاں رکنا چاہتی ہے، تم کیوں اسے یہاں سے بھیجنے پر بضد ہو؟" بیلا نے ناراضی سے کہا تھا۔

"اس کی جان اپنے بھائی کی بچی میں اٹکی ہے، مگر یہ پھر بھی یہاں رکنے پر بضد ہے، کیا میں جانتا نہیں ہوں اس کی وجہ؟" عارش بگڑتے تاثرات کے ساتھ بولا تھا۔

"تم چچا جان کا غصہ مجھ پر مت اتارو، میں خود یہاں تمہارے بیٹے کے لالچ میں رک رہی ہوں، تمہاری بیوی کو بچے سنبھالنے ہی کہاں آتے ہیں، وہ میرے بغیر کیسے رہے گا؟" منیزہ تنک کر بولی تھی جبکہ عثمان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"بول تو اس طرح رہی ہو جیسے درجن بھر بچوں کی پرورش کرنے کا تجربہ تمہارے پاس ہے۔" عثمان نے کہا تھا۔

"تم سیدھی طرح میرے ساتھ چل رہی ہو یا نہیں؟" عارش زچ ہوا تھا۔

"میں نہیں جاؤں گی، شرم نہیں آتی تمہیں، مجھے اپنے گھر سے نکال رہے ہو۔"

"تم ایسے نہیں مانو گی۔" عارش اس کی جانب بڑھا تھا۔

"میں خرمن کو جگا کر تمہاری شکایت کر دوں گی عارش!" اسے دھمکاتے ہوئے وہ چیخی تھی، مگر عارش اس کا ہاتھ پکڑ چکا تھا۔

"کھڑے کھڑے انجوائے کر رہے ہو، روکو اسے۔" اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی وہ عثمان پر چیخی تھی۔

"میں کیوں روکوں، میں تو چاہتا ہوں، ہارون یہ منظر دیکھیں اور انگاروں پر غلاٹیاں کھائیں۔" عثمان اطمینان سے بولا تھا۔

"بتاؤں ابھی تمہیں، بنگی۔" منیزہ پھر چیخی تھی۔

"خواہ مخواہ چیخنا مت مجھ پر، چیخنے کا حق چاہیے تو پہلے اپنے جملہ حقوق میرے نام ٹرانسفر کرو۔" وہ بگڑا تھا۔

"عثمان!" بیلا نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے اس کے مسکراتے چہرے کو گھورا تھا۔

"کیوں میرا امیج خراب کر رہی ہو، خاموشی سے چلو، کل خود تمہیں یہاں لے آؤں گا۔" منیزہ کی ڈھٹائی پر عارش نے اسے گھرکا تھا۔

"میں نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی، مجھے چھوڑ دو ورنہ تمہارے ہاتھ پر کاٹ لوں گی۔" منیزہ کی وارننگ پر بیلا اپنی ہنسی نہیں روک سکی تھی۔

"اس کا میٹر گھوما ہوا ہے، دھمکیاں دینے کے بجائے پیار سے راضی کر لو آئی لو یو کہہ کر۔" عثمان نے

خشمگین لہجے میں منیزہ کو مشورہ دیا تھا۔

"مانی! اس وقت مذاق نہیں۔" عارش نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ "یہ یہاں نہیں رکے گی کیونکہ......"

"ٹھیک ہے، اب میں بھی سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں کہ تمہاری منت سماجت کے باوجود میں یہاں نہیں آؤں گی۔" عارش کی سنجیدگی نے منیزہ کے تیور بگاڑے تھے۔

"کہہ تو رہا ہوں کل آجانا۔"

"تم جب چاہو گے مجھے اپنے گھر بلاؤ گے، جب چاہو گے نکال دو گے، اندھیر مچا کر رکھی ہوئی ہے، اپنے مسئلوں میں مجھے کیوں گھسیٹ رہے ہو، جہنم میں جاؤ۔" غصیلے لہجے میں وہ اپنا بیگ اٹھاتی عارش سے پہلے ہی آگے بڑھ گئی تھی۔

"کل میں تمہیں پک کرنے پہنچ جاؤں گا، ہارون کے ساتھ۔" عثمان نے پیچھے سے منیزہ کو آواز لگائی تھی۔

"تمہاری ان ہی حرکتوں کی وجہ سے آج تک کسی لڑکی نے تم سے آئی لو یو نہیں کہا۔" عثمان نے اسے لتاڑا تھا جو ناگوار نظروں سے اسے دیکھتا منیزہ کے پیچھے جا رہا تھا۔

"عارش کو سمجھانے کے بجائے تم اپنی ہی ہانکتے رہے، کیا سوچ رہی ہو گی منیزہ۔" بیلا ناگواری سے بولی تھی۔

"ابھی تو وہ غصے میں کھول رہی ہو گی۔"

وہ ڈھٹائی سے ہنستا صوفے پر براجمان ہوا تھا۔

"جا کر استانی کو بتاؤ میں اس کے دیدار کے لیے آیا ہوں، اور عارش کے جانشین کو بھی اٹھا لاؤ، میں نے اسے ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں ہے۔"

"تمہارے پاس تو مجھے بھی دیکھنے کا وقت نہیں۔" بیلا نے رک رک کر اسے جتایا تھا۔

"میں اس وقت بھی تمہیں دیکھ سکتا ہوں اگر تم آنکھیں بند کر کے مراقبے میں نہ جانے کا وعدہ کرو۔"

عثمان کی خشمگین نظروں پر وہ بمشکل ہنسی روکتی بیڈ روم کی سمت بڑھ گئی تھی۔

☆......☆

بغیر کسی آہٹ کے احتیاط سے کمرے میں داخل ہوتا وہ چونکا تھا، کیونکہ خرمن بیڈ پر نہیں تھی۔ تب ہی وہ ٹاول سے بھیگا چہرہ صاف کرتی واش روم سے باہر آتی دکھائی دی تھی۔

"عثمان اور بیلا جا چکے ہیں کیا؟" اس سے نظر ملائے بغیر وہ پوچھ رہی تھی۔

"ہاں کافی رات جو ہو چکی ہے، مجھے یہی لگا کہ تم سو رہی ہو گی۔" بغور اسے دیکھتا وہ اس کے قریب آنے کا منتظر تھا، اس کی بے تحاشا متورم سرخ آنکھوں نے عارش کو حیران نہیں کیا تھا۔

"میں بہت دیر سے سو رہی تھی پھر کچھ دیر پہلے اچانک آنکھ کھل گئی۔" لہجے کو سرسری رکھتے ہوئے اس نے چونک کر نگاہ اٹھائی، مگر زیادہ دیر تک عارش کی گہری سنجیدہ نظروں میں نہیں دیکھ سکی تھی، اس کی پیشانی پر چپکے نم بال سمیٹتے ہوئے عارش نے دھیرے سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تھا۔

"اس طرح بات بنا کر تم دوسروں کی آنکھوں پر پردہ ڈال سکتی ہو، مگر میں یہ دیکھ سکتا ہوں کہ کمبل میں چہرہ چھپا کر تم سو نہیں رہی تھیں۔" اس کی آنکھوں میں پھیلی نمی دیکھتا وہ بولا تھا۔ "کیوں رو رو کر خود پر ظلم کرتی

رہی ہو؟"

"وہ یہ تک دیکھنے نہیں آئے کہ میں زندہ بھی ہوں یا نہیں۔" اس کے لرزتے لہجے پر عارش نے اس کے چہرے پر بکھرتی اذیت کو دیکھا تھا اور پھر گہری سانس لیتے ہوئے اسے اپنے قریب کیا تھا۔

"وہ میرا چہرہ بھی نہ دیکھتے، مگر میرے بچے کو تو اپنے سائے سے محروم نہ رکھتے۔" اس کی آنکھوں سے کئی آنسو پھسلتے عارش کے گریبان میں جذب ہوئے تھے۔

"تم بھی تو ان کے لیے خود پر جبر کرتی رہی ہو، یہ یاد رکھو کہ اگر تم ان کی بیٹی ہو تو وہ تمہارے باپ ہیں۔" عارش کے سنجیدہ لہجے پر اس نے تیزی سے سر اٹھایا تھا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

"کچھ نہیں۔" عارش نے اسے شانوں سے تھاما تھا۔ "بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تم تنہا نہیں ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں، لہٰذا ایسی غمگین صورت بنائے رکھ کر مجھے اس خوشی کو محسوس کرنے سے نہ روکو جو تمہاری وجہ سے مجھے ملی ہے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ دھیرے سے مسکرایا تھا اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر بیڈ تک لے گیا تھا، خاموشی سے وہ بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی تھی، جبکہ عارش کاٹ کی سمت بڑھ گیا تھا اور احتیاط سے بچے کو کاٹ میں سے اٹھا کر واپس خرمن کی طرف آ گیا تھا۔ بچے کے خوابیدہ معصوم چہرے کو تکتے ہوئے عارش کے چہرے پر روشن مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"یہ اتنا پیارا ہے کہ میری نظریں اس پر سے نہیں ہٹتیں، تم اس کی نظر اتارتی رہا کرو، ویسے بھی جھاڑ پھونک میں تم ماہر ہو۔" اس کے کہنے پر وہ بس مسکراتے ہوئے اسے دیکھتی رہی تھی، جو بچے کے نرم گرم رخساروں کو چوم رہا تھا۔

"یہ آنکھیں کیوں نہیں کھولتا ہے، میں ترس رہا ہوں اس کی آنکھوں کا رنگ دیکھنے کے لیے۔"

"ابھی یہ تین دن کا ہی تو ہے، اسے ابھی روشنی کی عادت نہیں ہوئی ہے۔" خرمن نے اس کی الجھن دور کی تھی۔ "یہ اس وقت سو نہیں رہا مگر آنکھیں کھولنے سے ڈر رہا ہے، تم اس کی آنکھوں کو روشنی سے بچاؤ پھر یہ آنکھیں کھول سکے گا۔"

"واقعی؟" عارش نے کچھ حیرت سے کہتے ہوئے اپنے ہاتھ کی چوڑی ہتھیلی کو بچے کی آنکھوں کے اوپر اس طرح لگایا کہ روشنی ان تک نہ پہنچ سکے، چند لمحوں میں ہی بچے کی بند آنکھوں میں حرکت ہوئی تھی، عارش کا دل خوشی سے چہچہا اٹھا تھا جب بچے نے پلکیں جھپکاتے ہوئے اسے اپنی آنکھوں کا دیدار کروا دیا تھا۔

"خرمن! اس کی آنکھیں تو بالکل تمہاری طرح ہیں۔" نہال ہو کر عارش نے بچے کی آنکھوں کو چوم لیا تھا۔

"مگر سب تو کہہ رہے ہیں یہ بالکل تمہاری طرح ہے اور عثمان تو شکر ادا کر رہا تھا کہ یہ مجھ پر نہیں تم پر گیا ہے۔" وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بتا رہی تھی۔

"یہ تم پر جائے یا مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ ہے ہماری اولاد۔"

"تمہیں بیٹی چاہیے تھی۔" خرمن نے یاد دلایا تھا۔

"ہاں، یہ تو ہے، مگر کوئی بات نہیں میں اس کے لیے کچھ انتظار تو کر ہی سکتا ہوں۔" اس کی مسکراتی معنی خیز نظروں پر وہ کچھ جھینپ سی گئی تھی۔

"پتہ ہے میں جب جب اس کے رونے کی آواز سنتا ہوں، میرا خون سیروں بڑھتا ہے اور جب میں اسے تمہاری گود میں دیکھتا ہوں تو لگتا ہے سب کچھ مکمل ہے، کہیں کوئی کمی نہیں ہے، اپنے بیٹے کو دیکھنے کے بعد میرے دل میں اپنے ماں باپ کے لیے محبت مزید بڑھ گئی ہے، وہ بھی تو میرے لیے اپنے دل میں وہی محبت اور احساسات رکھتے ہوں گے جو کہ میرے دل میں اپنے بچے کے لیے ہیں۔" وہ عجیب سی کیفیت میں بول رہا تھا جبکہ خرمن بس خاموشی سے اس کے چہرے پر پھیلتے اجالوں کو دیکھتی رہی تھی۔ "وہ بھی میری طرح اپنی اولاد کے لیے بہت حساس ہوں گے، وہ بھی مجھ سے جدا ہونا نہیں چاہتے ہوں گے، مگر پھر بھی اللہ کی رضا میں راضی ہو کر وہ دونوں مجھ سے جدا ہو گئے، میری نظر میں تم بہت قابلِ رشک ہو خرمن! تمہارے پاس ایسے والدین ہیں جن سے تمہارا تعلق زندگی اور سانس جیسا ہے اور وہ ماں باپ بھی اب تمہاری زندگی میں ہیں، جن سے تمہارا تعلق روح اور جسم کا سا ہے، انسان ترستا ہے ان عظیم رشتوں کے لیے مگر اللہ تم پر بہت مہربان ہے۔" گہرے لہجے میں بولتا وہ بغور اس کے تنے تاثرات کو دیکھ رہا تھا۔

"بات کا رخ اس جانب نہ لے جاؤ جہاں میں نظر بھی نہیں ڈالنا چاہتی۔" وہ سرد لہجے میں بولی تھی۔ "تم ہمہ وقت ان سب کی دعاؤں کے حصار میں رہ رہی ہو، ان کو اور اذیت میں مت ڈالو، مت تڑپاؤ ان کو، مجھے خدشہ ہے کہ ان کے دل سے نکلی آہ آسمان تک پہنچ گئی تو......"

"ان سے پہلے میری آہیں آسمان تک پہنچتی رہی ہیں، کسی کا کیا گیا بری تو اب بھی میں ہی ہوں۔ محروم تو آج بھی مجھے ہی کیا گیا ہے، اللہ کی ناراضی کا خدشہ کسی اور کے دل میں کیوں بیدار نہیں ہوا۔" وہ یکدم ہتھے سے اکھڑی تھی۔

"تمہارا بس ایک عمل تمام محرومیوں کو ختم کر سکتا ہے خرمن! اور ان محرومیوں کو بھی جو تمہارے بیٹے کے حصے میں بھی آ رہی ہیں۔" بالآخر وہ یہ کہہ گیا تھا۔

"اگر تمہیں لگتا ہے کہ میری وجہ سے تمہاری اولاد محروم ہو رہی ہے، میری وجہ سے اللہ کا قہر تمہارے گھر پر نازل ہو سکتا ہے تو نکال دو مجھے اپنی زندگی سے، ختم کر دو مجھ سے ہر تعلق۔" اس کے بپھرے لہجے پر وہ ساکت نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

"جن سے توقع نہیں تھی جب وہ مجھے چھوڑ سکتے ہیں تو تم سے کیا توقع رکھ سکتی ہوں۔"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے، میں وہ انسان ہی نہیں جس سے تم توقعات وابستہ رکھ سکو، تمہیں مجھ سے یہ توقع نہیں کہ میں ساری زندگی تمہارا وفادار بن کر رہوں، تمہیں مجھ سے یہ توقع بھی نہیں کہ دنیا ایک طرف ہو جائے مگر میں تمہارا ساتھ دیتا رہوں گا، تمہیں تو یہ توقع بھی نہیں کہ کبھی تمہارے دل میں میری محبت اور ضرورت گھر کر سکتی ہے، یہ سب تم مجھے پہلے ہی بتا چکی ہو، بار بار میری گردن پر کند چھری مت پھیرا کرو۔" سرد لہجے میں بول کر اس نے بچے کو خرمن کے قریب لٹایا تھا اور خود کسی بھی جانب دیکھے بغیر کمرے سے نکل گیا تھا۔ دوسری جانب خرمن ناگواری سے سر جھٹکتی بچے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

☆......☆

رسٹ واچ میں وقت دیکھتا ہو بیزاری سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"بیلا اور کتنا وقت لگے گا، ایک گھنٹے سے تیار بیٹھا ہوں، مگر تمہاری تیاریاں مکمل نہیں ہو رہیں۔" کمرے کی سمت آواز اس نے لگائی تھی مگر جواب ندارد، بیزاری سے وہ دوبارہ ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ

ہوا تھا، جہاں ہیڈ لائنز چل رہی تھیں، آج اسے بیلا کے ہمراہ اپنے کزن کی شادی میں شرکت کرنی تھی، اپنی مصروفیات کے پیش نظر وہ دیگر تقریبات میں شرکت نہ کر سکا تھا، مگر ولیمے کی اہم تقریب تھی اس میں تو بہر حال اس نے جانا ہی تھا، بہت آہستہ آہستہ ہی سہی مگر اپنے چند قریبی ریلیٹوز سے اس کے تعلقات پہلے جیسے ہو گئے تھے۔ پہل ظاہر ہے کہ عثمان کی طرف سے نہیں ہوئی تھی، اس کے خاندان کا کوئی فرد گھر آتا تو بیلا بہت خوش اخلاقی اور گرمجوشی سے استقبال کرتی تھی، لہٰذا عثمان کے رشتہ داروں کو اس کی غیر موجودگی اور مصروفیات کی وجہ سے کوئی شکایت نہیں ہوتی تھی، آج کے لیے بیلا نے پہلے ہی سے اسے ہدایت دے دی تھی کہ آج کے دن وہ کوئی مصروفیت نہ رکھے، شادی میں اسے لازمی جانا ہے، کیونکہ اس کے جس کزن کا ولیمہ تھا، وہ عثمان کا نہ صرف اچھا دوست تھا بلکہ وہ انویٹیشن لے کر خود عثمان کی موجودگی میں گھر آیا تھا۔

ایک ہاتھ میں سینڈلز اور دوسرے ہاتھ میں جیولری باکس پکڑے وہ کمرے سے نکلی تھی، مگر پھر دیوار گیر آئینے کے سامنے رک کر اپنے میک اپ اور لباس کا جائزہ لینے لگی تھی۔

''اس آئینے کو اکھاڑ کر ساتھ لے چلو۔'' عثمان کی جھلائی آواز پر وہ ہڑبڑاتی ہوئی تیزی سے اس کی طرف آئی تھی اور سینڈلز اسے تھما کر خود ٹیبل کے کنارے بیٹھ گئی تھی۔

''ان کا کیا کروں، اپنے سر پر مار لوں؟'' وہ مزید جھلایا تھا۔

''یہ کام کسی دن میں خود کر دوں گی، ابھی یہ پہنا دو، پہلے ہی اتنی دیر ہو چکی ہے۔'' اس کی عجلت بھری ہدایت پر وہ کوفت سے اسے دیکھتا پنجوں کے بل بیٹھا تھا اور سینڈلز پہنانے شروع کر دیے تھے۔

''ذرا پیار سے پہنا دو، ابھی میری جگہ تمہاری کوئی پرستار ہوتی تو یہ کام کرتے ہوئے چہرہ کھلا پڑ رہا ہوتا تمہارا۔'' کانوں میں آویزے پہنتے ہوئے بیلا نے اسے لتاڑا تھا۔

''اب میں سینڈل کو چوم کر تو پہنانے سے رہا، مجھے کیا معلوم تھا، شوہر بننے کا یہ خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔'' ہاتھ جھاڑتا وہ بیزاری سے اٹھا تھا۔

''زیادہ مت بولو، باہر کی دنیا میں تم جتنی بھی شہرت اور نام کما لو، گھر میں تم شوہر ہی ہو اور تمہیں شوہر بن کر ہی رہنا پڑے گا، اب پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا، سمجھے۔'' بیلا کے جتانے والے انداز پر اسے زیادہ حیران ہونے کا موقع نہیں ملا تھا، کیونکہ سیل فون چیخ اٹھا تھا۔

''جب تک ہم واپس نہیں آ جائیں گے استانی کو چین نہیں ملنے والا۔'' خشمگین لہجے میں بولتے ہوئے اس نے خزمن کی کال ریسیو کی تھی، جبکہ بیلا مسکراتے ہوئے اپنا دوپٹہ سیٹ کرنے لگی تھی۔

''تم دونوں ابھی تک گھر سے نکلے بھی نہیں اتنا وقت لگا کر جاؤ گے تو آؤ گے کب؟'' خزمن نے گھرکا تھا۔

''اگر ایسا ہوا تو تمہاری بیسٹ فرینڈ کی وجہ سے ہو گا۔'' عثمان نے قریب ہی موجود بیلا کے بال مٹھی میں جکڑے تھے جبکہ وہ صدمے سے چیخی تھی۔

''کیا ہوا ہے بیلا کو؟'' خزمن نے دہل کر پوچھا تھا۔

''کیا ہوا ہے بھئی، کیوں چیخ رہی ہو؟'' مسکراتی نظروں سے عثمان نے اسے دیکھا تھا جو اس کا ہاتھ جھٹکتی بال ٹھیک کرنے آئینے کی جانب دوڑی تھی۔

''میں آخری بار کہہ رہی ہوں عثمان! زیادہ رات تک وہاں نہ رکنا، مجھے تم سے زیادہ بیلا کی فکر ہے۔''

''بیلا اپنے ساتھ ایک باڈی گارڈ لے جا رہی ہے، تم اس کی امی نہ بنو۔''

''اس کی نہ سہی، تمہاری تو روحانی ماں ہو، ویسے بھی تمہاری والدہ محترمہ تمہاری باگیں میرے ہاتھوں میں دے چکی ہیں۔''

''ہاں جانتا ہوں، ایک تم ہو اور تمہارا شوہر ہے، تم دونوں کی وجہ سے میں آزادی کے ساتھ اپنی بیوی کو باہر تک نہیں لے جا سکتا۔'' وہ جل کر بولا تھا۔

''جاؤ پھر آزادی کے ساتھ، دوبارہ تمہارے ساتھ بیلا کی تصویریں چھپیں تو اس کے بھائی کے ہاتھوں تمہارے قتل کی تصویر بھی اخباروں میں چھپ جائی گی یاد رکھنا۔''

''کبھی اچھی بات منہ سے نہ نکالنا، ہمیشہ کنویں میں دھکیلنے والے کام کرنا۔'' عثمان نے مزید جل کر کہا تھا جبکہ وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

''میرا اچھوٹو کیا کر رہا ہے؟''

''وہ ٹھیک ہے میری نیندیں اڑا کر۔'' وہ بولی تھی۔

''اس سے کہو اپنے باپ کی نیندیں اڑائے، ویسے ہیں کہاں حضرت؟''

''اسے انسٹیٹیوٹ سے منیزہ کی طرف جانا تھا، وہیں گیا ہوا ہے اسے منانے۔''

''ابھی تک عارش سے ناراضی چل رہی ہے اس کی مجھے اجازت دے دو، دو منٹ میں ہنستی مسکراتی تمہارے گھر آ جائے گی۔''

''اسی لیے اجازت نہیں دے رہی۔'' خزمن کے خشمگین لہجے پر وہ ہنسا تھا۔

''اچھا سنو! تقریب میں ظاہر ہے کہ عروسہ آپی اور فاروق بھائی بھی ہوں گے، تم کوشش کرنا کہ بیلا کسی طرح عروسہ آپی کے پاس جا کر سلام دعا کر لے۔''

''ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا تھا، مگر میں صرف کوشش ہی کر سکتا ہوں، بیلا کو ان کے پاس جانے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا۔'' آئینے کے سامنے کھڑی بیلا کو دیکھتا ہوا بولا تھا۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ ان دونوں کا ٹکراؤ ریسپشن پر ہی عروسہ اور فاروق سے ہو گیا تھا، بیلا نے دوبارہ ان دونوں کی جانب نگاہ نہیں ڈالی تھی، چہرے کے بدلے تاثرات کے ساتھ وہ عثمان سے پہلے ہی آگے بڑھ گئی تھی کہ فاروق کی کڑی نظروں نے اس کے خون کو رگوں میں کھولا دیا تھا، دوسری جانب عروسہ کو دیکھنے کے بعد عثمان کے لیے ناممکن تھا کہ ان کو نظر انداز کر سکتا، اپنے شوہر کی موجودگی میں وہ اک نگاہ بھی اس پر یا بیلا پر نہیں ڈال رہی تھی، عثمان کو اندازہ ہو گیا تھا اور یہی چیز غم سے زیادہ اسے غصے میں مبتلا کر رہی تھی۔ ارد گرد پھیلی رونقوں، چہل پہل اور کزنز کے درمیان مصروف ہونے کے باوجود عروسہ اس کی نظروں میں تھیں، زیادہ دیر تک وہ اپنے دل و دماغ میں ابھرتی خواہش کو رد نہیں کر سکا تھا، لہٰذا ایک فیصلہ کرتا وہ بیلا کی جانب بڑھ گیا تھا۔

''میں چاہتا ہوں تم ان کے پاس جاؤ، میری خاطر، اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ زیادہ ناراضی کا اظہار نہیں کر پائیں گی۔'' اس کے سنجیدہ لہجے پر بیلا نے دنگ نظروں سے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہوا ہو۔

''مجھے ان کے پاس جا کر مزید ذلت نہیں اٹھانی، اتنے لوگوں میں ان کے شوہر بھی ہیں، تم یہ بھول سکتے ہو مگر ان کو یہ یاد ہو گا، تم کیا چاہتے ہو یہ مجھے مت بتاؤ، میں ان کے قدموں میں بیٹھنے کے لیے یہاں تک نہیں آئی۔'' غصیلے لہجے میں بیلا نے کہا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر میں ہی ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔“

”عثمان! اگر تم اس عورت کے پاس گئے تو میں تمہیں بخشوں گی نہیں۔“

”وہ عورت میری بہن ہے۔“ وہ اس پر غرایا تھا۔

”اگر مجھے ذرا بھی خبر ہوتی کہ تم یہاں ان کو دیکھ کر ہی پاگل ہو جاؤ گے تو میں یہاں تماشا بننے کے لیے نہیں آتی۔“ اس کے تیور دیکھتے ہوئے بیلا کو اپنا غصہ ضبط کرنا پڑا تھا، مگر وہ مزید اس کی کوئی بات سنے بغیر اس جانب بڑھ گیا تھا، جہاں عروسہ اسے دکھائی دے رہی تھی، فاروق کہاں تھے، اس نے نہ دیکھنے کی کوشش کی تھی نہ ہی اسے ان کی پرواہ تھی۔

وہ اچانک ہی ان کے سامنے آ تا اس طرح راستہ روک گیا تھا کہ عروسہ فوری طور پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کر سکی تھیں، مگر اگلے ہی پل ان کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا تھا، کچھ ہی فاصلے پر ان کو فاروق دکھائی دے رہے تھے جو اسی جانب متوجہ تھے۔ وہ کترا کر نکل جانا چاہتی تھیں کہ عثمان دوبارہ ان کے سامنے آ گیا تھا۔

”آپی! آپ بے شک مجھے معاف نہ کریں مگر مجھ سے بات تو کریں، آپ کی اجازت کے بغیر تو میں نے وہ قدم نہیں اٹھایا تھا۔“

”اس اجازت کی سزا کسی کو تو جھیلنی تھی، جھیلنے دو مجھے، ہٹو میرے راستے سے۔“ لرزتے لہجے میں بولتے ہوئے انہوں نے پھر کترا کر نکلنا چاہا تھا مگر۔

”یہ سزا آپ صرف اپنے شوہر کی خاطر جھیل رہی ہیں اور مجھے بھی دے رہی ہیں۔“ وہ مشتعل ہونے لگا تھا۔

”میں ان کے خلاف ایک لفظ نہیں سنوں گی۔“

”میں بولوں گا، ان کی وجہ سے آپ میرے لیے اجنبی بن گئی ہیں، آپ کے شوہر نے نہیں، آپ نے مجھے مار دیا ہے۔“

”جب یہ جانتے ہو تو دور کیوں نہیں ہو جاتے میری نظروں سے۔“ غصیلے لہجے میں بول کر وہ آگے نکل جانا چاہتی تھیں کہ عثمان نے سختی سے ان کا بازو تھام کر روکا تھا۔

”بہت برداشت کر چکا ہوں، اب اور نہیں۔“ اردگرد کی پروا کیے بغیر وہ غرایا تھا، عروسہ کا چہرہ بس ایک پل کے لیے فق ہوا تھا، مگر اگلے ہی پل شدید غصے میں ان کا زناٹے دار تھپڑ عثمان کے چہرے سے ٹکرا گیا تھا، سناٹے میں گھرا وہ ان کو دور جاتا دیکھتا رہا تھا، کس کس نے یہ منظر دیکھا وہ جاننا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے بعد وہ رکا نہیں تھا، سرخ چہرے کے ساتھ جارحانہ قدموں سے وہاں سے جاتے ہوئے اس نے رکے بغیر ساکت کھڑی بیلا کا ہاتھ گرفت میں لیا تھا اور اسے ساتھ ہی لیتا سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

☆......☆

لاؤنج میں وہ ساکت بیٹھی اب تک صدمے میں تھی، بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے وہ ایک ہی منظر آ رہا تھا، دل میں دھواں سا بھرنے لگا تھا، عروسہ نے وہ تھپڑ عثمان کے چہرے پر نہیں اس کے دل پر مارا تھا، عثمان کی جامد خاموشی اور سپاٹ چہرے نے اس کی اپنی زبان بھی بند کر ڈالی تھی، فی الوقت ان دونوں کے لیے ہی ایک دوسرے سے کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ مگر عثمان کی گم صم کیفیت اسے ہولائے جا رہی تھی، واپسی کے دوران ہی اس نے اپنے ہواسوں پر قابو پاتے ہوئے چپکے سے عارش کو میسج send کر دیا تھا، عثمان کو اس وقت وہی سنبھال سکتا تھا، عارش کو اپنے گھر کے باہر ہی منتظر دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی تھی، عثمان کے کار پارکنگ سے واپس لوٹنے تک اس نے باہر کھڑے کھڑے ہی ساری بات مختصراً عارش کے گوش گزار کر دی تھی، اس کے بعد وہ تو گھر کے اندر چلی گئی تھی، مگر عثمان کو عارش نے باہر ہی روک لیا تھا، تب سے اب تک وہ عثمان کے آنے کا انتظار ہی کر رہی تھی، مگر اب اتنی دیر گزر جانے کے بعد اس کا اضطراب حد سے بڑھنے لگا تھا، صبر ترک کر کے بالآخر وہ گھر سے باہر آئی تھی۔ گرلز کے قریب ہی وہ کرسی پر موجود تھا، سگریٹ کے کئی ٹکڑے فرش پر بکھرے ہوئے تھے، آگے بڑھ کر بیلا نے اس سے جلتی سگریٹ لے کر دور پھینک دی تھی، وہ چونکا تھا مگر کچھ بولا نہیں تھا۔

”بہت رات ہو چکی ہے اب اندر چلو۔“ اس کے نرم لہجے پر وہ خاموشی سے اٹھا تھا اور اندر چلا گیا تھا، گیٹ لاک کرنے کے بعد تمام لائٹس آف کرتی وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی، تکیے میں چہرہ چھپائے وہ جوتوں سمیت بیڈ پر دراز تھا، خاموشی سے اس کے جوتے اتارتے ہوئے بیلا کی تشویش بڑھنے لگی تھی کیونکہ عثمان نے اسے نہیں روکا تھا اور اس کا مطلب یہی تھا کہ عارش بھی اس کے صدمے کی شدت کو کم نہیں کر سکا ہے، لائٹ آف کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ فی الحال وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دے مگر اس کا دل راضی نہیں ہوا تھا۔

”مانی! مجھ سے بات کرو، مجھے گھبراہٹ محسوس ہو رہی ہے۔“ اس کے شانے کو چھوتے ہوئے بیلا کی آواز بھرانے لگی تھی، وہ اٹھا نہیں تھا مگر اپنے چہرے کا رخ اس کی جانب کر لیا تھا، اس کی سرخ آنکھوں اور چہرے پر پھیلے کرب نے بیلا کو تڑپا دیا تھا، خاموشی سے وہ اسے دیکھ رہا تھا، جو اس کے ہاتھ کو چوم رہی تھی۔

”مجھے اس بات کا دکھ نہیں کہ بھری محفل میں انہوں نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا، ان کو حق ہے، غم تو صرف اس بات کا ہے کہ انہوں نے اپنے شوہر کی وجہ سے ان کے ہی سامنے مجھے تھپڑ مارا، دنیا کی مجھے پرواہ نہیں، مگر انہوں نے اپنے شوہر کے سامنے کیوں؟“ مدھم مگر کربناک ٹوٹے لہجے میں وہ بات ادھوری چھوڑ کر اس کی گود میں چہرہ چھپا گیا تھا، اس کے بالوں کو نرمی سے سہلاتی وہ خاموش ہی رہی تھی، جانتی تھی کہ اگر عروسہ کے خلاف اپنے دل کا غبار اس وقت وہ زبان پر لے آئی تو اس کا ایک لفظ ہی عثمان کو بھتے سے اکھاڑنے کے لیے کافی ہوگا، وہ اپنی ماں کے لیے جذباتی تھا، بیوی کے لیے بھی اتنا ہی جذباتی تھا، مگر اپنی بہن کے لیے وہ ان دونوں سے زیادہ جذباتی تھا، یہ بیلا جانتی تھی، عثمان کے سامنے عروسہ کے خلاف وہ کہہ تو جاتی تھی مگر کہیں نہ کہیں دل میں یہ خدشہ ضرور رہتا تھا کہ کہیں وہ اسے اپنی طرف سے بدظن تو نہیں کر رہی۔

☆......☆

اسٹڈی میں جس وقت وہ داخل ہوا رات کے ۲ بج چکے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ ریڈیو سے واپس آیا تھا اور ہشام قزلباش نے اسے طلب کر لیا تھا، اسے بہت زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی کہ ہشام قزلباش نے اسے اس وقت کیوں بلایا ہے، معاملے کی نوعیت سے وہ کافی حد تک آگاہ تھا، آج شام ہی ہشام اور صبیحہ احمد مدعو تھے، وہاں منیزہ کے گھر والوں نے بھی آنا تھا۔

”بیٹھو ہارون! کیسا رہا آج کا پروگرام؟“ ہشام قزلباش اس سے مخاطب ہوئے تھے۔

”آپ نے نہیں سنا؟“ اس نے کچھ شاکی نظروں سے ان کو دیکھا تھا۔

”کیسے سنتے، ہم جس وقت گھر واپس آئے ۲ بج چکا تھا۔“ صبیحہ کے فوراً ہی کہنے پر ہارون نے چونک کر انہیں دیکھا تھا، معمول سے ہٹ کر آج ان کے لہجے اور چہرے پر ہارون کو خوشی کے تاثرات دکھائی دے

رہے تھے۔

"اتنی رات گئے واپس آئے آپ دونوں؟" وہ حیران ہوا تھا۔

"وہاں منیزہ کے ماں باپ اور اس کے بھائی، بھابھی بھی تھے، باتوں کے درمیان وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔" صبیحہ مسکراتے ہوئے بولی تھیں۔

"آپ کے چہرے سے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ کا وقت وہاں سب کے ساتھ بہت اچھا گزرا ہے۔" ہارون نے مسکراتی نظروں سے ان کو دیکھا تھا۔

"ہاں، سب کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا، مگر میں تمہارے لیے بہت خوش ہوں، کیونکہ آج میں نے صاف طور پر منیزہ اور تمہارے لیے بات کر لی ہے۔" صبیحہ کی اطلاع نے ہارون کی مسکراہٹ غائب کر دی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ دنگ تھا۔

"مطلب تم اچھی طرح جانتے ہو۔" ہشام قزلباش نے سنجیدہ نظروں سے اس کے تاثرات کو جانچا تھا۔

"مگر۔۔۔۔ مگر ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، ماما! آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر ایسا کیوں کیا؟" کچھ بے چین ہو کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا جبکہ حیران نظروں سے اسے دیکھتیں صبیحہ فوراً اس کی طرف آ گئی تھیں۔

"مجھے تم سے پوچھنے کی ضرورت ہی کہاں تھی ہارون! میری نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتیں، اگر کوئی اور وجہ ہے تو مجھے بتاؤ مگر یہ مت کہو کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔"

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ سے کیا کہوں، مگر ابھی ایسا ممکن نہیں ہے۔" وہ اضطرابی لہجے میں اتنا ہی بول سکا تھا۔

"سب کچھ ممکن ہے، میں اس معاملے میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی، خرمن کی خواہش پر عارش پہلے ہی منیزہ کے ماں باپ سے بات کر چکا ہے، آج تو میں نے صرف اس بات کو آگے بڑھایا ہے۔"

"مجھے اس بارے میں کوئی خبر نہیں ہے، میری اجازت کے بغیر میری بے خبری میں، ماما! آپ اس سلسلے کو روک دیں، میں ابھی اس سب کے لیے تیار نہیں ہوں۔" اس کے قطعی لہجے پر صبیحہ بس پریشان نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھیں۔

"میری زندگی کا سب سے پہلا مقصد یہی ہے کہ آپ کو آپ کی خوشیاں واپس مل جائیں اور اس سے پہلے میں اپنے بارے میں ان سب باتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا، ہرگز نہیں۔" بات مکمل کرتا وہ تیز قدموں کے ساتھ اسٹڈی سے نکل گیا تھا۔

"صبیحہ! پریشان مت ہو، اس نے انکار نہیں کیا ہے لہٰذا ہمیں کوئی جلدی نہیں کرنی چاہیے، تم جانتی ہو کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔" صبیحہ کے پریشان تاثرات کو دیکھتے ہوئے ہشام قزلباش نے ان کو تسلی دی تھی۔

☆......☆

آفس میں داخل ہوتی وہ چونک کر دائیں جانب متوجہ ہوئی تھی، ہارون کی موجودگی نے اسے خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا تھا، دوسری جانب وہ اخبار واپس ٹیبل پر ڈالتا اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔

"آپ کب آئے؟"

"کچھ دیر پہلے۔" اس کے بے حد سنجیدہ تاثرات نے منیزہ کو نروس سا کر دیا تھا۔

"عارش کو یہاں پہنچنے میں کچھ وقت لگے گا، آپ بیٹھ جائیے۔"

"نہیں، میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا، ایک، دو اہم باتیں تم سے کرنی تھیں، اس لیے سوچا یہاں آمنے سامنے کرنا بہتر رہے گا، اگر تمہارے پاس ٹائم ہے تو۔۔۔۔۔"

"آپ اطمینان سے جو بات کرنا چاہتے ہیں کریں۔" الجھی نظروں سے دیکھتی وہ بولی تھی۔

"پہلے تو میں تم سے معذرت کرنا چاہتا ہوں کہ ماما کو تمہارے گھر والوں سے ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے تھی جو میرے نزدیک ناممکن ہے، میرے علم میں لائے بغیر میرے بارے میں کس نے کس سے کیا کہا، کون بات کو کہاں سے کہاں تک لے گیا میں نہیں جانتا، یہ ٹھیک نہیں ہوا اس لیے میں تم سے معذرت کر رہا ہوں۔" اس کی جانب دیکھے بغیر وہ بہت سنجیدگی سے بول رہا تھا، جبکہ منیزہ دم سادھے اس کے چہرے کو تک رہی تھی۔

"مجھے امید ہے کہ تم میری بات سمجھ چکی ہو، تم اپنے گھر میں سب کو سنبھال سکتی ہو اور ماما کو بھی سمجھا سکتی ہو۔" ایک پل کو رک کر ہارون نے اس کے اترے چہرے کو دیکھا تھا۔ "اس معاملے کو ختم کرنا تمہارے لیے آسان ہے، جبکہ میں چاروں طرف سے گھرا ہوا ہوں اور سب سے بڑی میری مجبوری یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میرے کسی عمل سے عارش کو دھچکہ پہنچے۔" بغور اس کے تاثرات کو دیکھتا ہو خاموش ہوا تھا۔

"اگر تم کچھ کہنا چاہتی ہو تو کہو؟" اس کے سوال پر منیزہ نے جھکی نظریں اٹھائی تھیں۔

"آپ کیا لیں گے، چائے یا کولڈ ڈرنک؟" اس کے سوال نے ہارون کو حیران کیا تھا۔

"نہیں شکریہ، مجھے اب جانا ہے۔" عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتا وہ جانے کے لیے قدم بڑھاتے بڑھاتے یکدم رکا تھا، پہلی بار اس کی نظروں میں منیزہ کے ہاتھ کی پشت پر بندھی بینڈج آئی تھی۔

"ہاتھ میں کیا ہوا ہے؟" وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ "کچھ نہیں" نظر ملائے بغیر اس نے جواب دیا تھا۔

"کچھ نہیں ہوا اس لیے بینڈج لگائی ہوئی ہے؟"

"آپ کو اس بات کی فکر نہیں کرنی چاہیے" وہ سرد لہجے میں بولی تھی۔

"تمہیں کیوں لگا کہ مجھے تمہاری کسی بات کی فکر بھی ہو سکتی ہے؟"

"شاید مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔"

"کیسی غلط فہمی؟"

"یہی کہ آپ کو میری فکر ہوئی ہے۔"

"ایسی غلط فہمی کا شکار تم پہلے کتنی بار ہو چکی ہو؟"

"میں آپ کے ہر سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔" بمشکل ضبط کیے وہ پلٹ کر وہاں سے چلی جانا چاہتی تھی کہ اسی لمحے گلاس ڈور دھکیلتا عثمان اندر داخل ہوا تھا۔

"سوری آپ کو انتظار کرنا پڑا مگر آپ کھڑے کیوں ہیں؟"

"نہیں اب جاؤں گا، میں تو بس یہاں سے گزر رہا تھا، سوچا کچھ دیر تمہیں ڈسٹرب کروں۔" وہ سنجیدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

"آپ نے یہاں آ کر بہت اچھا کیا، اب جانے سے پہلے اسے اچھی طرح ڈانٹیں، بلکہ کھری کھری سنا دیں۔" عثمان کا اشارہ منیزہ کی سمت تھا جبکہ ہارون نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"عارش سے ناراض گھوم رہی ہیں محترمہ! اس کی منت سماجت کے باوجود اس کے گھر بھی نہیں جا رہیں۔"

"میں اس سے ناراض نہیں ہوں، ابھی میں یہاں سے اس کے گھر ہی جاؤں گی۔" منیزہ نے ناگواری سے اس کی بات کاٹی تھی۔

"یہ تمہارے ہاتھ پر چوٹ کیسے لگی؟" کچھ چونک کر پوچھتے ہوئے عثمان نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے سامنے کیا تھا، جبکہ ہارون کے چہرے کے تاثرات یک لخت تن سے گئے تھے، کوئی اور وقت ہوتا تو عثمان کی جان بوجھ کر ہارون کے سامنے کی جانے والی اس حرکت پر منیزہ بھی گڑبڑا جاتی، مگر اس وقت بیزاری سے اس کی مسکراتی نظروں میں دیکھتی ہاتھ چھڑا گئی تھی۔ حالانکہ وہ پہلے ہی عثمان کو بتا چکی تھی کہ کچن میں کام کرتے ہوئے اسے یہ چوٹ لگی تھی۔

"معمولی چوٹ ہے، ٹھیک ہو جائے گی۔" جان چھڑانے کے لیے بولتی وہ وہاں سے جانے کے لیے پر تولنے لگی تھی۔

"ہارون! اگر آپ گھر کی طرف جا رہے ہیں تو منیزہ کو عارش کی طرف ڈراپ کر دیجیے گا۔" عثمان کی بات سن کر وہ جاتے جاتے رکی تھی۔

"مجھے یہاں ٹائم لگ جائے گا، اس لیے ابھی میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔" وہ اب منیزہ سے مخاطب تھا۔

"میں تمہارا انتظار کرلوں گی، اگر جان چھڑانا چاہتے ہو تو ویسے ہی کہہ دو، کسی اور کو زحمت کیوں دے رہے ہو؟" منیزہ کچھ ناگواری سے بولی تھی۔

"مجھے زحمت نہیں ہو گی لیکن یہ اگر تمہارے ساتھ ہی جانا چاہتی ہیں تو یہ اور بات ہے۔" ہارون کا لہجہ خشک تھا، مگر منیزہ کو چبھتا ہوا بھی محسوس ہوا تھا۔

"نہیں یہ صرف نخرے دکھانے کے موڈ میں ہے، آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ یہ ذمہ داری پوری کر دیں گے۔" مسکراہٹ چھپائے وہ کچھ اس طرح بولا تھا کہ منیزہ کھول کر ہی رہ گئی تھی۔

بیک ویو مرر ٹھیک کرتے ہوئے وہ جلتی نگاہوں سے اس کے سپاٹ چہرے کے عکس کو اک بار پھر جھلسا گیا تھا۔

"مجھے اپنی چوٹ کی بابت کچھ بتانا تمہیں گوارا نہ ہوا، مجھے کوئی شکایت نہیں تم سے کیونکہ میں جانتا ہوں اپنی حد، مگر مجھے یہ نہیں معلوم کہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر ہمدردی کا مظاہرہ کرنے کے لیے کس کا حق ہونا ضروری ہے؟" اس کے تلخ لہجے کو سنتے ہوئے وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتی رہی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ مجبوراً تمہیں میرے ساتھ آنا پڑا ہے، میری جگہ اگر عثمان ہوتا تو تمہارا یہ سفر خوشگوار ہو سکتا تھا۔" اس کے طنزیہ لہجے نے اس بار منیزہ کا ضبط ختم کیا تھا۔

"آپ گاڑی روکیں، مجھے یہیں اترنا ہے۔" اس کی لرزتی آواز ہارون نے جیسے سنی ہی نہیں تھی۔

"میں نے کہا گاڑی روکیں ورنہ میں چلتی گاڑی سے بھی اتر سکتی ہوں۔" سرخ چہرے کے ساتھ وہ تقریباً چیخی تھی۔

"میں تمہارا یہ ایکشن دیکھنا پسند کروں گا۔" اس کے طنزیہ لہجے نے منیزہ کو غصے سے بے حال کیا تھا،

ہارون کو اس سے ایسی کسی بے وقوفی کی توقع نہیں تھی مگر وہ تو تیار تھی، بروقت اسے واپس پیچھے کرتے ہوئے صحیح معنوں میں ہارون کے ہوش اڑے تھے، گاڑی کے توازن کو برقرار رکھتے ہوئے وہ بجلی کی سی سرعت سے ڈور کو ایک جھٹکے سے بند کر چکا تھا۔

"یہ کیا حرکت کی ہے تم نے؟" غصے میں وہ اپنی آواز ہلکی نہیں رکھ سکا تھا۔

"میرا ہاتھ چھوڑیں۔" بینڈج والا ہاتھ اس کی انتہائی سخت گرفت سے نکالنے کی کوشش کرتی وہ غرائی تھی۔

"مجھے تمہارا ہاتھ پکڑنے کا ارمان نہیں تھا، مگر میں اس وقت تم پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔"

"میں بھی اب اپنے لیے ایسی شرمناک باتیں نہیں سن سکتی۔" غصے میں بے حال ہوتی منیزہ کی سانسیں پھولنے لگی تھیں، اپنی گرفت میں اس کے ہاتھ کی لرزش کو محسوس کرتے ہوئے وہ پریشان ہوا تھا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ منیزہ کے تیور اتنے خطرناک بھی ہو سکتے ہیں، اس نے تو اب تک اسے ٹھنڈی پرسکون چھاؤں جیسا ہی پایا تھا۔

"ایم سوری، میں تم سے اب کچھ نہیں کہہ رہا، میں اب بالکل خاموش رہوں گا۔" خود پر قابو کرتے ہوئے اس نے منیزہ کو شانت کرنا چاہا تھا جبکہ اس کی نرم پڑتی گرفت سے وہ ہاتھ نکال گئی تھی، بینڈج کو درست کرتے ہوئے وہ ہارون سے شدید متنفر ہو چکی تھی، شرمندگی تھی یا کچھ اور کہ ہارون دوبارہ اس سے نہ کچھ کہہ سکا تھا نہ اس سے نظر ملانے کے قابل رہا تھا۔

فرنٹ سیٹ سے اترنے سے پہلے وہ رک کر اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

"آپ کہہ چکے ہیں کہ آپ کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں بن سکتا تو براہ مہربانی مجھے اپنی تنگ نظری کا شکار دوبارہ مت بنایئے گا، آپ کو یہ حق نہیں کہ کسی پر بھی لوز کیریکٹر ہونے کا ٹیگ لگا دیں، آپ مجھے اب یہ کہنے پر مجبور کر چکے ہیں کہ جس مقصد کو لے کر آپ میرے پاس آئے تھے، اسے لے کر اس انسان تک جائیں، جو آپ کی بے خبری میں معاملے کو کہاں سے کہاں لے گیا، میں نے سب کے مسائل حل کرنے یا ضرورتیں پوری کرنے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔" سرخ چہرے کے ساتھ وہ بھڑکتے لہجے میں بولی تھی اور اگلے ہی پل فرنٹ سیٹ سے اترتی تیز قدموں کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھ گئی تھی، جبکہ ہارون سپاٹ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆......☆

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے رک کر بیڈ کی جانب دیکھا تھا، جہاں بچہ باریک ہلکی آواز میں روتا اسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام تھا، جو وارڈروب میں جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔

"میرے پاس آنے کا وقت تو کبھی تمہیں ملے گا نہیں، کم از کم اس معصوم کو تو نہ ترساؤ۔" دروازہ بند کرتا وہ خشمگین لہجے میں بولا تھا، چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوتی وہ ایک پل کو رکی تھی، مگر اگلے ہی پل ایک جھٹکے سے وارڈروب بند کرتی اس تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھی کہ عارش اس کے تیوروں پر دنگ ہوتا بے اختیار پیچھے ہوا تھا۔

"لو آ گئی پاس، اور بھی پاس آ سکتی ہوں۔" رکے بغیر مزید اس کے قریب ہوتی وہ اس کی پشت دروازے سے لگا گئی تھی، جس کی آنکھیں حیرت سے پوری کھل گئی تھیں۔

"سونے اور رونے کے علاوہ تمہارا معصوم بیٹا اور کرتا ہی کیا ہے، جیسا باپ ویسا بیٹا۔" اس کے جتانے والے انداز پر وہ جو حیرت سے اس کے گہرے سرخ دوپٹے میں قید چہرے کو تک رہا تھا، بے ساختہ مسکرایا تھا جبکہ وہ خشمگین نظروں سے اسے دیکھتی واپس پیچھے ہٹتی وارڈ روب کی طرف چلی گئی تھی۔

"ویسے یہ بے ایمانی ہے، آئندہ اگر اس طرح پاس آنا تو پہلے مجھے خبردار کر دینا تا کہ مقابلہ برابری کا ہو۔" مسکراہٹ چھپائے وہ تاکید کر رہا تھا۔

"اب میرا دماغ اتنا بھی خراب نہیں کہ تمہیں پہلے خبردار کروں، تمہارا کیا بھروسہ۔" خرمن نے ہنستے ہوئے اسے دیکھا تھا، جو بچے کے قریب نیم دراز ہوتا اس پر جھک گیا تھا۔

"عارش! اب جب تک میں نہ کہوں تم اس کے لیے کوئی چیز نہیں لاؤ گے، تم اس کے لیے اتنی اندھا دھند شاپنگ کر چکے ہو کہ میرے لیے اس کی چیزیں سنبھال سنبھال کر رکھنا مشکل ہو رہا ہے، ایسا لگ رہا ہے کہ یہ میرا گھر نہیں بلکہ اسکول ہے جہاں کنڈر گارٹن شروع ہو چکا ہے۔" کپڑے ہینگ کرتی وہ کچھ جھلائے انداز میں اس سے مخاطب تھی، جو کان بند کیے اپنے بچے میں گم تھا۔

"خرمن! سب اسے کب تک چٹکن کہہ کر مخاطب کرتے رہیں گے؟" کچھ دیر بعد اسے عارش کی آواز سنائی دی تھی۔

"تم سوچو، تم ہر بار یہی کہتے رہے تھے کہ بچے کا نام تم رکھو گے، میں بھی یہی چاہتی ہوں۔" "مگر میں نے ہاسپٹل میں ہی یہ حق تمہیں دے دیا تھا، میں چاہتا ہوں اس کا نام تم رکھو، اب اس میں مزید دیر نہیں ہونی چاہیئے۔"

"ٹھیک ہے، ایک دو نام میں نے سوچ رکھے ہیں کل بیلا اور منیزہ سے ڈسکس کر کے تمہیں بتاتی ہوں۔"

"تم مجھے بتا دینا مگر بہر حال اس کا نام فائنل تو ماموں جان ہی کریں گے۔" سنجیدہ نظروں سے عارش نے بغور اسے دیکھا تھا، جو اس کی بات ان سنی کرتی خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہی تھی۔

☆......☆

"آپ ان کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کر سکتیں تو برا کرنے کا بھی آپ کو حق نہیں، آپ کو تو جو کرنا تھا وہ آپ کر چکی ہیں، مگر مجھے تو شرمندگی اٹھانی پڑی ہے ماموں اور آپو کے سامنے۔" کمرے میں داخل ہوتے فاروق نے ایک نظر حیران نظروں سے بیٹے کو دیکھا تھا جو بلند آواز میں عروسہ سے ہی مخاطب تھا۔

"کیوں چیخ رہے ہو اپنی ماں پر، تہذیب کے دائرے میں رہو، یہ تمہاری کلاس فیلو یا فرینڈ نہیں ہیں، ابھی یہ حال ہے تمہارا آگے جا کر تم تو میرا بھی کوئی لحاظ نہیں رکھو گے۔" فاران پر برس کر انہوں نے خاموش بیٹھیں عروسہ کو دیکھا تھا۔

"اور تم کیوں زبان بند رکھ کر اس کی باتیں سن رہی ہو، اٹھ کر لگاؤ دو تھپڑ، بھائی پر ہاتھ اٹھ سکتا ہے تو بیٹے پر کیوں نہیں۔" وہ عروسہ پر برسے تھے۔

"پاپا میں اپنے لیے نہیں، ماموں کے لیے چیخ رہا ہوں، ممی نے اتنے سارے لوگوں کے سامنے کتنا برا سلوک کیا ہے، اگر آپو مجھے نہ بتاتیں تو میں انجان ہی رہتا۔"

"کوئی قیامت نہیں آ گئی، یہ بہن ہے اس کی، ہزاروں لوگوں کے مجمعے میں اس کو مار سکتی ہے، تمہیں بھی جوتے لگانے کا حق رکھتی ہے، کسے اعتراض ہوا ہے، میرے سامنے لاؤ اس کو۔" غصیلے لہجے میں وہ بولے تھے۔

"پاپا! بات اعتراض کی نہیں ہے، مانی ماموں کا چہرہ باہر کی دنیا میں سب کے لیے مانوس ہے، ممی نے ان کے ساتھ جو کیا، وہ غلط معنوں میں بھی مشتہر ہو سکتا ہے، ان کے خلاف کوئی منفی پبلسٹی کے لیے اس بات کو استعمال کر سکتا ہے، ان کے امیج پر کوئی دھبہ بھی لگ سکتا ہے۔" فاران زچ ہو کر بولا تھا۔

"ماموں سے زیادہ یہ آپ کا امیج لوگوں کی نظروں میں خراب کر گئی ہیں پاپا! میں نہیں چاہتا کہ اب مزید کسی چیز کے لیے آپ کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے، ممی اپنے بھائی کے ساتھ اس سے بھی زیادہ سنگدل ہو جائیں، مگر ان کے ہر فعل کے پیچھے سب کو آپ نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ آپو کو بھی، میرے لیے اس دنیا میں آپ سے بڑھ کر کوئی اچھا نہیں ہے، میں نہیں برداشت کر سکتا کہ کوئی آپ کو برا کہے، آپ کے متعلق کوئی غلط بات زبان پر لائے۔" فاران کے جذباتی انداز پر فاروق بس دنگ نظروں سے اسے دیکھتے رہے تھے۔ فاران نے کبھی اس طرح ان کو نہیں جتایا تھا کہ وہ ان کے لیے کتنا حساس ہو چکا ہے۔

"بیلا نے تم سے کچھ کہا؟" عروسہ نے بیٹے سے پوچھا تھا۔

"کیا کریں گی جان کر، تھپڑ مار کر ان کی زبان بھی بند کر دیں گی؟" شدید ناراضی سے ان کو دیکھتا فاران کمرے سے نکل گیا تھا۔

"میری وجہ سے اس کی اتنی ہمت ہوئی تھی کہ آپ کو ذلت سے دوچار ہونا پڑا تھا، کسی نہ کسی طرح اس ذلت کا سامنا اسے بھی تو کرنا ہی تھا۔" سر جھکائے وہ نم لہجے میں بولی تھیں۔

"دنیا کے سامنے تمہیں اپنے ظرف کو برقرار رکھنا چاہیئے تھا مگر تمہیں اس وقت صرف یہ یاد رہا کہ شوہر کو اپنی وفاداری اور قربانی کے ثبوت دینے ہیں۔" فاروق سنجیدہ لہجے میں بولے تھے اور پھر گہری سانس لے کر عروسہ کو دیکھا تھا۔ "دنیا کو ہر غلط فعل کے پیچھے میں نظر آتا ہوں، تو یہی میری سزا ہے کیونکہ میں نے تمہارے ساتھ غلط کیا، تم سے کچھ چھیننا چاہا تھا میں نے جو میرے پاس کبھی تھا ہی نہیں۔" کچھ تھا ان کے لہجے میں کہ عروسہ ان کی جانب دیکھنے پر مجبور ہوئی تھیں۔

"عثمان قابل رشک ہے کہ اس کے پاس تمہاری جیسی بہن ہے، جو بھائی کی محبت میں ایک پل کے لیے اپنے شوہر کو بھلا سکتی ہے، جو اپنے بھائی کی خوشیوں کے لیے اپنا ہنستا بستا گھر بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کر سکی، تم نے ہمیشہ اپنے بھائی پر فخر کیا، آج بھی تم یہ تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ اس سے اپنے رشتے پر تمہیں کوئی شرمندگی ہو، میرے کہنے پر تم اس سے تعلق تو ختم کر سکتی ہو، مگر اسے اپنے لیے نامحرم نہیں بنا سکتیں۔" لرزتے لہجے میں بولتے ہوئے ان کے چہرے پر اذیت پھیلتی جا رہی تھی۔

"ایک بہن جب اپنے بھائی سے کہتی ہے کہ وہ اس کے لیے نامحرم ہے تو اس اذیت کے سامنے موت کی اذیت کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ میں اس اذیت سے آخری سانس تک گزرتا رہوں گا، مگر کبھی نہیں چاہوں گا کہ اس اذیت کا سامنا ایک اور بھائی کرے۔" خاموش ہو کر انہوں نے سرخ ہوتی آنکھوں سے عروسہ کو دیکھا تھا، جو سانس روکے ان کو یک ٹک دیکھ رہی تھیں، مگر شوہر کے دل کا درد ان کی آنکھوں سے



بہنے لگا تھا۔

"اس کے پاس چلی جاؤ، میری زندگی میں اذیتوں کی انتہا بھی ہو جائے، تو بھی مجھے تمہارے لیے اور اپنی اولاد کے لیے جینا ہے، مگر تم پر کوئی ظلم کر کے میں اپنی عاقبت کو اذیت سے دوچار نہیں کرنا چاہتا، جب تک تم نہ چاہو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں تمہارے بھائی سے نہ الگ کر سکتی ہے نہ تمہارے لیے اس کو زندہ در گور کر سکتی ہے، میری طرف سے تمہیں اجازت ہے، میری وجہ سے جتنا عرصہ تم نے اپنے دل کو اپنے بھائی کے لیے مارا ہے، اس کے لیے تم مجھے معاف کر دو۔"

"میں آپ کا یہ احسان......" دل کی اذیت نے عروسہ کی زبان بند کر دی تھی، ان کے سینے سے سر لگاتے ہوئے عروسہ کی سسکیاں بلند ہونے لگی تھیں۔

"یہ احسان نہیں، تمہارا حق ہے، بس اتنا یاد رکھنا کہ اپنے بھائی کے پاس تم صرف اسی کے لیے جا رہی ہو، اس کی بیوی کے لیے نہیں۔" ان کے سنجیدہ لہجے میں ایک تنبیہہ چھپی تھی۔

☆......☆

"منیزہ مصطفیٰ! تم نے میرے سلام کا جواب نہ دے کر اچھا نہیں کیا۔" عثمان کی بڑبڑاہٹ بیلا کے کانوں تک پہنچی تھی، جو ڈریسنگ کے سامنے بیٹھی بالوں میں برش پھیر رہی تھی۔

"ہارون کے سامنے اس کا ہاتھ پکڑنے کے بعد وہ اب تمہاری طرف دیکھ لے تو یہ بھی بڑی بات ہے۔" بیلا نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا جو لیپ ٹاپ میں، مصروف بیڈ پر ہی نیم دراز تھا۔

"وہ آن لائن ہے تو سوچا اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھ لوں، انسٹی ٹیوٹ سے غائب ہونے کے لیے بہانے بہت ہوتے ہیں اس کے پاس۔" وہ مصروف انداز میں بولا تھا۔

"ایک بات بتاؤں تمہیں۔" بالوں کو ہیئر بینڈ میں قید کرتی وہ ڈریسنگ کے سامنے سے ہٹی تھی۔

"جب تم میرے علاوہ کسی اور کے لیے اتنی توجہ کا اظہار کرتے ہو تو یقین کرو میری نظر میں تم سے زیادہ کوئی چیز زہریلی نہیں ہوتی۔" اس کے چبھتے لہجے پر عثمان نے مسکراتی نظروں سے اس کے صبیح چہرے پر ناگواری کے تاثرات کو دیکھا تھا۔

"جیلیسی میں بھی تم قیامت لگتی ہو۔"

"عثمان میں سنجیدہ ہوں۔"

"میں تم سے زیادہ سنجیدہ ہوں، مگر صرف تمہارے لیے۔" وہ آنکھوں میں شرارت سجائے بولا تھا جبکہ کال بیل کی وجہ سے وہ بحث ترک کرتی کمرے سے نکل گئی تھی، جبکہ عثمان دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا، چند لمحے گزرے تھے جب باہر سے آتی آوازوں پر وہ چونکا تھا، اسی لمحے اس نے فاران کو عجلت میں اندر آتے دیکھا تھا۔

"باہر آ کر دیکھیں کون آیا ہے۔" فاران کے خوشی سے بھرپور لہجے پر وہ ایک پل کے لیے حیران ہوا تھا۔

(جاری ہے)

افسانہ

سفر ہے شرط

"یہ اتنا کمزور کیوں ہے؟" اس نے منہ بسور کر اشعر کو دیکھا۔

"ڈینگی مچھر نے کاٹ لیا تھا۔" وہ جل کر بولا۔

"اشعر کے بچے! ہمارے بچے پانی میں ڈال کر

آ گئے۔" فیضی دکھ میں مرا جا رہا تھا۔

"یار! بارہ ہزار میں تو ایسا بکرا ہی ملے گا نا؟" اس نے باری باری سب کی اتری شکلوں کو دیکھا۔

"ٹھیک ہی کہہ رہے ہو، دیکھو یہ تو وائٹ کلر کا بکرا ہے اور چہل کا بکرا تو کالا تھا۔" بسمہ اب نرمی سے بکرے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

"کلر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق تو ہیلتھ سے پڑتا ہے۔" ایمل ناخن چباتے ہوئے بولی۔

"عید تک ہم اس کی خوب خوراک کریں گے تب تک یہ چہل کے بکرے سے بھی زیادہ ہیلتھی ہو جائے گا۔" شہروز پرجوش ہوا۔

"کم آن! گھر آئے مہمان کو یوں دیکھ کر منہ نہیں بسورتے۔" مناہل نے بڑی بہن ایمل کو پچکارتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تیکھے تاثر لیے اشعر کو گھور رہی تھی۔ دبلا پتلا اور بے چاری سی شکل بنائے کھڑا بکرا اسے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

"اب کچھ بولو بھی۔" اشعر اس کے کچھ بولنے کا منتظر تھا۔

"اشعر! یہ چہل کے بکرے جتنا ہیلتھی تو ہو جائے گا نا؟" اس نے ضمانت مانگی۔



"ہاں بھئی! اب اس کا گارنٹی کارڈ بنوا دوں۔" وہ چڑ کر بولا۔
دو دن قبل چہل یعنی ان سب کی پھپھو کی بیٹی سب کزنز کو جلا بھنا گئی تھی۔
"چالیس ہزار کا بکرا۔ سونے کا ہے کیا؟" شیری چیخ کر بولی۔
"کس زمانے میں جی رہے ہو۔ یہ 2015ء ہے مسٹر شہروز۔" چہل تخت پہ شہزادی کی طرح بیٹھی تھی اور وہ سب کزنز اس کے آس پاس۔
پھپھو کی شادی اپر کلاس میں ہوئی تھی۔ ان کے دو بچے تھے۔ چہل اور ہادی، جب بھی وہ ننھیال آتے تو ان کزنز کو چڑا کر رکھ دیتے تھے۔
"ہم نے دو گائے اور دو بکرے خریدے ہیں۔" ہادی نے معلومات میں اضافہ کیا۔
"تو ان سب کو بھی یہاں لے آتے۔" فیضان نے شرارتی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔
"اس بکرے سے مجھے زیادہ لگاؤ ہو گیا ہے۔" چہل نہایت ہی صحت مند، سیاہ بکرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔
"آپ لوگ تو چاند رات کو بکرے خریدتے ہیں ناں۔" ہادی نے اپنے تمام کزنز کی بے چاری شکلوں کو دیکھ کر تپایا۔
"ہاں جی! بابا کہتے ہیں کہ بکروں کی بے جا نمائش نہیں کرنی چاہیے۔" مناہل موٹے چشمے درست کرتے ہوئے بولی۔
"بھئی یہ تو بچوں کو بہلانے کے بہانے ہیں۔ و- اصل میں اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔ چاند رات کو بکرے سستے جو ملتے ہیں۔" چہل استہزائیہ بولی۔
"کل ہم بھی بکرا لے کر آئیں گے۔ میں بابا سے بات کروں گی۔" ایمل نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
سب نے اسے حیرانگی سے دیکھا۔ کیوں کہ سب جانتے تھے کہ اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے والی۔
اور ہوا بھی ویسا ہی وہ بابا کے پاس بات کرنے گئی تو انہوں نے ڈپٹ دیا کہ مجھے چاند رات کو ہی پیسے ملیں گے اور بکرا بھی چاند رات کو ہی آئے گا۔
وہ جذباتی ہو کر چہل اور باقی سب کو چیلنج تو کر چکی تھی مگر اب بابا نے اس کی ناک ہی کاٹ کر رکھ دی تھی۔
"بابا! نہیں مان رہے تو کیا ہوا۔ ہم خود ہی بکرا خرید لیں گے۔" وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی تھی۔
"تم پاگل ہو گئی ہو، ہم میں سے کسی کے پاس نہ اتنی رقم اور نہ ہی ہم میں سے کوئی جاب کرتا ہے۔" اشعر نے صاف صاف ہاتھ جھاڑے۔
"ویسے مرتضیٰ بھائی جاب کرتے ہیں اگر ایمل آپی ان سے درخواست کر دیں۔" بسمہ شرارت سے بولی۔
"شٹ اپ! ہم سب ملا کر تو لے سکتے ہیں۔ مجھے چہل کے آگے جھکنا نہیں، میں اسے بکرا لے کر جواب دینا چاہتی ہوں۔" وہ بضد ہوئی۔
اور اس نے ضد میں جیسے تیسے سب کو راضی کر ہی لیا۔ سب کے پیسے ملا کر بارہ ہزار بنے تھے۔ اشعر منڈی جا کر بکرا لے آیا تھا۔ بکرے کو دیکھ کر ایمل کا خون جل گیا تھا۔
بکرا تو آ گیا تھا مگر اتنا کمزور، ہاتھ مارو تو گر جائے، چہل دیکھتی تو مذاق اڑاتی۔
"ٹھیک ہے، لیکن تم سب اپنی جی توڑ کوشش کرو گے اسے ہٹیکٹھی بنانے میں۔" ایمل نے اشعر کے ہاتھ سے رسی لیتے ہوئے سب سے تائید مانگی۔ سب نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے بکرے کی رسی درخت کے ساتھ باندھی۔
بکرا تھوڑی دیر بعد اجنبی جگہ اور خود کو تنہا پا کر میں، میں کرنے لگا تھا۔ گھر کے اندر سے تائی امی، ایمل کی امی برآمد ہوئی تھیں۔
"یہ بکرا کہاں سے آیا؟" امی کا حیرت سے منہ کھل گیا۔
"میں لے کر آیا ہوں امی!" اشعر اداکاری سے بولا۔ باقی سب نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"نہیں جی! یہ ہم سب نے مل کر خریدا ہے۔" بسمہ کو اپنے خرچے کی قربانی یاد آئی تو پھٹ پڑی۔
"میرے بچوں۔" تائی امی جذباتی ہوئیں۔
"یہ کوئی طریقہ ہے، اس طرح قربانی کی جاتی ہے۔ قربانی کا مطلب بھی پتا ہے؟" تائی امی کے پیچھے سے مرتضیٰ برآمد ہوا۔ اسے دیکھ کر سب کی ہوائیاں اڑ گئیں۔
وہ سب کزنز سے بڑا تھا۔ اس کا رویہ خاصا نپا تلا ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایمل کا منگیتر بھی تھا۔
"یہ پوری فلم اس ایمل کی بنائی ہوئی ہے۔" اشعر نے پوری کارکردگی کا سہرا ایمل کے سر سجا لیا۔ ایمل فیضان کے پیچھے جا چھپی۔
"کیوں بھئی؟" اس نے ایمل کو گھورا۔
"میری خواہش تھی عید سے پہلے بکرا گھر آ جائے اور تو کوئی خواہش پوری کرتا نہیں، ہم نے خود ہی کر لی۔" وہ فیضی کے پیچھے سے جھانک کر بولی۔
"اوہ..... قربانی کے نام پر خواہش پوری کی جا رہی ہے۔" وہ ابرو اچکا کر طنزیہ بولا۔ اس کا رویہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ طنزیہ اور جتانے والا۔ ایمل کو وہ اچھا تو لگتا تھا مگر اس کا ایسا رویہ اسے بالکل بھی پسند نہیں تھا۔
پہلے تو وہ ٹھیک ہوتا تھا مگر جب دادی کی خواہش پر ان دونوں کی منگنی ہو گئی تھی اس کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی کڑوا ہو گیا تھا۔
"مرتضیٰ چھوڑو بھی اب، بچوں کو خوش ہونے دو، خبردار جواب کچھ کہا تو۔" تائی امی نے اسے ڈانٹا۔ وہ سب پر غصیلی نگاہ ڈالتا ہوا اندر کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆

اس کی صبح سویرے آنکھ کھلی تو وہ بستر چھوڑ کر سیدھا صحن میں بکرے کو دیکھنے کے لیے چلی آئی کیونکہ اسے بکرے کی بہت فکر تھی۔
اس کی لمبی آتی جمائی رک گئی۔ بکرا اپنی مخصوص جگہ پر نہیں تھا۔ اس نے اپنے چاروں اطراف گھور کر بکرے کو تلاش کیا کہ اسی دوران بیرونی گیٹ کھول کر اشعر اندر داخل ہوا۔
"کہاں گئے تھے صبح صبح اسے لے کر؟" اس نے تن کر پوچھا۔
"یار! سیر کروانے گیا تھا۔ یونو سیر اچھی ہوتی ہے صحت کے لیے۔" اس نے بکرے کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔
"اسے اچھی طرح کھلاؤ پلاؤ، دو دن کے اندر یہ صحت مند ہونا چاہیے۔" وہ رعب سے بولی۔ جب سے وہ کمزور بکرا لایا تھا تب سے وہ اسے ہر بات میں آڑے ہاتھوں لے رہی تھی۔
"دو دن میں کیا کوئی جادوگر ہوں۔ یا یہ بکرا کوئی بے جان پرزہ ہے۔" اسے دو دن والی بات ہضم نہیں ہوئی تو فوراً اگل دیا۔
"عید تک ہو جائے گا۔" وہ بکرے کی رسی کو درخت سے باندھتے ہوئے بولا۔ وہ سر سے پاؤں تک جل گئی۔
"کیا؟ اور اگر چہل آ گئی تو ہم کیا منہ دکھائیں گے۔" وہ چڑ کر بولی۔
"دیکھ لیں گے چہل کی بچی کو۔" وہ بے فکری سے بولتا ہوا اپنے پورشن کی طرف چل دیا۔ وہ وہیں درخت کے ساتھ بنی کیاری پر بیٹھ گئی۔ نیند تو ویسے بھی اب اڑ گئی تھی۔ اس نے پورے گھر کو بغور دیکھا۔ ابھی تک اندر سے کوئی برآمد نہیں ہوا تھا۔
کہنے میں تو یہ ایک گھر تھا مگر یہ گھر دو پورشن پر مشتمل تھا۔ ایک پورشن تایا ابو کا اور ایک پورشن ایمل کے بابا کا۔
تایا ابو کے تین بچے مرتضیٰ، فیضان اور بسمہ تھے جب کہ وہ چار بہن بھائی تھے۔ ایمل، اشعر، مناہل اور شہروز۔
فرسٹ کزنز ہونے کے ناتے دادی اور باقی سب کی خواہش پر مرتضیٰ اور ایمل کا نام جڑ گیا تھا۔

مرتضیٰ اس سے پانچ برس بڑا تھا۔ وہ سمجھ دار اور سلجھا ہوا تھا۔ لیکن ایمل اس کے برعکس تھی۔ وہ شوخ، ہنس مکھ اور ان میچور تھی۔

اس کی ہر وقت الٹی سیدھی حرکتیں اسے بالکل بھی پسند نہیں تھیں۔ وہ چاہتا تھا ایمل میچور ہو جائے۔ ڈیسنٹ ہو جائے۔ مگر وہ تھی کہ اپنی ہی دھن میں مگن رہتی۔

☆......☆

"ہاہاہا...... ہی ہی ہی۔" جب سے چہل نے بکرا دیکھا تھا اس کی ہنسی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ایمل کھا جانے والی نظروں سے اشعر کو دیکھ رہی تھی۔

"کسی مرض میں مبتلا ہے کیا یہ؟" وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روک کر بولی۔

"آپی! کسی کا اتنا مذاق اڑانا ٹھیک بات نہیں ہے۔" شیری نے منہ بسور کر کہا۔

"ویسے بھی یہ عید تک آپ کے بکرے جیسا ہو جائے گا۔" بسمہ پر یقین لہجے میں بولی۔

"اوہ...... اچھا! جادو کی چھڑی سے۔" چہل استہزائیہ بولی۔

"آپ کے والا تو سیاہ ہے۔ یہ تو سفید ہے اور دیکھو کتنا معصوم ہے۔" مناہل نے ایکدم بچوں والی بات کہی۔

"بالکل ہماری ایمل جیسا معصوم۔" فیضی نے لقمہ لگایا۔

ایمل نے اسے غصے میں دیکھا۔

"ایمل اور معصوم۔" چہل ناک چڑھا کر بولی۔

"تم جلتی ہی رہو گی ایمل سے۔" ایمل کی برداشت جواب دے رہی تھی اس نے بھی مسکراتے ہوئے چہل کا تن من جلایا۔

"ویل، کل شام گلشن میں ایک پروگرام رکھا گیا ہے۔ جہاں پر بکروں کے لیے خصوصی انتظامات ہیں اور وہاں بہت سارے لوگ اپنے بکرے لے کر آئیں گے اور زبردست کیٹ واک ہو گی۔" وہ کزنز کے گھیرے میں بیٹھی تھی۔

"کیٹ واک......! وہ بھی بکروں کی؟" مناہل نے حیرانگی سے منہ پر ہاتھ رکھا۔

"جی ہاں! ہر سال ہوتا ہے کس زمانے میں جی رہی ہو؟" وہ کندھے اچکا کر بولی۔

"پھر تو ہم بھی جائیں گے۔ ابھی سے ہم بکرے کو پریکٹس کرواتے ہیں۔" فیضان پر جوش ہوا۔

"ہاہا! بہت انجوائے کریں گے لوگ تمہارے بکرے کو۔" وہ استہزائیہ بولی۔

"ہمارا بکرا کسی سے کم نہیں ہے۔" چہل کی باتیں ایمل کو زہر لگ رہی تھیں۔

"کوئی ضرورت نہیں ایسی فضول حرکتیں کرنے کی۔" مرتضیٰ گھمبیر آواز میں گویا ہوا۔ سب نے گردن موڑ کر عقب میں دیکھا۔

وہ براؤن ٹراؤزر، ٹی شرٹ میں ملبوس خطرناک تاثرات کے ساتھ کھڑا تھا۔

"اس میں فضول کیا ہے مرتضیٰ بھائی؟" چہل نے بلا کی حیرانگی دکھائی۔

"قربانی کرنا ایک اعلیٰ مرتبے کا کام ہے۔ قربانی کے کچھ اصول ہیں ضابطے ہیں۔ یہاں تو قربانی کے نام پر خواہشیں پوری کی جا رہی ہیں۔ کیا ہم مسلمانوں کو زیب دیتا ہے قربانی کے جانوروں کو کیٹ واک کروائیں، پھر تالیاں بجائیں۔" وہ ماتھے پر تیوریاں چڑھائے بول رہا تھا۔ تمام افراد خاموش ہو گئے تھے۔

"یہ تو تھوڑا انجوائے منٹ ہوتا ہے۔ ہمارے لیے بھی اور جانوروں کے لیے بھی۔" چہل دو ٹوک انداز میں بولی۔

"تمہارے لیے یہ فضول کام انجوائے منٹ ہوتا ہو گا۔ ویسے بھی جانوروں کو عقل نہیں ہوتی، تم تو انسان ہو۔"

"ہاں! میں انسان ہی ہوں۔" چہل نے بدتمیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"مجھے تو جانور ہی لگتی ہو۔" مرتضیٰ نے بھی اسی

تیزی میں کہا۔ چہل کا منہ کھل گیا۔ سب کے چہروں پر زیر لب مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اور خبردار جو تم میں سے کوئی بھی اس تقریب میں گیا تو۔" مرتضیٰ نے سب کو غصیلی نگاہ سے دیکھا۔ بطور خاص ایمل کو۔

"کتنے عجیب ہیں یہ مرتضیٰ بھائی۔" اس کے جانے کے بعد چہل ناراضی سے بولی۔

"پیدائشی ہیں۔" اشعر زیر لب مسکرایا۔

"پتا نہیں۔ ایمل تم پوری زندگی ان کے ساتھ کیسے گزارو گی۔" اسے اچانک ایمل سے ہمدردی ہوئی۔

"دیوار سے سر مار مار کر مر جائے گی بے چاری۔" فیضان نے کھلی اڑائی۔ ایمل نے اسے مکا رسید کر دیا۔

"تو پھر کل کے بارے میں کیا سوچا؟" اتنی عزت افزائی ہونے کے بعد بھی وہ پوچھ رہی تھی۔

"نہیں ہم نہیں جائیں گے۔ ان کا انداز غلط تھا مگر بات ٹھیک تھی۔" ایمل ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

"تم لوگ مڈل کلاس کے مڈل کلاس ہی رہو گے۔" وہ غصے میں بولتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئی۔ وہ سب اسے خاموشی سے جاتا دیکھ رہے تھے۔

"ویسے مرتضیٰ بھائی کو اِن کب سے بولنے لگی ہو؟" اشعر نے اسے ٹھوکا مارتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

"شٹ اپ۔" وہ دہاڑی۔

☆......☆

وہ دوڑتی ہوئی تایا ابو کے پورشن میں آئی تھی۔ تائی امی بیڈ پر دراز تھیں۔ پاؤں میں ڈریسنگ کی ہوئی تھی۔ مرتضیٰ ان کے لیے دوائی نکال رہا تھا۔

"تائی امی، کیا ہوا؟" وہ مارکیٹ گئی تھی جب انہیں چوٹ لگی تھی۔ واپس آئی جیسے ہی امی نے بتایا وہ دوڑ کر ان کے پاس چلی آئی۔

"بس بیٹا! کپڑے دھو رہی تھی پھسل گئی۔" ان کی رنگت زرد ہو رہی تھی۔

"کیا ضرورت ہے آپ کو کپڑے دھونے کی، کوئی ماسی رکھ لیں۔" وہ فکرمندی سے بولی۔

"تبھی تو کہتی ہوں، بہو گھر آ جائے تو میرا بوجھ کم ہو جائے۔" وہ معنی خیزی سے بولیں۔ ایمل خجل ہو گئی۔ مرتضیٰ کا حرکت کرتا ہاتھ رک گیا۔

"اب جب تک آپ ٹھیک نہیں ہو جاتیں۔ میں سارا کام کروں گی۔" اس نے نارمل لہجے میں سکوت توڑا۔

مرتضیٰ نے انہیں دوائی دی تو وہ کچن میں چلی آئی۔ بسمہ اور فیضان اکیڈمی گئے ہوئے تھے۔ تایا ابو بھی آنے والے تھے۔ اس نے ڈنر کی تیاری شروع کر دی۔

چکن کڑاہی تیار کر کے اس نے سلاد کاٹی، مرتضیٰ کو کسی بھی کھانے کے ساتھ سلاد کھانا پسند تھا۔ اس نے سلاد کو پلیٹ پر پرکشش انداز سے سجایا تھا۔

گرم گرم روٹیاں تیار تھیں۔ فیضان، مرتضیٰ اور بسمہ کھانے کی ٹیبل پر آ چکے تھے۔ تائی امی کے لیے اس کی امی نے پرہیزی کھانا بنا کر بھیجا تھا۔

"تمہیں کھانا بھی بنانا آتا ہے کیا اور روٹیاں بھی۔" وہ سب کے آگے کھانا رکھ رہی تھی۔ مرتضیٰ حیرانگی سے پوچھ رہا تھا۔

"جی ہاں۔" وہ طنزیہ بولی۔ "آپ کبھی غور کرو تو پتا چلے ناں، ہر وقت اکڑو بنے رہتے ہیں۔ جانے کیسا بیر ہے مجھ سے۔" وہ دل میں کڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"چاچی نے انہیں اسپیشلی سکھایا ہے۔ کہہ رہی تھیں اب شادی ہونے والی ہے تو سیکھ لو۔ ورنہ ناک کٹواؤ گی۔" بسمہ نے چاچی والے انداز میں بتایا۔ مرتضیٰ زیر لب ہنس رہا تھا۔

"کھانا تو بہت اچھا بنا ہے۔ چلو چاچی کی ناک بچ گئی۔" فیضی آنکھ دبا کر بولا۔ ایمل نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"بیٹا! تم بھی کھالو۔ کھڑی کیوں ہو۔" تایا ابو کرسی گھسیٹتے ہوئے پیار سے بولے۔

"گھر پر کھالوں گی۔"

"یہ بھی تو گھر ہے نا آپ کا۔" تایا ابو نے اس کے لیے کرسی نکالی۔ ناچار اسے بیٹھنا پڑا۔ وہ ڈیسنٹ طریقے سے کھا رہی تھی۔ نوالہ بڑی مشکل سے گلے سے اتر رہا تھا۔ مرتضیٰ جو سامنے بیٹھا تھا۔

کھانے کے بعد تایا ابو اٹھ کر چلے گئے۔ اس نے اور بسمہ نے برتن سمیٹے۔

"ایمل ادھر آؤ۔ میں تمہیں جیل اور اس کی تقریب کی تصویریں دکھاتا ہوں۔" فیضان اپنا ٹیبلٹ لیے اسے بلا رہا تھا۔

ایمل نے کچن سے اسے مرتضیٰ کی طرف اشارہ کیا کہیں وہ غصہ نہ ہوجائے۔

"تم ان فضول حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔" مرتضیٰ نے اسے ڈپٹا۔

☆......☆

"کیا یہ ایسا ہی کمزور رہے گا؟" اس نے ٹھوڑی پر مٹھی رکھ کر اپنے تمام ساتھیوں کو دیکھا۔

"مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے، عید میں صرف چار دن رہ گئے ہیں اور اس کی صحت ویسی کی ویسی ہے۔" فیضان پرسوچ انداز میں بولا۔

"کھاتا تو اتنا سارا ہے، آخر جاتا کہاں ہے؟" شہروز نے بکرے کو مسلسل کھاتے دیکھ کر کہا۔

"پیٹ میں کیڑے تو نہیں؟" بسمہ پریشان ہوئی۔

"شٹ اپ یار!" ایمل چڑ کر بولی۔

"اب تو چہل آپی نے بھی دیکھ لیا ہے۔ وہ خاصا مذاق بھی اڑا چکی ہیں۔" مناہل نے کہا۔

"تم اسے کہاں لے جا رہے ہو؟" اشعر باہر سے عجلت میں اندر آیا اور بکرے کی رسی کھول کر باہر لے جا رہا تھا۔

"شیخ صاحب کے گھر لے کر جا رہا ہوں، ان کے ہاں مہمان آئے ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔" اشعر نے ان کی جانب گردن گھما کر جواب دیا۔ بکرا مسلسل اس کے گھٹنوں پر سر رگڑ رہا تھا۔

"شیخ صاحب کے مہمان ہمارا بکرا کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟" بسمہ نے پتے کی بات کی۔

شیخ صاحب اس محلے کے امیر آدمی مانے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ نہایت ہی کنجوس قسم کے آدمی بھی تھے۔

"ان کا بیٹا میرا دوست ہے اس لیے۔" وہ مختصر کہہ کر جانے کو مڑا۔

"خود تو شیخ صاحب عید سے کافی دن پہلے ہی بکرا لے آتے ہیں اور بکرا بھی ایسا کہ انگلی رکھو تو دور جا گرے۔"

"جلدی لے کر آجانا۔" ایمل نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

"ویسے ایمل آپی! ہمارا بکرا تو شیخ صاحب کے بکروں سے اچھی حالت میں ہے۔" مناہل کو فضول میں خوشی ہوئی۔

"جب آیا تھا تو شیخ صاحب کے بکروں والی حالت ہی تھی۔ اب ہمارے ہاں اتنا کھا کھا کر صحت مند ہوا ہے۔" شیری آنکھ دبا کر بولا۔ سب کو ہنسی آگئی۔

"کتنی بکواس کرتے ہو تم لوگ۔" ایمل ہنسی دبا کر بولی۔

"بکرا کہاں ہے؟" اشعر کو واپس گھر آتے دیکھ کر سب نے بیک وقت پوچھا۔

"وہ تھوڑی دیر بعد آئے گا ابھی دوستوں کے ساتھ گھل مل گیا ہے۔" اشعر بال کھجا کر بولا۔

"اشعر تم مار کھاؤ گے۔ مجھے ابھی جا کر لا کر دو۔" ایمل نے باقاعدہ اس کا گریبان پکڑ کر کہا۔

"بکرا کل۔" اشعر شرارت سے ہنستے ہوئے گریبان چھڑا کر بولا۔ وہ اسے دوبارہ پکڑتی وہ دوڑ کر اندر چلا گیا۔

"اشعر میں تمہارا جینا حرام کردوں گی۔" وہ پوری قوت سے چلائی۔

"چپ ہوجاؤ۔" شیری نے اسے ٹھوکا مارا۔

"کیوں چپ ہوجاؤں۔" وہ اس پر دہاڑی۔

"اس لیے کہ تمہارے پیچھے مرتضیٰ بھائی کھڑے ہیں۔" بسمہ جھٹ سے بولی۔

مرتضیٰ کھا جانے والے تاثرات لیے کھڑا تھا۔ وہ سر جھکا کر آگے بڑھ گئی۔

☆......☆

"بیٹا آپ کا جتنا شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔" وہ تینوں بیرونی گیٹ سے کان لگائے کھڑی تھیں۔ دروازے کے دوسری جانب فیضان، شیری اور اشعر ایک آدمی کے ساتھ کھڑے تھے۔

"انکل یہ تو انسانیت کے ناتے میرا فرض تھا۔" اشعر نے جانا مانا ڈائیلاگ مارا۔

"بہت خوشی ہوئی کہ ابھی بھی نوجوان نسل میں ایسے خیالات موجود ہیں۔" وہ کان لگائے سن رہی تھیں مگر سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا اور گائے بگائے ایک دوسرے سے اشارہ کر کے پوچھ رہی تھیں۔

"میں تمہارے پیسے تھوڑے تھوڑے کر کے واپس لوٹا دوں گا۔" وہ آدمی تشکر بھرے لہجے میں بولا۔

"نہیں انکل واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔" اشعر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"میں تمہارے احسان کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اپنا خیال رکھنا۔" وہ بول کر شاید چلے گئے تھے تبھی بیرونی دروازہ کھلا اور بسمہ کے ماتھے پر زور کا لگا۔

"کون سے پیسوں کی بات ہو رہی تھی۔" ایمل نے تن کر اشعر سے پوچھا۔

"کسی کی بات کان لگا کر سننا بہت بری بات ہے۔" اشعر برا منہ بنا کر بولا۔

"اشعر بھائی! جاؤ پہلے ہمارا بکرا لے کر آؤ شیخ صاحب کے گھر سے۔" مناہل نے اپنی ہی ضد کی۔

اشعر نے چور نگاہوں سے ان سب کو دیکھا۔

"اشعر پہلے تم میرے سوال کا جواب دو۔ بعد میں، میں تم سے بکرے کا احوال بھی لیتی ہوں۔" ایمل مصنوعی کف اوپر چڑھا کر رعب سے بولی۔

"وہ جو آدمی آئے تھے میں نے کچھ دن پہلے ان کے فادر کی ہیلپ کی تھی۔"

"کیسی ہیلپ؟"

"رات کا ٹائم تھا۔ فٹ پاتھ پر وہ بزرگ گھٹنوں کے بل بیٹھے درد سے کراہ رہے تھے۔ میں نے ان کی ہیلپ کی۔ اسپتال لے گیا۔ ٹریٹمنٹ کروایا، انہیں سانس کی تکلیف تھی۔ پھر میں نے ان کے فون سے ان کے گھر والوں کو اطلاع دی تب ان کے بیٹے نے مجھ سے گھر کا ایڈریس مانگا اور آج خصوصی شکریہ کے لیے چلے آئے۔" اس نے تفصیل سے بتایا۔ سب کے منہ کھلے رہ گئے۔

اشعر کے جیسا لاابالی و لاپرواہ لڑکا کسی کے کام آئے ایسا کسی نے سوچا نہیں تھا۔

"تم نے کتنے پیسے خرچ کیے؟" ایمل نے نرمی سے پوچھا۔

"گیارہ ہزار۔" وہ اس سے چار قدم دور جا کر بولا۔

"کیا؟ اتنے پیسے کہاں سے آئے؟"

"جو تم لوگوں نے بکرا خریدنے کے لیے دیے تھے۔ وہ پیسے میں نے ان انکل پر خرچ کردیے۔" اس نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

کچھ دیر پہلے جہاں سب کو اشعر پر پیار آرہا تھا اب سب نے آگے بڑھ کر اسے مارنا چاہا۔

"اور وہ بکرا؟"

"بکرا تو شیخ صاحب کا ہے، میں تو کرائے پر پورے دن کے لیے لے کر آتا تھا۔ رات کو سب کے سوتے ہی انہیں دے کر آتا تھا اور پھر دوبارہ صبح کو لے کر آتا تھا۔ شیخ صاحب کا بیٹا ہی میرا یہ کام کرتا تھا۔ بدقسمتی سے کل شیخ صاحب کو پتا چل گیا۔ انہوں

نے خوب اپنے بیٹے کی دھلائی کی۔'' وہ معصوم چہرہ بنائے بتا رہا تھا۔

ایمل کا جی چاہا اسے کچا چبا جائے۔

''اشعر کے بچے۔'' وہ تایا ابو کے پورشن کی جانب بھاگا۔ ایمل نے نیچے پڑی بال اٹھا کر کھینچ کر اسے ماری مگر ہائے ری قسمت وہ بال سیدھا جا کر گھر سے نکلتے مرتضیٰ کے پیٹ پر جا لگی۔

''آہ......!'' اچانک آنے والی افتاد پر اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر آہ بھری۔

ایمل ہونق بنی کھڑی تھی۔ اشعر نے مرتضیٰ کے پیچھے سے اسے منہ چڑایا۔ باقی سب ہنسی چھپانے کے لیے رخ بدل رہے تھے۔

☆......☆

جب سے بکرا ہمیشہ کے لیے شیخ صاحب کے ہاں چلا گیا تھا وہ افسردہ ہو گئی تھی۔ نہ وہ اشعر سے بات کر رہی تھی اور نہ سیدھے منہ کسی اور سے۔

تائی امی کا پاؤں ابھی تک مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی بھی چل پھر نہیں پا رہی تھیں۔

عید میں دو دن رہ گئے تھے۔ اس نے صبح ہی تائی امی کے ہاں واشنگ مشین لگا دی تھی۔ کپڑے دھل گئے تو اس نے پورے گھر کے جالے اتارنا شروع کیے۔ تمام کمروں اور ہال کے جالے اتارے اور صفائی کرنے کے بعد وہ کچن میں چلی آئی۔

ناشتہ کے تمام برتن دھو کر اس نے برش اٹھا لیا۔ کچن کی چھت کافی اونچی تھی۔ برش پکڑ کر وہ سلیب پر چڑھ گئی۔

وہ اپنے کام میں مگن رہی۔ مرتضیٰ کچن میں داخل ہوا۔ اسے سلیب پر چڑھے دیکھ کر وہ زیر لب مسکرایا۔

ایمل کی گھرداری، سلجھی طبیعت، ذمہ دارانہ رویہ، ان کچھ دنوں میں اسے بہت کچھ رکھا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس سے اسی وجہ سے چڑتا تھا کہ وہ ذمہ دار نہیں تھی۔ ہر وقت ہنسی مذاق، لاپرواہ سی ایمل اسے غصہ دلا دیتی تھی۔

وہ خاموش کھڑا اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ ایمل کی اس پر نگاہ پڑی تو بوکھلا گئی۔ خود تو مرتضیٰ کے اوپر نہیں گری مگر ہاتھ میں پکڑا برش ضرور مرتضیٰ کے سر پر زور سے جا لگا۔

وہ سر تھام کر چکرا کر رہ گیا۔ وہ گڑبڑا کر نیچے اتری۔

''سوری۔'' اسے مرتضیٰ سے ڈر لگ رہا تھا۔

''کون سی دشمنی نکال رہی ہو؟ کل پیٹ پر بال اور اب سر پر ڈنڈا۔'' وہ منہ خراب کر کے بولا۔

''اتفاق۔'' اس کے منہ سے پھسلا۔

''واہ بھئی واہ۔'' وہ ہنسا۔ اس کا ہنسنا ایمل کو پریشان کر گیا۔

''منہ پر کل سے بارہ کیوں بج رہے ہیں؟'' اس نے اس کے چہرے کو سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اشعر نے جھوٹ بولا۔ دھوکا دیا۔'' وہ سر جھکا کر خفگی سے بولی۔

''اس کے جھوٹ بولنے کے پیچھے ایک وجہ تھی۔ تم سب نے پیسے کسی اچھے کام کے لیے اکٹھے کیے تھے اور دیکھو ایک غریب مجبور بزرگ کے کام آ گئے۔ یہ کتنی خوش نصیبی کی بات ہے۔ بکرے تو ویسے بھی آ جانے ہیں۔'' اس نے پیار و نرمی سے سمجھایا۔

اس کا طریقہ اتنا اچھا تھا کہ ایمل کو اشعر پر پیار آنے لگا۔ اس نے ایسا سوچا ہی نہیں۔ وہ بس اپنے مفاد کا سوچے جا رہی تھی۔

''چلو تمہیں کچھ دکھانا ہے۔'' وہ باہر کی جانب گیا۔

ایمل اس کی تقلید میں صحن تک آئی۔ اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں سامنے کا منظر دیکھ کر۔

صحن میں تین ہیلتھی، قدآور بکرے کھڑے تھے۔ سفید، کالے اور براؤن رنگ کے بکروں کو دیکھ کر اس کی خوشی دیدنی تھی۔

''یہ ہمارے بکرے ہیں۔ دیر سویر تو خریدنے ہی تھے۔ تو آج میں نے بابا اور چاچو سے ضد کی۔ تمہاری

خوشی کے لیے۔'' وہ اس کے چہرے پر چھائی خوشی دیکھ کر دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ ایمل سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

''ایک چاچا کا ہے، ایک بابا کا ہے اور ایک تمہارا۔ آئی مین ہمارا۔''

''ہمارا کون سا ہے؟'' اس نے جھٹ سے پوچھا۔

''وہ سفید والا۔'' اس نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ وہ خوش ہوتے ہوئے سب کو پکار رہی تھی اور وہ اس کی معصوم سی خوشی سے محظوظ ہو رہا تھا۔

☆......☆

''تمہاری مہندی بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔'' اشعر صوفے پر لیٹا انگور کا گچھا کھاتے ہوئے بولا۔ ایمل نے اسے گھورا۔

''نہیں اشعر! ایمل آپی کی مہندی تو بہت اچھی لگی ہے۔ میں نے جو لگائی ہے۔'' مناہل اکڑ کر بولی۔

''خواب ہے یہ تمہارا۔'' اشعر نے شہروز کی طرف آنکھ دبا کر کہا۔

''مار کھاؤ گے۔'' اس نے ہتھیلی پر پھونک مار کر مصروف انداز میں کہا۔

اشعر نے انگور کا خالی گچھا اس کی جانب اچھالا جو سیدھا جا کر اس کی ہتھیلی پر گرا۔ ایمل اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگی۔ باقی سب بھی ہنستے ہوئے ان دونوں کے پیچھے پیچھے تھے۔

مرتضیٰ نے صحن میں ایمل کو اشعر کے پیچھے بھاگتے دیکھا تو زیر لب مسکراتا ہوا ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

''اب کیسا لگا؟'' ایمل نے اپنی ہتھیلی پر سجی مہندی اشعر کے گال پر لگا دی۔

''امی......امی......'' اشعر غصے سے چلا رہا تھا۔ مرتضیٰ کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔

''کیا بدلا لیا ہے۔'' فیضان نے شان میں ہاتھ لہرایا۔

''آپی میری محنت۔'' مناہل کو غصہ آیا۔

''سوری اسے سبق جو سکھانا تھا۔'' وہ مزے سے بولی۔

''اشعر جلدی جا کر منہ دھو لو، کل عید ہے اگر رنگ آ گیا تو کسی کو منہ دکھانے لائق نہ رہو گے۔'' فیضان پھرتی سے بولا۔

ہنستے ہنستے ایمل کی نگاہ مرتضیٰ پر گئی۔ وہ جھینپ گئی۔

☆......☆

سیاہ آسمان پر چاند کی باریک لکیر اس چنچل لڑکی کی شوخی سے ڈوبتی ابھرتی ہنسی۔ چند بکھری زلفیں اور مہندی سے سجے ہاتھ اسے وہ لمحے بہت اچھے لگ رہے تھے۔

مصروف کن رات گزری تو اگلے دن عید کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔ وہ سب صبح ہی صبح تیار ہو جایا کرتے تھے۔

ایمل اور مناہل، بسمہ کو دیکھتے تایا ابو کے پورشن آئی تھیں۔

تایا ابو نے سر پر ہاتھ رکھا۔ تائی امی نے بلائیں لیں۔ وہ بسمہ کو لیے صحن میں بکروں کی جانب جا رہی تھیں۔ مرتضیٰ عید کی نماز پڑھ کر واپس لوٹ رہا تھا۔ ایمل کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''عید مبارک۔'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''آپ سب کو بھی عید مبارک۔'' وہ خوشگوار موڈ میں بولا۔

''چلو! ہم بکروں کو دیکھ کر آتے ہیں۔ ویسے بھی آج ان کا آخری دن ہے۔'' وہ نگاہیں چراتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ صحن میں تینوں بکرے فخر سے کھڑے تھے۔ اس نے انہیں خوشی و مسرت سے دیکھا۔

''یا اللہ! ہماری اس قربانی کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمانا۔'' ایمل نے بکرے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دل سے دعا مانگی۔

......☆......



سائرہ عبدالغفار

افسانہ

"یہ" اور "اُن"

جب سے "وہ" ہمارے پڑوس میں آکر آباد ہوئے ہیں تب سے "یہ" ہم سے روٹھے روٹھے سے ہیں۔ میں بھی کیا کروں میرا ان پر دل آگیا اور پھر سے کہنا...... میرا "ان" پر دل آگیا۔ ابھی ہم یہ گانا گنگنا ہی رہے تھے کہ یہ آگئے اور آہم آہم کرکے سارا مزا کرکرا کردیا۔ خیر ہم بھی ہم ہی ہیں۔ ایک دن جب بھری دوپہر کو "یہ" گھوڑے گدھے سب بیچ سو رہے تھے تب ہم چپکے چپکے اُن کے دیدار کی خاطر پڑوس کی جانب کھسکنے لگے۔ کھسک کر اس لیے جا رہے تھے کہ مبادا یہ جاگ نہ جائیں اور ہم ان کے دیدار سے محروم نہ رہ جائیں۔ جیسے ہی ہم نے ان کی جھلک دیکھی ہم خوشی سے دیوانے ہی تو ہو گئے اور جھوم جھوم کر بھنگڑا ڈالنے لگے یا شاید لڈی ڈال رہے تھے یا پھر شاید ہپ ہاپ او ہو دیکھی ہماری دیوانگی؟ ہمیں تو ٹھیک سے اپنا ڈانس فارم بھی یاد نہیں بس یاد ہے تو وہ بول جو ہم گنگنا رہے تھے۔ ایسی دیوانگی دیکھی نہیں کہیں میں نے میں نے...... دیوانہ اپنا نام رکھ لیا......

"آہم آہم لو جی پہنچ گئے سر پہ...... پھر سے سارا مزہ کرکرا ہوگیا۔ پتہ نہیں یہ سمجھتا کیوں نہیں کہ دل پہ کسی کا زور نہیں چلتا بلکہ دل تو بے بس ہوتا ہے۔ کسی کو دیکھ کر آہیں بھرتا ہے کسی کی شان میں دن رات مدح سرا رہتا ہے۔ اب آپ لاکھ سمجھائیں مگر سنتا کہاں ہے بھئی مگر یہ کب سمجھیں گے اس بات کو؟ ایک دن یہ اپنا پسندیدہ ناشتہ تناول فرما رہے تھے کہ ان کی آواز سن کر ہم پر ایک بار پھر سے دیوانگی کا غلبہ چڑھا۔ ہم نے فوراً "یہ" کا ناشتہ ٹرے میں منتقل کیا اور بھاگم بھاگ اُن کے پاس جا پہنچے۔ فرطِ جوش میں آکر ہم نے ٹرے ان کے سامنے دھری تو انہوں نے ہمیں پہلی بار جی ہاں پہلی بار جی جی جی ہاں زندگی میں پہلی بار بھرپور گھوری سے نوازا۔ ہم تو شرم سے لال پیلے نیلے سب کے سب ہو گئے۔ لبوں پر بے ساختہ "پہلی بار محبت کی ہے۔ کچھ نہ سمجھ میں آئے میں کیا کروں" مچلا اور فوراً ہی "آہم آہم" نے مزہ کرکرا کردیا۔ یہ نہ بھی نچلے بیٹھتے ہیں اور نہ ہی ہمیں سکون سے بیٹھنے دیتے ہیں۔ ہم نے جلتی کلستی نظروں سے یہ کو باور کرانے کی کوشش کی۔ ہم ان سے نہیں ڈرتے نہ ہمیں ان کی پرواہ ہے۔ مگر یہ کیا؟ یہ کی آنکھوں کی کٹوریاں تو لبالب سمندر سے بھری ہوئی تھیں۔ ہمیں خود پہ بے تحاشہ غصہ آیا۔ یہ تو ہمارا ان سے التفات دیکھ کر فوراً ہی واک آؤٹ کر گئے مگر جاتے جاتے ہم پر گھڑوں پانی پھیر گئے۔ ہم شرمندگی کے اتھاہ سمندر میں غوطے، ڈبکیاں لگاتے اپنی ان کے یہاں موجودگی عذر، بہانہ جواز سب تلاشنے لگے مگر بے سود ہائے رے قسمت ہم بھاگتے دوڑتے گھر پہنچے تو یہ ناراض صورت سامنے بیٹھے تھے۔ دور کہیں سے "جا بے وفا جا ہمیں پیار نہیں کرنا" بج رہا تھا۔

ابھی ہم ٹھیک سے خود کو پچویشن میں ڈھال بھی نہ سکے تھے کہ فوراً یہ آہم آہم کرنا شروع ہوگئے۔ مجھے کبھی کبھی شک ہوتا ہے کہ یہ مولوی ہیں مگر کبھی نماز نہیں پڑھتے پھر نہ جانے کیوں گانوں سے خدا واسطے

کا بیر رکھتے ہیں۔
ابھی ہم یہ کو منانے کی کوئی ترکیب دماغ کے گھوڑے سرپٹ دوڑا کر معلوم کیا ہی چاہتے تھے کہ یہ نے ہم سے منہ پھیر لیا۔ یہ کے اس انداز پر ہمارا تو دل ہی کٹ کر رہ گیا۔ ہم نے یہ کے لیے دوبارہ ناشتہ بنایا اور وہ مزے سے سب بھول بھال کر ناشتے میں مصروف ہو گئے مگر ہمارا ننھا سا، نازک سا، نفیس سا اور آبگینہ سا دل یہ کے اس درجے بے رخی برتنے پر ٹوٹ سا گیا اور دل بے اختیار پکار اٹھا۔ ''دل کا کھلونا ہائے ٹوٹ گیا۔ کوئی لٹیرا آ کے لوٹ گیا۔ دل کا کھلونا ہائے ٹوٹ گیا''۔
''آہم آہم۔'' جی ہاں ہماری توجہ مانگی جا رہی تھی مگر اب ہم نے بھی سوچ لیا تھا کہ ہم یہ کو گھاس بھی نہ ڈالیں گے۔ جب ہم نے روتے منہ بسورتے اپنا حتمی اور فائنل فیصلہ اماں کے گوش گزار کیا تو وہ کھی کھی منہ میں دوپٹہ ٹھونس کر ہنسنے لگیں۔
ہم ہونقوں کی طرح منہ کھولے ٹکر ٹکر ان کی من موہنی صورت دیکھنے لگے مگر مجال ہے جو کھی کھی کو بریک لگا ہو یا توجہ کے ارتکاز میں رتی برابر بھی کمی واقع ہوئی ہو۔ ہمارے تو گویا تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ کانوں سے غصہ کے مارے دھواں برآمد ہونے لگا۔ (میرے خیال سے دھواں درآمد ہونے لگا) خیر جو بھی ہوا مٹی پاؤ جی...... ہم غصے سے پیر پٹختے واک آؤٹ کر گئے۔
ابھی ہم نے اپنے کمرے کی دہلیز پر قدم دھرے ہی تھے کہ ''آہم آہم'' کی مخصوص آواز سنائی دی۔ ہم نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے کہا کہ ہم کچھ نہیں گنگنا رہے۔ تبھی کہیں سے ہمارے آج کل کے فیورٹ گانے کی صدا سنائی دی۔ ''من جاوے مینوں شاپنگ کرا دے۔ من جاوے مینوں پکچر دکھا دے، ریکو یستاں پائیاں وے۔'' ہم نے دیدے گھما کر دیکھا تو یہ ٹیبلٹ پکڑے بتیسی کی نمائش کرتے نظر آئے مگر اتنی آسانی سے ہم بھی نہیں ماننے والے۔ سو ہم بھی سو نخرے دکھاتے کمرہ بند کر کے منہ لپیٹے سو گئے۔ دو گھنٹے بعد ہمارے چھوٹے بھائی عرف بی بی سی نیوز ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ہم حواسوں میں لوٹے بھی نہیں تھے کہ بی بی سی نیوز نے ہمیں ایک دل دہلا دینے والی خبر سنانے کا آغاز کر دیا۔
''باجی...... باجی......''
''آگے بھی پھوٹ بی بی سی کے بچے۔'' ہماری جھلاہٹ نیند خراب ہونے پر عروج پر تھی۔
''باجی باجی وہ ناں......
''اب میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا، پھر دیتے رہنا اپنی موت کی خبر سب کو۔'' میرے دھمکانے کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔
''باجی! اپنا D.J بھاگ گیا۔''
''کیا؟'' ہم نے دل پر ہاتھ رکھ کر دھڑکنوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔
''ہاں باجی! وہ ناں، D.J ناں۔''
ہم نے اس کی کمر پر کس کے دھموکا جڑا تو وہ دزدیدہ نظروں سے ہمیں گھورتے ہوئے سرپٹ بولنے لگا۔
''D.J ناں اپنا رسہ تڑوا کر بھاگ گیا۔ بڑے بھائی جان نے ان کے آگے گھاس رکھی تھی۔ اماں کہہ رہی تھیں کہ عروسہ تو اب D.J کو گھاس نہیں ڈالے گی اس لیے بھائی جان نے اسے گھاس ڈالی پھر مجھے کہا کہ D.J کو ٹہلا لاؤ۔ میں نے جیسے ہی رسہ کھولا وہ سرپٹ دوڑتا چلا گیا۔ بھائی جان اس کے پیچھے پیچھے گئے ہیں۔'' بی بی سی اپنا نیوز بلیٹن ختم کرتا چلا بنا اور ہم اپنا دل تھام کر بیٹھ گئے۔
''یااللہ! رقابت کی آگ نے یہ کیا گل کھلایا۔ ہمیں D.J سے بے رخی نہیں برتنی چاہیے تھی اور ان سے تو باقاعدہ پردہ کرنا چاہیے تھا۔ یااللہ ہمارا D.J ہمارا قربانی کا بکرا ہمیں لوٹا دیجیے۔ مولا! ہم وعدہ کرتے ہیں اس بار انہیں شکایت کا کوئی موقع نہیں دیں گے۔'' آنسو بے اختیار ہمارے گال بھگو رہے تھے۔ کافی وقت گزر گیا تھا اور ہمارا دل گنگنانے کو مچل رہا تھا۔
''انتہا ہو گئی انتظار کی۔ آئی ناں کچھ خبر میرے D.J کی۔''
''آہم...... آہم۔'' مخصوص آواز پر ہم چونک کر اچھل پڑے تبھی بی بی سی نے آ کر بتایا۔
''D.J آ گیا۔ D.J مل گیا۔''
بے اختیار ہم لہرا کر گنگنانے لگے۔ ''D.J مل گیا۔ D.J مل گیا۔ مجھ کو کیا ہوا ہے کیوں میں کھو گئی ہوں۔ پاگل تھی میں پہلے یا اب ہو گئی ہوں۔''
''آہم، آہم۔'' مولوی بکرے کی گونج دار آواز نے ہماری گنگناہٹ کو فوراً سے پیشتر خاموش کروا دیا۔
ہم تابعدارانہ انداز میں پھر سے D.J کی خدمت گزاری میں جت گئے۔ اب ہم پڑوسیوں کے بکرے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں ہیں۔ اگر ان کا بکرا خوب صورت ہے تو کیا ہوا؟ ہمارا بکرا ہمارا D.J بھی کوئی کم خوب صورت نہیں ہے اور ویسے بھی D.J اللہ کی راہ میں قربان ہونے جا رہا ہے اسی ایک وصف کی بنا پر D.J کی خوب صورتی چاند کو مات دینے والی ہے۔ ویسے D.J کی جدائی کا سوچ سوچ کر ہمارے ذہن کی اسکرین پر ایک ہی نغمہ سر بکھیرتا ہے۔

بچھڑے ابھی تو ہم بس کل پرسوں
جیوں گی میں کیسے اس حال میں برسوں
ہائے لمبی جدائی
چار دنوں کا ساتھ اور بابڑی لمبی جدائی
لمبی جدائی

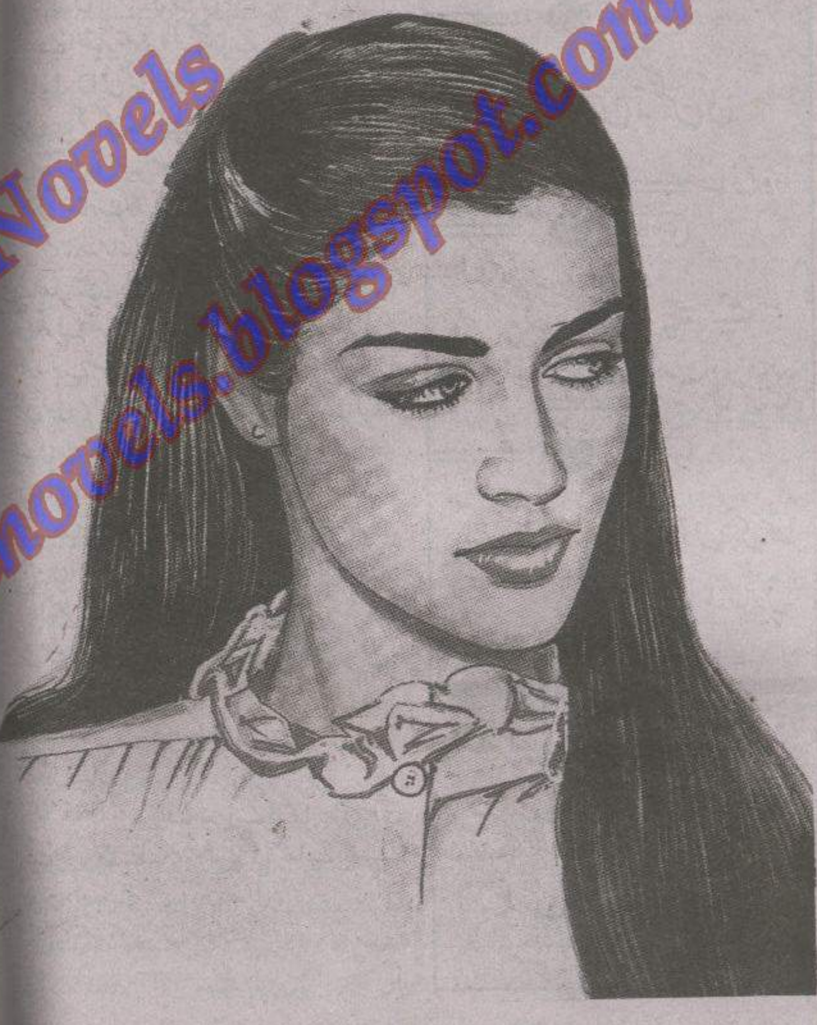
''آہم آہم۔'' اف نہ جانے D.J میری سوچ کیسے پڑھ لیتا ہے۔ ہم ہمیشہ یہ گتھی سلجھاتے سلجھاتے خود ہی الجھ جاتے ہیں۔ ''لمبی جدائی۔''
''آہم آہم۔'' اف مزہ کرکرا کر دیا۔

......☆......

عائشہ الیاس

افسانہ

انجام



قاسم ملک تخت پر بچھے لال قالین پر کسی بادشاہ کی طرح براجمان تھا۔ میڈیا والے اس کے گرد گھیرا ڈالے اس کی شان میں سوالات کرتے اس کے فخر و غرور کو اور بھی ہوا دے رہے تھے۔ لوگوں کا ہجوم اس قدر تھا کہ کندھے سے کندھا ٹکرا رہا تھا۔ برقی قمقموں سے سجا ٹینٹ اس کے لائے گئے قربانی کے جانور کی شان بڑھا تھا۔ سفید چاندنی بیل جو دراز قد و قامت اور صحت مندی کے باعث ہر ایک کو حیران کیے دے رہا تھا۔ اس پر گوٹے سے مزین لال چادر اور لال چمکتا تاج اسے سب میں شہزادے کا روپ دے گیا۔ اس کی شہرت کے چرچوں سے لوگ دور دراز سے دیکھنے کے لیے کھنچے چلے آ رہے تھے۔ اس کی لاکھوں کی قیمت سن کر لوگوں نے منہ میں انگلیاں داب لی تھیں۔

چاندنی بیل اِدھر اُدھر گردن گھماتا اپنی شان و شوکت سے قطعی بے نیاز تھا لیکن اس کا مالک فخر و غرور سے یوں بیٹھا تھا جیسے اصل شہزادہ وہی ہو۔ میڈیا والوں اور لوگوں نے کھچا کھچ بیل کی تصویریں اتارنا شروع کر دیں، جس پر حسرتوں سے بھرے دل صرف اسے دیکھ کر ہی اپنی حسرتوں کو تسکین کر پائے تھے اور ہر سال کی طرح پورے علاقے میں قاسم ملک کا جانور سب پر سبقت لے گیا تھا اور قاسم ملک کا سر ایک بار پھر فخر سے اونچا ہو گیا تھا۔

☆......☆

"فیروز!" قاسم ملک نے شیر کی سی دھاڑ سے اسے پکارا تھا اور وہ چونک کر پلٹا تھا۔

"جی تایا ابا!" وہ فوراً تیزی سے آیا تھا اور مودب لہجے میں بولا تھا۔

"ہاں بھئی پھر کیا جانور لیا تو نے اس بار؟" وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے طنزیہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ کم مائیگی کے احساس سے اس نے کچھ نہ بولا۔

"ابو! یہ جانور لاتا تھوڑی ہے پالتا ہے۔ وہ بھی چھوٹا میمنا سا بکرا...... ہاہاہا۔" قاسم ملک کا سولہ سالہ بیٹا تمسخر اڑاتے ہوئے بولا۔ وہ سب بھی مسکرا دیے۔

"اچھا! جا پھر لے کر آ اسے، میں بھی تو دیکھوں کیسی کھلائی پلائی کی ہے تو نے اس کی۔" انہوں نے حکم صادر کر دیا لیکن اس کا منجمد وجود نہ ہلا۔ پتا تھا آگے کیا ہونا تھا۔

"جا بھی۔" اسے یونہی کھڑا دیکھ کر انہوں نے اس کے کندھے پر دھموکہ لگاتے ہوئے بے رحمی سے کہا۔

چار و ناچار تھوڑی دیر میں وہ جھکے سر کے ساتھ اپنے دل جان کے ٹکڑے کو لے آیا۔ قاسم ملک نے عمیق نگاہوں سے اس پست قامت کے کمزور سے بکرے پر نظر ڈالی تھی۔ جس پر فوراً ہی ان کا قہقہہ چھوٹ گیا تھا۔

"اوئے بے چارے کو کچھ تو ڈھنگ سے کھلائی پلائی تو کراتا، یہ تو تجھ سے بھی گیا گزرا ہے...... بدو۔" ان کے تمسخر اڑاتے انداز پر اردگرد جمع بچے بھی ہنسنے لگے تھے۔ اس کی آنکھیں فوراً پانی سے بھیگ گئیں تھیں۔

"بدو...... بدو...... فیروز کا بکرا بدو......" بچے اس کے گرد منڈلاتے اسے چڑانے لگے۔ اس سے وہاں کھڑا ہونا دوبھر ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے آنکھوں کی پتلیوں میں تیرتا پانی سب کے سامنے بہہ جاتا، وہ وہاں سے دوڑا چلا گیا۔ پیچھے سے تمسخر اڑاتے قہقہے اس کے دل کو چھلنی کر گئے۔

☆......☆

وہ چھت پر بیٹھا رات کے پہر دور آسمان پر نظریں جمائے خلاؤں کو گھورتا غم سے نڈھال لگ رہا تھا۔ چاند رات کی بہاریں یوں تو آج عرش پر اتری ہوئی تھیں لیکن وہ سب سے بے نیاز زندگی کی تلخیوں کو چننے میں لگا ہوا تھا۔

پندرہ برس کی عمر میں زمانے کی اس میں اترتی کڑواہٹ نے اسے کچھ جلد ہی بڑا کر دیا تھا جس عمر میں بچے کھیلتے کودتے تھے، اس عمر میں وہ بیٹھا تلخ حقیقتوں سے لڑ رہا تھا۔ جب تک ابا زندہ تھے تو مجال تھی کوئی اس پر انگلی بھی اٹھا پاتا لیکن یتیمی کے سائے نے جو حقیقت کی بینائی عطا کی اسے اتنی کم عمری میں قربانی بڑی جوش و خروش سے منائی جاتی تھی لیکن ان کے بعد بیوہ ماں جو سلائیاں کر کے مشکل سے اسے پال پوس رہی تھی، وہ اسے بڑا جانور کہاں سے لا کر دیتیں اور اسے بڑا جانور چاہیے بھی نہیں تھا۔ اسے تو بس خواہش ہوئی تو اس بات کی کہ عید کے روز اس کے گھر بھی

قربانی ہو اور بیوہ ماں نے اس کی یہ خواہش ادھوری کبھی نہ چھوڑی تھی۔ جیسے تیسے کر کے وہ سال بھر پہلے ہی چھوٹا سا بکرا لے آتی۔ جس کی سالہا سال خدمت کر کے وہ قربان کرتے اور وہ اس میں بھی بڑا خوش تھا اور ایسے میں اپنوں کی مذاق اڑاتی نظریں اس کے حوصلوں کو پست کر دیتے۔ آج اس کا دل بڑی شدت سے چاہا تھا کہ ابا کہیں سے آ جائیں اور وہ ان کے گلے لگ کر سارے غم مٹا دے۔ شدت غم سے اس کی آنکھوں سے تو اتر سے آنسو بہہ گئے جنہیں اس نے بڑی بے رحمی سے پونچھ ڈالا تھا۔

☆......☆

عید کی جگمگاتی صبح کا سورج جونہی طلوع ہوا ہر طرف خوشیوں کی نورانی بارش برسنے لگی تھی۔ گائیں بیل آخری لمحوں کی کیفیت میں ڈکارنے لگے تھے اور بچے اس لمحے کو ضائع کیے بنا ان کی خدمت میں جتے ہوئے تھے۔ جب کہ بڑوں نے عید گاہ کی جانب نماز کی ادائیگی کے لیے رخ باندھا۔ وہ بھی نہا دھو کر نماز کے لیے چل دیا تھا۔ عید کی پر نور صبح نے اس کے بھی غموں کو سلب کر لیا تھا۔ خوشی کی چمک آج اس کے چہرے پر بھی نمایاں تھی۔ شاید یہی زندگی تھی جو دکھوں کے بعد خوشی سے جینے کا گر بھی سکھا دیتی ہے۔ نماز کے بعد قربانیوں کا فریضہ دیئے جانے لگا تھا۔ وہ بھی اپنے ناز سے پلے بکرے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے باخوشی تیار تھا۔

پھر قربانی کے بعد ماں گوشت کے حصے بناتی۔ اسے پیکٹ تھمائی جا رہی تھی اور وہ بھی جوش و خروش سے سارے کام انجام دے رہا تھا۔ ہر کام خیر و عافیت سے انجام پا گیا تھا لیکن تایا ابا کے گھر کی طرف بڑھتے قدم ایک بار پھر کمزور ہو گئے۔

پر آخر کو چلا ہی گیا۔ تایا ابا کے گھر کے باہر لوگوں کا ہجوم قابل دید تھا۔ وہ سمجھ گیا چاندنی بیل کی قربانی نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کروا لیا تھا۔ وہ بھی بھیڑ کو چیرتا اندر گھسنے میں کامیاب ہو ہی گیا لیکن دوسرے ہی پل سامنے کے منظر نے اسے سکتے میں مبتلا کر دیا تھا۔ چاندنی بیل قربان ہونے سے پہلے ہی مر گیا۔ اس کا زمین پر پڑا مردہ وجود ہر ایک کو حیران کر گیا تھا۔ اچھا خاصا اڑیل صحت مند بیل کیسے ختم ہو گیا۔ یہ بات سب کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس نے تایا ابا کو دیکھا جو سر تھامے بیٹھے تھے اور ان کے سولہ سالہ بیٹے کا رو رو کر برا حال تھا۔ اسے وہ پل یاد آیا تھا جب اس کے بھی آنسو اپنے جانور کے لیے یونہی درد سے بہے تھے لیکن بس فرق اتنا تھا وہ اپنا درد چھپا گیا تھا۔ جب کہ وہ بے چین ہو کر چھپا نہ پایا تھا۔ لوگوں کی چہ میگوئیوں نے تایا ابا کے بلڈ پریشر کو اور بھی اوپر چڑھا دیا تھا۔ وہ مزید وہاں ٹھہر نہ پایا۔ سیدھا گھر پلٹ گیا اور آ کر چپ چاپ ایک کونے میں خاموش سا بیٹھ گیا۔ آگہی کا لمحہ تھا کہ معصوم عقل دنگ تھی۔ خدا کی محبت اور جلال کو آج اس نے بڑے قریب سے محسوس کیا تھا۔ اللہ سے ڈرنے والے یقیناً گمراہ نہیں ہوتے اور نہ ڈرنے والے ہمیشہ رسوا ہوتے ہیں۔ یہ بات سمجھنے کو اس کی عمر کم تھی لیکن زندگی نے اسے کچھ اس طرح دکھایا تھا کہ اس کے لیے کچھ سمجھنا مشکل نہ رہا تھا۔

سکینہ اسے یوں گم صم دیکھ کر چونکی تھیں اور پھر پوچھے بنا نہ رہ پائی تھیں۔

"امی! تایا ابا کا جانور قربان ہونے سے پہلے ہی مر گیا ہے۔" جس کا جواب اس نے بہت ٹھہرے لہجے میں دیا تھا۔ آگے سے وہ حق دق سی رہ گئی تھیں۔

"امی! کیا اللہ تعالیٰ نے تایا ابا کی قربانی قبول نہیں کی؟"

"ایسا نہیں کہتے فیروز۔ ہم نہیں جانتے کیا سچ ہے اس لیے کسی کی آزمائش کے وقت تنقید کرنے کا حق انسان کے پاس نہیں ہے۔" آگے سے اس نے فوراً ٹوک دیا۔

"امی! یہ میں نہیں وہاں کھڑے لوگ بول رہے تھے۔" اس نے بھی فوراً وضاحت دی۔

"جو بھی ہو بس تم کچھ مت کہنا۔ یہ قدرت کے کام ہیں وہی بہتر جانتا ہے۔" آگے سے وہ اثبات میں گردن ہلا گیا۔

"کچھ گوشت باقی رہ گیا ہے بانٹنے والا جلدی آؤ تاکہ یہ کام ختم کریں۔" وہ اسے بولتی ہوئی باہر نکل گئیں اسے سب سمجھ آ گیا تھا لیکن وہ انجان بن گئیں۔ بس پتا تھا تو اتنا اللہ جسے چاہے جیسا صلہ دے پر یقین رکھتے ہوئے یہ ضرور معلوم تھا، اللہ تکبر کرنے والوں کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ ☆

رابعہ افضال خان

افسانہ

یہ وطن ہمارا ہے

''عبدالباری یہ کیا کر رہے ہو تم؟'' وہ سہ پہر دروازے سے اندر گھسا تھا اور چھوٹے سے کچے صحن میں بجی رنگ برنگی جھنڈیوں کو نوچ کر پھینک رہا تھا۔ جب کچن سے نکلی مریم مڑ کر اس کے پاس آئی تھی اور اس کا کالر کھینچتے تیز لہجے میں بولی تھی۔

''شٹ اپ۔'' عبدالباری اس کے ہاتھوں سے اپنی شرٹ کا کالر نکالتے اس پر غرایا تھا۔

''اتنی محنت سے میں نے اتنی تیز گرمی میں سارا دن لگا کر جھنڈیاں لگائی تھیں اور تم نے لمحے میں میری سارے دن کی محنت پر پانی پھیر دیا۔'' وہ زمین پر پڑی جھنڈیوں کو دیکھتے نم آنکھوں سے ڈھیروں شکنیں لیے سرخ ڈوروں والی اس کی آنکھوں



میں دیکھتے بھرائے لہجے میں بولی تھی۔

''مجھے یہ دیکھاوا پسند نہیں ہے اور آج کے بعد اس طرح بچوں والے شوق میرے سامنے میرے گھر میں مت پالنا، کوئی ضرورت نہیں ہے میرے گھر کو ان جھنڈیوں سے سجانے کی۔'' وہ آگ اگلتے لہجے میں کہتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا جیسے گھر میں آیا تھا۔ ویسے ہی باہر نکل گیا تھا۔ پیچھے وہ بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ پھر آنکھیں صاف کرتی زمین پر پڑی پھٹی ہوئی جھنڈیوں کو اٹھا کر اس نے آنکھوں سے لگا کر چوما تھا۔ بے اختیار ہی اس کی آنکھوں سے دو موتی نکل کر جھنڈیوں میں گم ہو گئے تھے۔ عبدالباری جتنا بدگمان تھا مریم اتنی محب وطن تھی۔

☆......☆

وہ رات تقریباً ڈیڑھ بجے کے قریب دوبارہ گھر آیا تھا۔ مگر گھر میں داخل ہوتے ہی اس کے ماتھے پر لاتعداد بل نمودار ہوئے تھے۔ چھوٹا سا صحن ایک مرتبہ پھر رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجا تھا۔ اس کا دل جل جل کر خاک ہوا تھا۔ دل میں بدگمانی کچھ اور بڑھی تھی۔ وہ صبح مریم کی خبر لینے کا سوچتا ایک نظر صحن میں بے خبر سوئی اپنی بیمار ماں پر ڈالتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

وہ بیڈ پر بیٹھا شوز کے کیس کھول رہا تھا کہ جبھی مریم کھانے کی ٹرے ہاتھوں میں تھامے اس کے کمرے میں آئی تھی۔

''میرے منع کرنے کے باوجود تم نے یہ جھنڈیاں دوبارہ کیوں لگائیں؟'' وہ جوں ہی چھوٹی ٹیبل پر ٹرے رکھ کر گھومی پیچھے کھڑے عبدالباری نے اس کا بازو دبوچ کر خونخوار لہجے میں بولا تھا۔

''میرا بازو چھوڑو باری! مجھے درد ہو رہا ہے۔'' وہ نم ہوتے لہجے میں بولی تھی۔

''پہلے مجھے جواب دو۔'' وہ بھی اسی سرد لہجے میں بولا تھا۔

''کل چودہ اگست ہے ہماری آزادی کا دن ہے تو اس لیے میں نے جھنڈیاں لگائیں۔'' وہ جلدی سے بولی تھی۔

''ہاں آزادی کا دن بہت سکھ دیا ہے اس آزاد وطن نے ہمیں جو تم اس کی آزادی کا جشن منانے کو اتاولی ہو رہی ہو۔'' وہ طنزیہ ہنسا تھا۔

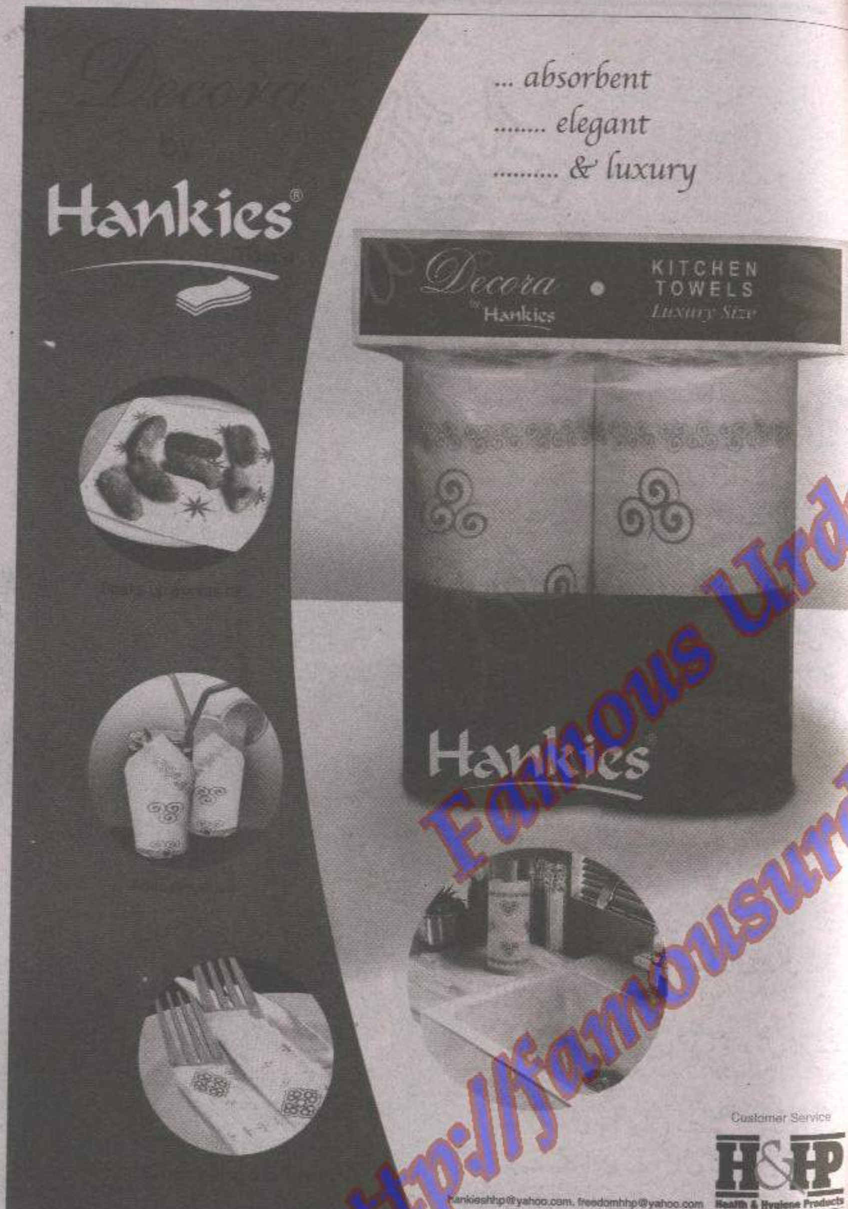
''آج انٹرویو کیسا رہا؟'' مریم نے اس کے طنز کو نظر انداز کر دیا تھا۔

''انٹرویو تو ہر دفعہ ہی بہت اچھا ہوتا ہے مگر اس کے آگے کچھ اچھا نہیں ہوتا۔

میری طرح آج بھی اور بہت سے مفلسی کے مارے غربت کے ستائے نہ جانے کتنے پڑھے لکھے پوزیشن ہولڈر نوجوان موجود تھے جن کی آنکھوں میں اس جاب کو حاصل کر لینے کی خواہش چھپی تھی مگر پھر ہر دفعہ کی طرح انٹرویو کی فارمیلٹی پوری کی گئی اور پھر اناؤنس منٹ کہ اسسٹنٹ مینیجر کی پوسٹ کے لیے انتخاب ہو چکا ہے۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں اور مفلسی و غربت کے ستائے بے چارے وہاں جاب کی خواہش لیے ناامید ہو کر چلے گئے۔ یہ حال ہے ہمارے اس ملک کا ہر جگہ بدحالی و غربت و افلاس کے ستائے لوگ ہر پروفیشنل میں کرپشن جہاں لوگ پیسے کے پجاری ہیں۔ جن کی بدولت قابل پوزیشن ہولڈر لوگ سڑک پر مزدوری کرتے ہیں اور انگوٹھا چھاپ اے سی میں بیٹھ کر حکم چلاتے ہیں۔ میرا تو دل اچاٹ ہو گیا ہے اس ملک میں بدحالی و کرپشن کو دیکھ دیکھ کر اور ویسے بھی کیا فائدہ ایسے علیحدہ وطن کا جو ہمیں کچھ نہ دے سکے۔'' اس کے لہجے میں تلخی کے ساتھ ساتھ آرزدگی بھی موجود تھی۔

''اور ہاں آج کے بعد اس طرح کا کوئی تماشا مت لگانا۔ ویسے بھی جو ملک ہمیں کچھ نہ دے سکے، اس کی آزادی منانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ حد درجہ تلخ لہجے میں بولا تھا۔

''بدگمان ہونے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے عبدالباری! یہ ہمارا وطن ہے ہمارا اسلامی ملک ہمارا



پاکستان ہے، جہاں ہم آزادی کے ساتھ اس کی فضا میں کھلی سانس لے سکتے ہیں۔ آزادی سے اپنی مرضی سے اپنے اللہ اور اس کے رسول کا نام لے سکتے ہیں۔ جہاں ہم خوشی خوشی پوری آزادی اور مرضی سے اپنا ہر تہوار منا سکتے ہیں۔ آزادانہ اسلامی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ جہاں مسجدوں میں بنا کسی خوف کے لاؤڈ اسپیکر میں اذان دی جاتی ہے۔ اس ملک نے ہمیں ہماری پہچان دی ہے دنیا بھر میں لوگ ہمیں پاکستانی کہہ کر پکارتے ہیں۔ ہم پاکستانی ہیں ایک آزاد ملک کے شہری، ہمارے لیے تو یہی بڑے فخر کی بات ہے، آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے آزادی کی اس روشن صبح کے لیے ان گنت قیمتی جانوں کی شام ہوئی ہے۔ ہجرت کے باب میں مصائب و قربانیوں کی دلخراش داستانیں رقم ہیں۔ لاکھوں لوگوں کا لہو اس سرزمین کی آزادی کے لیے پانی کی طرح بہایا گیا ہے۔ لوگوں نے اپنے بے حد پیارے عزیز رشتوں کو خون میں لت پت تڑپتے دیکھا ہے۔ ہزاروں لوگوں کے قیمتی خون کی دردناک داستانیں رقم ہوئی ہیں جب کہیں جا کر ہمیں ایک آزاد اسلامی ملک پاکستان کی صورت ملا ہے۔ آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ جس کے لیے ہمارے آباؤ اجداد نے اپنی جانوں کی بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ یہ تو ہم لوگ ہی اس قابل نہیں تھے کہ ہمیں ایک آزاد اسلامی ریاست پاکستان کی صورت ملتی، ہمارے بزرگوں نے اور ہمارے پیارے قائد محمد علی جناح نے تو بڑے پیار خلوص اور نیک نیتی سے پاکستان کی بنیاد رکھی تھی، پھولوں کی طرح مہکتا گلشن دیا تھا اس میں رشوت، سفارش، لوٹ مار، خون خرابہ، کرپشن کا گھن تو ہم جیسے بے ضمیر لوگوں نے لگایا ہے آزادی ایک نعمت ہے اور یہ ہمارے لیے خدا کی رحمت ہے، جس کی حفاظت کرنا ہم سب کا اولین فرض ہے۔ گو کہ تحریک پاکستان کے دوران جو خواب دیکھے تھے۔ وہ ابھی پورے ہونا باقی ہیں اگر 1947ء کا جذبہ ایک بار پھر ہم لوگوں میں بیدار ہو جائے تو ہم اپنے بازوؤں کی طاقت سے بھنور میں پھنسی کشتی کو نکال سکتے ہیں۔ اتنا کچھ دیا ہے آپ کو اس ملک نے ایک دولت کی فراوانی نہیں ملی تو اس ملک کی دی ہوئی ہر نعمت سے منکر ہو گئے اور بہت خودار بنتے ہیں ناں تو آپ کیوں نہیں کچھ کرتے اس ملک کے لیے، یہ وطن آپ کا اپنا ہے آپ کا بھی فرض بنتا ہے کہ اپنے طور پر اس کی بہتری اور ترقی کے لیے کچھ کریں، زیادہ نہ سہی کوئی ایک چھوٹا سا کام ہی کر لیں جو وطن کے لیے آپ کا حق ادا ہو جائے۔" وہ بولی تو ایک تواتر سے بولتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کا گلا رندھ گیا تھا اس کی اتنی لمبی تقریر کے جواب میں عبدالباری سر جھکائے زمین کو گھورتا رہا تھا۔ ایک لفظ بھی نہ بولا تھا۔

"میں بھی پاگل ہوں جو ایک پتھر سے سر پھوڑ رہی ہوں۔" وہ بے حس کھڑے عبدالباری پر ایک نظر ڈالتے تیزی سے جانے کو پلٹی تھی کہ اس کی نازک کلائی عبدالباری کی گرفت میں مقید ہوئی تھی۔

"سوری آئندہ خیال رکھوں گا، بے روزگاری نے کچھ زیادہ ہی بدگمان کر دیا اپنے اس پیارے وطن سے تم ٹھیک کہتی ہو مریم! آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور انشاء اللہ پوری کوشش کروں گا کہ اپنے اس پیارے وطن کے لیے اپنے طور پر ہم کچھ کر سکیں لیکن تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔" وہ اس کی روئی روئی آنکھوں میں دیکھتا دھیرے سے دلکشی سے مسکرایا تھا۔

"میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں عبدالباری۔" وہ بھی دھیرے سے مسکرائی تھی۔

دیے سے دیا جلتا ہے اور پھر سارے دیے روشن ہو جاتے ہیں۔ مریم نے اپنے حصے کا حق ادا کر دیا تھا۔ اس نے ایک دیا روشن کر دیا تھا اور انشاء اللہ ایک ایک کر کے سارے دیے روشن ہو جائیں گے اور ہمارا یہ پیارا ملک ایک دن ضرور امن و امان اور خوش حالی و ترقی کی طرف گامزن ہو گا۔☆

فرح ناز محمد رفیق

افسانہ

دل کی مکین

وہ گھر کے دروازے پر پہنچی تھی کہ سامنے والوں کے گارڈن پر نظر پڑی تھی۔ اپنے گھر جانے کے بجائے وہ اندھادھند ان کے گارڈن میں گئی تھی۔ لین چیئر پر ہادی کے ساتھ بیٹھا شخص اس کی دیدہ دلیری پر حیران تھا۔

''ایکسکیوزمی میں! آپ کا دماغ ٹھیک ہے۔ کس طرح آپ میرا بکرا لے کے جارہی ہیں۔'' اس نے روکا تھا۔

''میرا دماغ خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہمارا بکرا ہے ہم سمجھ رہے تھے گم ہوگیا ہے مگر یہ تو آپ نے چوری کیا اور ڈھٹائی سے سامنے باندھ بھی دیا۔

''اتبغ! کیا بول رہی ہو۔''

''ہادی بھائی! آپ تو رہنے دیں۔ دوست کی ہمدردی میں خاموش ہو کے بیٹھ گئے۔ حالانکہ بکرا تو آپ خود خرید کر لائے تھے۔ آپ کے دوست کی اصل جگہ تھانے میں بنتی ہے۔''

''انیف ہادی! یہ تمہاری بہن ہے تو برداشت کر رہا ہوں۔ ورنہ تم جانتے ہو۔''

''رہبان یار! سوری اتبغ کو کہیں معلوم۔''

''بھائی ابھی بھی آپ سوری کررہے ہیں۔ اتنا ڈرتے کیوں ہیں۔ ویسے آپ مسٹر رہبان مجھ سے سوری کریں، ورنہ آپ کی جگہ بنتی تو تھانے میں ہی ہے۔''

''ہاں جیسے آپ کی جگہ اسی گاڑی کے آگے بنتی ہے جس میں آپ کو باندھا جاتا ہے۔'' رہبان کی برداشت جواب دے گئی تھی۔

''ہاں تو کیا ہوا کسی کے کام آرہی ہوں۔ آپ کی طرح چوری نہیں کرتی۔'' اتبغ کے خاک پہلے نہیں پڑا تھا اور ہادی ہنس پڑا تھا۔ اب رہبان کی ہنسی بھی لازمی تھی۔

''بھائی ابو سے شکایت کروں گی آپ کی اور آپ کے دوست کی۔'' وہ بکرے کی رسی تھامے مڑگئی تھی جو بڑے مزے سے ان کی بحث کا فائدہ اٹھا کر لان کی گھاس کھا رہا تھا۔

''اتبغ! یہ بکرا رہبان کا ہی ہے۔ اصل میں ہم دونوں نے ایک ساتھ بکرے لیے تھے، جو جڑواں تھے مگر تم غور سے دیکھو ہمارے بکرے کے سیدھی طرف کالا نشان ہے اور اس کے الٹی طرف اور ہمارا بکرا صبح مل گیا تھا۔'' واقعی یہ ان کا بکرا نہیں تھا۔

''اوہ...... میں سمجھی یہ ہمارا ہے خیر مجھے دیر ہو رہی ہے آئی ہیو ٹو گو۔''

''رکیں......! اسے واپس باندھیں جہاں سے کھولا ہے۔'' رہبان کو آگ لگ گئی تھی اس کی شان بے نیازی پر۔

''کیوں آپ ڈرتے ہیں خود باندھ لیں میرے پاس فالتو ٹائم نہیں ہے۔''

''اللہ کی بندی جاؤ یہاں سے۔'' اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے ہادی نے، کیوں کہ رہبان کے تیور اچھے نہیں تھے۔ شام تک پورے گھر میں اس کارنامہ پھیل چکا تھا۔

''اتبغ حیرت ہے تم نے رہبان بھائی کو چھوڑ دیا۔ انہوں نے تمہیں ایسے کہا پھر بھی؟''

''کیا کہا انہوں نے تو مجھے کچھ بھی نہیں کہا؟'' وہ حیران تھی فزا کی بات پر۔

''ایڈیٹ جو گاڑی کے آگے ہوتا ہے وہ گدھا ہوتا ہے اور تم ایک گدھی ہو ٹھیک کہا تھا۔ انہوں نے۔'' فزا نے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔

''کیا ان کا یہ مطلب تھا۔ میں جواب ضرور دوں گی۔'' وہ بپھر کر اٹھی تھی کہ ہادی نے روک لیا۔

''بس ختم کرو، پہلے ہی اتنا تماشا کر چکی ہو۔'' امی نے ڈپٹا تھا۔ وہ خاموش تو ہوگئی تھی مگر وقتی طور پر۔

''اگر آج مجھے کام نہ ہوتا تو میں چھٹی کرتی۔ عید سے پہلے کے یہ آخری دن سب جگہ گندگی اور جانور کھڑے ہوتے ہیں خیر میں ڈرتی نہیں ہوں بس ایسے ہی کہہ رہی ہوں۔'' فزا تک اپنی معلومات پہنچا رہی تھی واپسی میں گلی میں قدم رکھا تھا کہ رہبان گیٹ کے باہر نظر آگیا۔ اسے جانے کیا سوجھی کہ برابر والوں کی گائے جو پہلے ہی مولا جٹ مشہور تھی اس کا چارا اٹھا کر رہبان کے پاس پھینکا اور اس کی رسی کھول دی۔ تاکہ وہ رہبان پر چڑھائی کرے مگر اپنا ہی کھونٹا مضبوط نہ ہو تو کیا کریں۔ اس گائے محترمہ نے اتبغ سے ہی دشمنی کا آغاز کیا کہ چارہ تو اسی نے اٹھایا تھا۔ پھر اتبغ تھی اور اس کی چیخیں رہبان اس کی کارروائی دیکھ چکا تھا۔ اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے گھر میں دھکیلا تھا اور بمشکل اس گائے کو قابو کیا۔ جس کا سینگ ہلکا سا اس کے ہاتھ میں لگ گیا تھا۔ جس سے اب خون بہہ رہا تھا۔ گائے چوکیدار کے حوالے کر کے وہ اندر گیا تھا جہاں اتبغ شرمندہ سی کھڑی تھی۔

''سوری...... وہ میں......''

''آپ جاسکتی ہیں آؤٹ۔'' رہبان نے سختی سے کہہ کر ہاتھ پکڑ کر باہر نکالا تھا۔





''اتبع شاکڈ تھی۔ اتنے روڈ بیویئر پر ابھی وہ خود کو سنبھالتی گھر میں داخل ہوئی تھی کہ فزا نے اس کے منہ میں مٹھائی رکھی تھی۔

''مبارک ہو رہبان بھائی کا ایک سال پرانا پرپوزل ابو نے منظور کرلیا اندر ان کے پیرنٹس بیٹھے ہیں۔ تیار ہو کے آنا۔''

''مگر امی نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔'' دوسرا شاکڈ تھا اس کے لیے۔

''بیٹا! کیا تمہیں ہم پر بھروسا نہیں ہے۔'' امی نے حیرت سے دیکھا۔

''نہیں وہ بات نہیں ہے مگر وہ بہت بدتمیز غصے والے ہیں۔'' وہ رودی تھی۔ ''ہادی کا دوست ہے ہم سب جانتے ہیں۔ بہت کائنڈ نیچر ہے اس کی بیٹا۔'' امی نے سمجھایا تھا۔ ''ہاں کائنڈ نیچر ہے تبھی ذرا سے مذاق پر مجھے ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا۔''

''ہیں یہ کب ہوا؟'' فزا حیران تھی اور اس کا مذاق سن کے امی کے ساتھ ہادی اور فزا نے بھی سر پیٹ لیا تھا۔

''وہ زخمی ہو گیا اور تمہارا مذاق ٹھہرا واہ کب سدھرو گی تم۔''

''السلام علیکم!'' ہادی برس رہا تھا۔ تبھی رہبان اندر آیا تھا۔

''سوری میں لیٹ ہو گیا۔''

''چلو بیٹا! تم اندر چلو۔'' امی اسے فوراً اندر لے گئی تھیں مبادا اتبع کو دیکھ کر پھر بگڑ جائے۔

''رہبان! یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہوا؟'' چائے پیتے ہوئے سب کی نظر اس تک گئی تھی۔

''کچھ نہیں امی! سائیڈ دراز میں آ گیا تھا۔'' گہری نظر اتبع پر ڈال کر جواب دیا تھا جو شاید رو کر بیٹھی تھی۔

''آنٹی! یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔'' اچانک اتبع نے رہبان کی امی کو مخاطب کیا تھا اور وہ پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔ اتبع نے غلط فہمی سے شروع جنگ کا تھوڑی دیر قبل ہونے والا انجام سب کو بتا دیا تھا۔

''اتبع اگر رہبان چھپا رہا تھا تو تم نے کیوں بتایا ہو سکتا ہے اب میں یہ رشتہ ختم کر دوں۔'' رہبان کی امی نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''اچھا ہے ختم کر دیں ورنہ یہ ابھی خاموش ہیں۔ بعد میں بدلہ لیں گے اور میں جو کرتی ہوں چھپ کے نہیں کرتی ان کی طرح جھوٹ بھی نہیں بولتی۔'' وہ فخریہ بتا رہی تھی۔

''کیوں رہبان! بدلہ لو گے تم؟'' اتبع کے ابو نے پوچھا تھا۔

''ہاں مگر بعد میں نہیں ابھی وہ گائے کسی کے قابو میں نہیں آتی خود اسے واپس باندھ کے آئیں۔ یا پھر میرے ہاتھ پہ بینڈیج کریں چوائس ان کی ہے کیا کرنا چاہتی ہیں۔'' اتبع سمیت تمام لوگ اس کی شرارت سمجھ گئے تھے۔ اتبع اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

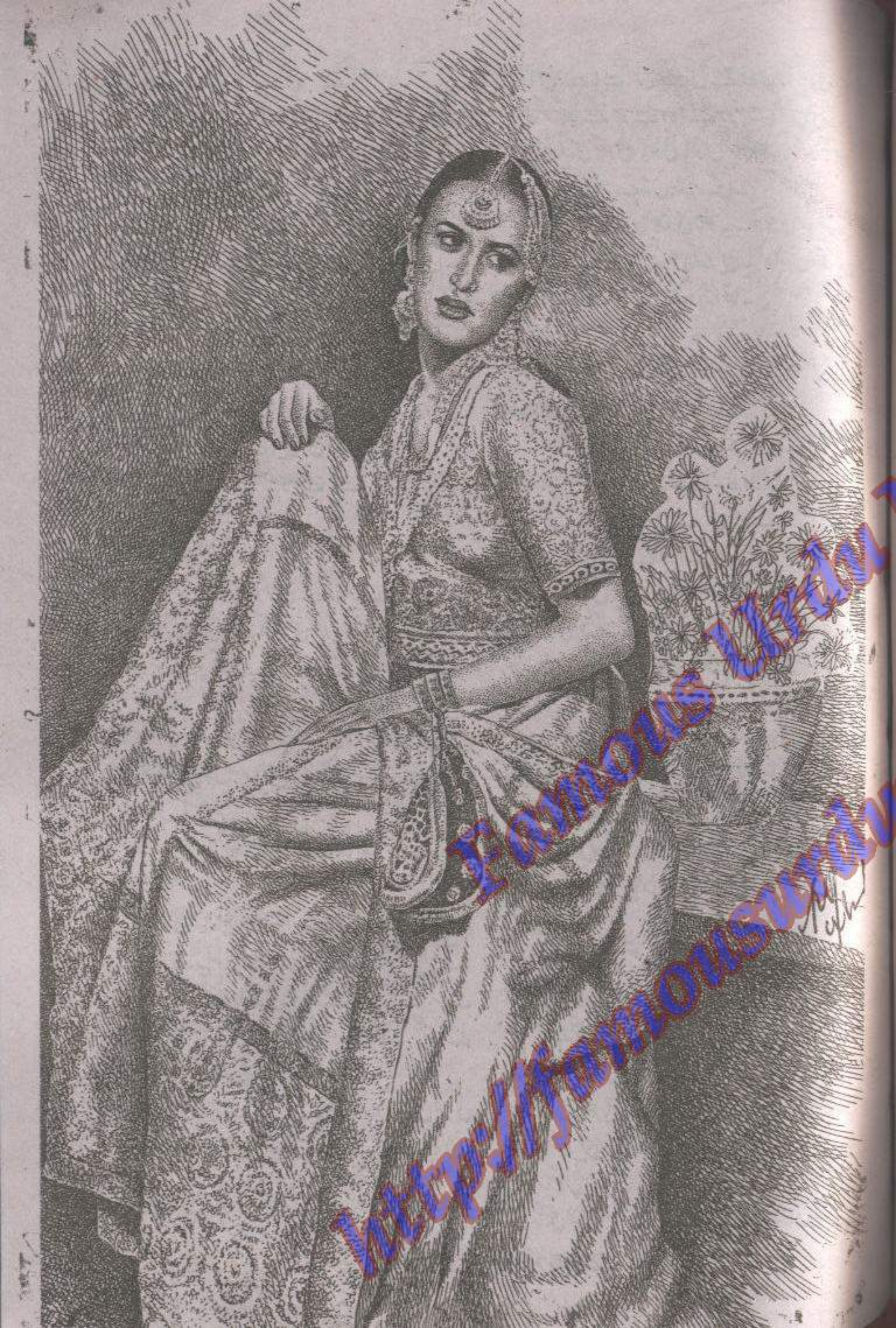
''کہاں جا رہی ہو۔'' فزا نے روکا تھا۔

''اس گائے کو واپس باندھنے۔'' اس نے چوائس کر لی تھی۔

''اور ہاں آپ بھی تیار ہو جائیں ہم دونوں ایک ہی گاڑی کے آگے فٹ آ سکتے ہیں۔'' وہ اتبع ہی کیا جو بخش دے۔ سب کے قہقہے بے ساختہ تھے۔ رہبان سمجھ گیا تھا اسے اب سمجھ آیا ہے۔

''اچھا مستقبل کی ڈاکٹر صاحبہ میرا بیٹا زخمی ہے فرسٹ ایڈ تو دے دیں۔'' آنٹی نے کہا تو اسے بادل ناخواستہ اس کے سامنے بیٹھنا پڑا تھا صد شکر رہبان کا دھیان ہادی پر تھا۔ بینڈیج کر کے وہ کمرے میں آئی تو خوب صورت بوکے اور کارڈ اس کے منتظر تھے۔ پھولوں کی خوشبو اور کارڈ کی منفرد تحریر بتا رہی تھی کہ وہ رہبان کے دل کی مکین ہے اور تبھی اس کی خطائیں رہبان کے سر آنکھوں پر ہیں۔

☆



حنا اشرف

افسانہ

عیدِ ایثار اور خوشی

''شرم نہیں آتی تم لوگوں کو اس طرح کرتے ہوئے؟'' وہ جیسے ہی گیٹ سے اندر داخل ہوئے ثمرین نے غصے سے کہا۔

''ہم نے کیا کیا ہے؟'' عدیل اور رامش نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان سے آخر کیا بدتمیزی سرزد ہوئی ہے جو وہ انہیں جارحانہ تیور لیے غصے سے دیکھ رہی ہے۔

''حالت دیکھی ہے تم لوگوں نے اپنی ابھی اتنی محنت سے میں نے صفائی کی اور تم لوگوں کی وجہ سے مٹی دوبارہ اندر آ گئی ہے۔'' دونوں نے جلدی سے اپنے حلیے کا جائزہ لینا مناسب سمجھا۔ بجائے اسے جواب دینے کے۔

صبح سے منڈی میں بکرا تلاش کرتے اتنا وقت ہو گیا تھا ایسی حالت تو پچھلے دو دن میں بھی نہیں ہوئی تھی جو آج ہوئی۔

''پلیز ثمر! یہ لڑائی، غصہ بعد میں کر لینا، ابھی اندر جانے دو تھکاوٹ سے برا حال ہے اور بکرے آج بھی نہیں ملے۔'' عدیل نے معصومیت سے کہا جب کہ رامش نے جلدی سے اندر کی طرف دوڑ لگائی اس سے پہلے کہ ثمرین سارے صحن کی دھلائی دوبارہ ان سے کرواتی، عدیل نے بھی رامش کے پیچھے جانے کی جلدی کی، وہ نہیں چاہتا تھا کہ ثمر اکیلے صرف اس کی درگت بنائے، رامش کو وہ صرف غصہ دکھاتی مگر اپنے معصوم بھائی کو تھپڑ بھی ساتھ لگاتی، ثمر نے غصے سے دونوں کو کوسنا شروع کر دیا تھا۔

☆......☆

آج پھر وہ صبح صبح تیار ہو کے بکرا منڈی جانے لگے۔ وہ جیسے ہی لاؤنج میں آئے کیا دیکھتے ہیں کہ محترمہ ثمر صاحبہ نک سک سے تیار بڑی ادا سے صوفے پر بیٹھی بار بار ٹائم دیکھ رہی ہے۔

''کہاں جانے کی تیاری ہے محترمہ عزت مآب ثمرین صاحبہ؟'' رامش نے ادب سے اسے مخاطب کیا جب کہ ثمر ادائے بے نیازی سے بیٹھی رہی پھر ٹکر ٹکر دونوں کو دیکھنے لگی۔

''ٹائم دیکھا ہے اتنی دیر ہو گئی ہے۔ اب جلدی چلو کہیں زیادہ دیر نہ ہو جائے۔ ایک نمبر کے نکمے ہو تم لوگ آج میں بابا جان سے شکایت لگاؤں گی۔ رامش تمہیں تو تہذیب چھو کر بھی نہیں گزری۔'' اس نے خاص رامش کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔

''او بی بی! میں بڑا شریف سا بندہ ہوں اور تہذیب کو بھلا ضرورت ہی کیا ہے جو مجھے چھو کر گزرا کرے۔'' رامش نے لڑکا عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا کر دوبدو اسے جواب دیا۔

''میں نے تمیز والی تہذیب کا کہا، تمہاری اس ہمسائی تہذیب کا نہیں جو تمہیں روزانہ صبح شام اپنے ٹیرس پر کھڑے ہو کر سلام دعا کرتی ہے، خوش فہمیاں تو ملاحظہ فرمائیں جناب کی۔ کتنا ہی اچھا ہوا گر یہ لڑکا خوش فہمیوں کی پوٹلی ایک طرف رکھ کر شرافت سے

ایک آدھ بات کا جواب بھی دے۔‘‘

’’اف اب بس بھی کرو کیا مصیبت ہے۔ ایک تو منڈی میں اتنا خوار ہونا پڑے گا اور اوپر سے تم لوگوں کی تکرار۔‘‘ عدیل نے کوفت سے کہا۔

’’پلیز ثمر! تم اپنی فرینڈ کی طرف کسی اور دن چلی جانا، فی الحال ہمیں بہت دیر ہو رہی ہے اگر قربانی کے لیے آج بھی بکرے نہ ملے تو بابا جان بہت ناراض ہوں گے۔ عید میں بہت کم دن رہ گئے ہیں اور ہمیں ابھی تک ایک بھی ڈھنگ کا بکرا نہیں ملا۔‘‘ عدیل نے بڑے پیار سے اسے کہا اور باہر کی طرف جانے لگا۔

’’سنو تو۔ میں نے اپنی کسی دوست کی طرف نہیں جانا۔‘‘ ثمر نے بڑی معصومیت سے آنکھیں ٹپٹپاتے ہوئے کہا۔

’’تو پھر؟‘‘

’’میں نے تو تم لوگوں کے ساتھ جانا ہے۔ اتنے دن ہو گئے ہیں ایک بکرا ابھی نہیں ملا۔ آج میں ساتھ چلتی ہوں۔ دیکھنا اب بکرے لے کر ہی آئیں گے۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ رامش اور عدیل نے چیختے ہوئے کہا۔

’’کیا مصیبت آن پڑی ہے ذرا بھی چین نہیں ہے تم لوگوں کو۔‘‘ مما ان کے چیخنے پر کچن سے لاؤنج کی طرف آئیں۔

’’بڑی مما! دیکھیں نا اسے کیا ضد لے کر بیٹھی ہے؟‘‘

’’بڑی مما پلیز! مجھے ان کے ساتھ جانے دیں نا، مجھے پتا ہے یہ سوکھے سڑے بکرے لے کر آئیں گے میں اگر ان کے ساتھ گئی تو دیکھئے گا پھر ایسے بکرے لے کر آؤں گی کہ سارا محلہ دیکھے گا۔‘‘ ثمر نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

’’ہرگز نہیں اب تم بکرے لینے جاتی اچھی لگو گی کیا؟ جاؤ جا کر کچن سنبھالو جو کام کرنے کا ہے وہی کرو۔‘‘

’’بڑی مما! آپ......آپ......‘‘

اس سے بات مکمل نہ ہو سکی بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ کر بھاگتے ہوئے وہ اپنے روم میں گھس گئی۔ وہ تھی ہی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونا سا آجاتا اور گھنٹوں خود کو کمرے میں بند کر لیتی۔

’’شکر جان چھوٹی جلدی چلو یہ نہ ہو بڑی مما محترمہ کو ہمارے ساتھ روانہ ہی کر دیں۔‘‘ رامش، عدیل کا ہاتھ پکڑے باہر کی طرف دوڑا تھا۔

☆......☆

’’میں تو آج بہت تھک چکا ہوں یار۔‘‘ رامش نے اپنے جگری دوست عدیل سے کہا۔

’’عدیل! اب انہیں کہاں باندھیں گے؟ میں تو کہتا ہوں ثمر کے باغیچے میں باندھ دیتے ہیں، وہاں سبزہ بھی ہے یہ بے چارے بھی بھوکے ہوں گے تم جا کر ٹب میں پانی لے آؤ، میں تب تک انہیں باندھتا ہوں۔‘‘ رامش نے دوسرے بکرے کی رسی بھی ہاتھ میں پکڑی اور گھر کے پچھلے صحن کی طرف چل پڑا جہاں ثمر نے اپنے شوق سے چھوٹا سا باغیچہ بنا کر کیاریوں میں طرح طرح کے پودے اور بیلیں لگائی ہوئی تھیں۔ بقول اس کے جب میں اداس ہوتی ہوں تب یہاں آ کر بیٹھ جاتی ہوں اور پودوں کو دیکھ کر فریش ہو جاتی ہوں۔ بکروں کی آواز سن کر ثمر اور بڑی مما بھی باہر آ گئی تھیں۔ صبح کی ناراضی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ یقیناً بڑی مما اور مما نے مل کر اپنی لاڈلی کو منا لیا تھا۔

’’رامش! تم انہیں یہاں کیوں باندھ رہے ہو۔ اس طرح تو ساری کیاریاں خراب ہو جائیں گی۔‘‘

’’کچھ نہیں ہوتا ثمر بیٹا! یہاں یہ کچھ دن آرام سے رہ لیں گے۔ اس طرح ان کی اچھی دیکھ بھال بھی ہو جائے گی۔ قربانی کے بعد رامش اور عدیل ساری صفائی کر دیں گے۔‘‘ رامش کے جواب دینے سے پہلے مما بول پڑی تھیں۔

’’جی مما! ہم دونوں مل کر اچھے سے صفائی کر دیں

گے۔ آخر یہ سب کام ہمارے ہی تو کرنے والے ہیں۔ ہم تو اس گھر کے نوکر ہیں۔‘‘ آخری فقرہ عدیل نے منہ میں ہی کہا۔ ساتھ رامش نے بھی تابعداری سے سر ہلایا۔

’’مما پلیز! آپ ثمر سے کہیں شام تک ان کی اچھی دیکھ بھال کرے۔ ہم تب تک کچھ ریسٹ کر لیں پھر انہیں باہر گھمانے بھی لے کر جانا ہے۔ تاکہ یہ فریش ہو جائیں۔ ٹھیک ہے۔‘‘ جواب طلب نظروں سے ثمر کی طرف دیکھا جو انتہائی شوق سے بار بار بکروں کو ہاتھ لگا کر دیکھ رہی تھی۔ جیسے پہلی بار دیکھے ہوں۔

’’ہاں ہاں تم لوگ جاؤ میں ان کا خیال رکھوں گی۔‘‘

’’جیو میری شہزادی۔ بہنا! تم بہت اچھی اور رحم دل ہو۔ یہ مجھے آج پتا چلا ہے۔‘‘ عدیل نے جاتے ہوئے شرارت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سدا سکھی رہنے کی دعا دی۔ رامش پہلے ہی کمرے میں جا چکا تھا۔

☆......☆

عید میں کچھ ہی دن باقی تھے۔ عدیل اور رامش روزانہ بکروں کو باہر گھمانے لے کر جاتے تھے جب کہ گھر میں ثمر اچھے سے ان بکروں کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ قربانی کے جانور کی بہت زیادہ خدمت کرنی چاہیے اور ان کا ڈھیر سارا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ ثواب ملتا ہے اپنے دادا ابا کی بات اس نے جیسے پلو سے باندھ لی تھی۔ بقول رامش جتنا خیال ثمر بکروں کا رکھتی ہے، اتنا خیال ہمارا بھی رکھنے لگے تو زندگی بہت خوب صورت گزرے گی۔

’’عدیل! میرے شہزادے، تمہاری تو پھر بھی خیر ہے مگر میرا کیا ہوگا تمہاری بہن ساری زندگی مجھے بھوکا مار دے گی۔‘‘ چونکہ ثمر اور رامش کی نسبت طے تھی اسی لیے وہ اکثر ایسی دہائیاں دیتا رہتا تھا۔ ثمر نے عید کی

ساری تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ شاپنگ بھی کچھ روز پہلے وہ کر چکی تھی۔ بڑی مما اور مما کے ساتھ مل کر کچن کے کام بھی تقریباً مکمل کروا لیے تھے۔ سب کو اپنی اپنی پسند کی ڈشز بنوانی ہوتی تھیں۔ سو کچھ تیاریاں پہلے سے کر کے رکھ دی جاتی تھیں۔

’’بڑی مما! ایک بات کہوں؟‘‘ وہ بڑی مما کے ساتھ چیئر پر کچن میں آ کر بیٹھ گئی۔ جہاں وہ کچھ مصالحے پیس کر ڈبوں میں رکھ رہی تھیں۔

’’جی میری جان بولو۔‘‘

’’ہم اس بار قربانی کا سارا گوشت فریز کر کے رکھ لیں گے۔ عید کے بعد میں اپنی دوستوں کی شاندار سی دعوت کروں گی۔ آپ سب بھی اپنے جاننے والوں کو بلا لیجیے گا اس طرح بہت عزت بڑھے گی۔‘‘

بڑی مما جو رامش کی امی اور اس کی ہونے والی ساس تھیں۔ وہ اکثر ان سے اپنی باتیں شیئر کرتی تھی۔ اب بھی ثمر اپنی بات انہی سے ڈسکس کرنے آئی تھی۔

’’بری بات بیٹے، ایسا نہیں کہتے، آپ جانتی ہو نا ہم تو اپنے رکھنے والے حصے میں سے بھی زیادہ گوشت غریبوں میں بانٹ دیتے ہیں اور یہاں تم کہہ رہی ہو سارا گوشت ہی فریز کر لیں۔‘‘

’’بڑی مما! پہلے میری بات تو مکمل ہونے دیں۔ میں یہ کہہ رہی تھی وہ میری دوست بسمہ ہے نا وہ کہہ رہی تھی میری مما تو ایسے ہی کرتی ہیں۔ کچھ حصے بنا کر جاننے والوں کو دے دیتی ہیں۔ باقی کا سارا قربانی والا گوشت فریز کر لیتی ہیں بعد میں پھر اچھی سی دعوت کا انتظام کر کے جاننے والوں کو بلاتی ہیں۔ اس طرح سب کے سامنے عزت بھی بڑھ جاتی ہے اور قربانی بھی ہو جاتی ہے۔ گوشت پکا کر تو سب کو کھلا دیتی ہیں خود تو نہیں کھاتیں جو گناہ ہو یہ بھی تو قربانی کے زمرے میں آتا ہے۔‘‘

’’ثمر بیٹا! قربانی کے گوشت کے تین حصے کیے



جاتے ہیں۔ ایک غربا و مساکین کا، دوسرا رشتے داروں کا اور تیسرا حصہ اپنے گھر میں رکھا جاتا ہے۔ جب بسمہ لوگ سارا گوشت گھر میں رکھ لیتے، صرف چند جاننے والوں کو کچھ حصے دے دیتے یہ ان کی قربانی تو نہ ہوئی، جب تک حصے ان کے حقداروں تک نہ پہنچائیں اور جو گوشت وہ دعوت کر کے اپنے جاننے والوں کو کھلاتی ہیں، وہ تو دکھاوا کرتی ہیں صرف اپنی عزت بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو نمود و نمائش سخت ناپسند ہے، قربانی کا گوشت ان کے حقداروں تک پہنچانے میں ہی بھلائی ہے۔ ہم دنیا دکھاوے، ذرا سی عزت بڑھانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیں؟ ایسا کام کریں ہی کیوں جو اللہ پاک کی ناراضی کا سبب بنے یہ تو بہت غلط بات ہے۔ تم نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ والا واقعہ پڑھا ہوا بھی ہے اور سنا ہوا بھی۔ بہتر ہے اس طرح کی باتوں سے پرہیز کیا کرو۔"

"سوری بڑی مما! مجھے تو بسمہ نے کہا تھا ایسا کرنے کو ایم رئیلی سوری میں آئندہ ایسی باتیں نہیں کروں گی۔ اس نے اپنی دعوت میں بھی مجھے پہلے سے انوائیٹ کر رکھا ہے۔ میں ہرگز وہاں نہیں جاؤں گی اور اسے بھی سمجھاؤں گی قربانی کا حق ادا کریں نہ کہ دکھاوا کریں۔"

"ماشاء اللہ ہماری بیٹی تو بہت عقل مند ہے۔ جلد ہی بات کو سمجھ گئی۔ شاباش اب جلدی سے یہ باقی مصالحے ڈبوں میں ڈالو تب تک میں نماز پڑھ لوں۔"

☆......☆

وہ صبح سے بہت اداس تھی۔ اتنے خوب صورت بکروں کو ذبح کر دیا جائے گا۔ اسی سوچ نے اسے اداس کر رکھا تھا۔ عدیل جب بکرے کھول کر باہر جانے لگا، تب اس کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو آ گئے تھے مگر اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اللہ کو ناراض کر کے وہ دل راضی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے بکروں کو پیار کیا انہیں پانی پلایا تھا۔

عدیل اور رامش قربانی کا گوشت بنا کر بانٹنے گئے ہوئے تھے اور یہ وہ واحد کام تھا جو وہ خوشی خوشی کرتے تھے۔

"ثمر بچے! آپ کہاں جا رہی ہو؟" ایک ہاتھ میں ڈش اور دوسرے میں ایک شاپر پکڑے وہ باہر کی طرف جا رہی تھی۔ جب بابا جان نے روک کر پوچھا سب ہی اس وقت لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ سوائے عدیل اور رامش کے۔

"بابا جان! میں سکینہ خالہ کی طرف جا رہی ہوں۔ ان کو عیدی دینے اور یہ سالن میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ خالہ کو میرے ہاتھ کا کھانا بہت پسند ہے۔" سلیقے سے تیار وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

سکینہ خالہ ان کی ہمسائی تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد پانچ چھوٹے بچوں کو جس قدر محنت مزدوری سے وہ پال رہی تھیں۔ لوگ رشک کرتے تھے گھر میں ہانڈی روٹی کے لیے چاہے فاقے ہوں مگر ان کی غیرت یہ گوارا نہ کرتی کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ ثمر کا ان کی طرف بہت آنا جانا تھا۔ کئی بار ثمر نے ان کی مدد کرنی چاہی مگر انہوں نے خوش اسلوبی سے منع کر دیا۔ آج کا دن وہ خالہ اور ان کے بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔ جو وہ شاپنگ اپنے لیے کر کے آئی تھی۔ ان میں سے کافی ساری چیزیں اور کھانے پینے کی اشیاء اس نے اپنے ساتھ اٹھا رکھی تھیں۔ قربانی نام ہے ایثار کا کتنا خوب صورت احساس تھا۔ وہ آج کا دن ان معصوم بچوں کے ساتھ گزارے گی جو ہمیشہ خوشیاں پانے کو ترستے ہیں۔ بابا جان نے اپنے والٹ سے کچھ نوٹ نکال کر اسے دیے کہ وہ اپنی طرف سے بچوں کو عیدی دے دے۔ سکینہ خالہ آج ہرگز انکار نہ کر سکیں گی۔ خالہ کے گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ بہت خوش تھی۔ دوسروں کی خوشی میں خوش رہنے والا ہمیشہ خوش رہتا ہے۔

☆......☆



ریما نور رضوان

افسانہ

اعتماد ریزہ ریزہ

واٹ آئی بی مائی
چھمک چھلو......

بے ہنگم سر و تال بے پناہ کراؤڈ حد سے زیادہ شور و غل کانوں کو پھاڑ دینے والا فل لاؤڈ میوزک کی آوازیں پورے نائٹ کلب میں گونج رہی تھیں۔ لوگوں کا ہجوم تھا کہ پاگلوں کی طرح بھڑک رہا تھا۔ کچھ لڑکوں کی بانہوں میں آدھی برہنہ لڑکیاں خود سے بے خود ہو کر جھوم رہی تھیں۔ اپنا تقدس خود ہی پامال کر رہی تھیں۔

آذر شاہ کوئی تھرڈ کلاس، چھچھورا نہ تھا۔ جو وہ آج نائٹ کلب میں موجود تھا۔ وہ تو کسی کا متلاشی تھا، کسی کی کھوج میں سرگرداں آج اس جگہ پر موجود تھا۔

آذر شاہ کو یہ سب برداشت نہیں ہو پایا تو بالآخر تھک ہار کر اس نے ارباز کو کال کی۔

"ارباز! میں یہاں پچھلے بیس منٹس سے ہوں اس گندگی کے ڈھیر میں مجھے السا کہیں نظر نہیں آ رہی میں نکل رہا ہوں یہاں سے میری برداشت جواب دے رہی ہے۔" آذر شاہ کڑھتے ہوئے بولا تھا۔

"یار! میں سو فیصد کانفیڈنس سے کہہ رہا ہوں۔ السا اسی نائٹ کلب میں ڈانس کرتی ہے۔" ارباز روانی سے بول رہا تھا کہ آذر شاہ چنگاڑ اٹھا۔

"ارباز! مائنڈ یور لینگویج السا کوئی پروفیشنل رقاصہ نہیں ہے۔ نہ ہی اسے ڈانس کرتے صدیاں بیت گئیں۔ وہ دو دن پہلے ہی بھیڑیوں کی دنیا میں بھیجی گئی ہے۔"

"سو سوری سر! بٹ یہ سچ ہے وہ اس کلب میں لائی گئیں تھیں۔ مجھے ساری انفارمیشن ملی ہے۔"

"او کے آئی فائنڈ ہر......" آذر شاہ نے غصے میں کال کٹ کی تھی۔

☆......☆

"ایکسکیوزمی!" آذر شاہ کو اس نائٹ کلب میں آتے ہوئے چار دن ہو چکے تھے مگر السا کو ڈھونڈنے میں ناکام رہا تھا۔ آج بالآخر کاؤنٹر بوائے کو مخاطب کر بیٹھا تھا۔

"یہاں کوئی نئی کال گرل لائی گئی ہے کیا؟" اپنی محبت اپنی عزت اپنے پیار کو اتنے گرے ہوئے لفظ میں مخاطب کرنا پڑے گا کبھی آذر نے سوچا بھی نہ تھا۔

"ہاں لائی تو گئی ہے مگر بھیجی نہیں گئی ہے۔ پورے پانچ لاکھ میں خریدہ ہے سیٹھ اکبر خان نے۔ سونے کی چڑیا ہے۔ رنگ روپ تو ایسا ہے جیسے اس دھندے کے لیے سنیت کر رکھا ہو۔" کاؤنٹر بوائے خباثت بھرے لہجے میں اس کے پیکر کے پرخچے اڑا رہا تھا اور آذر شاہ کو لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا جا رہا ہو مگر مجبوری کہ سن رہا تھا۔

"وہ اس وقت کہاں ہو گی؟" آذر شاہ ضبط سے بولا تھا۔

"صاحب! وہ اپنے روم میں ہوگی۔"

"کہاں ہے اس کا روم؟" آذر شاہ بے چینی سے بولا۔

"صاحب اسٹیج کے سائیڈ پر کاریڈور جو ہے اس میں لائن سے روم بنے ہیں روم نمبر 14 میں ہوگی۔" کاؤنٹر بوائے اب ڈرنک لینے جاچکا تھا۔ کاؤنٹر پر کافی رش ہوگیا تھا۔

آذر شاہ فوری طور پر کاریڈور میں پہنچا۔ دو لڑکیاں انتہائی خراب لباس میں کھڑی باتیں کررہی تھیں۔

"ہیلو ینگ بوائے، آجاؤ۔" وہ حسین لڑکی بڑی بے باکی سے بول رہی تھی۔ آذر شاہ درمیان میں ہی چلا اٹھا تھا۔

"جسٹ شٹ اپ۔ مزید کچھ مت کہنا۔"

"اوہو صاحب بہادر کا غصہ تو دیکھو کیا غلط کہہ دیا۔" دوسری لڑکی طنزیہ بولی تھی۔

آذر شاہ جھٹ سے روم نمبر 14 پر ناک کرنے لگا۔

"مسٹر یہاں تو 5,6 ہزار میں کام چل جائے گا لیکن روم نمبر 14 کی حسینہ تو ایک لاکھ میں بھی راضی نہیں ہوگی۔" پہلی لڑکی پھر تمسخر اڑانے لگی تھی۔

"اسے کہتے ہیں لڑکی جو اپنے تقدس کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اس جگہ جہاں قدم قدم پر اس کی عزت کو تار تار کرنے والے موجود ہیں اور ایک تم دونوں ہو خود ہی اپنی عزت نفس کو ذریعہ معاش بنا کر شوپیس کی طرح خود کو ہر غیر مرد کو پیش کرتی ہو۔" تنفر سے کہتا آذر شاہ نے دروازے پر پرزور ناک کیا تھا۔

"السا! میں آذر شاہ ہوں پلیز کھولو۔"

السا دل ہی دل میں درود شریف کا ورد کررہی تھی۔ آذر شاہ کی آواز سن کر جلدی سے گیٹ کھولا تھا۔

آذر نے اندر آتے ہی دروازہ بند کرلیا تھا۔ خدشہ تھا کہ کسی کو پتہ نہ لگ جائے کہ وہ انسپکٹر ہے۔

السا آذر شاہ کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

"السا! پلیز روؤ مت۔ میں آگیا ہوں ناں، پلیز کول ڈاؤن۔" آذر شاہ نے بہت حوصلے سے السا کو سنبھالا اور تسلی دی۔

"مجھے سب بتاؤ، کیا ہوا تمہارے ساتھ تم یہاں کیسے پہنچیں میں تو تمہارے پپا کے انتقال کی خبر سن کر تمہارے گھر گیا تھا تو وہاں پتہ چلا کہ تم وہ گھر چھوڑ کر جاچکی ہو میں بے حد پریشان ہوا۔ اس ملک میں تو تمہارا اپنا کوئی نہیں اور اپنے باپ کے انتقال کے دوسرے دن ہی تمہیں کہاں جانے کی لگ گئی۔ بڑی مشکلوں سے تم تک رسائی حاصل ہوئی ہے۔"

"آذر! چچا چاہتے تھے کہ میں اپنے چچازاد سے نکاح کرلوں۔ احمد نے اس کے باپ نے میرے سگے چچا نے پپا کو جوس میں زہر ملا کردیا تھا۔ پپا کو اس بات کا علم نہ تھا کہ ان کے بھائی اور بھتیجا کس فیلڈ میں ہیں۔ خدا بخش ہمارے گھر میں میرے بچپن کے ملازم جو ہیں اس نے باپ بیٹے کی باتیں سن لی تھیں۔ میں پپا کے غم میں ڈوبی تھی۔ خدا بخش رات کے 3 بجے چپکے سے میرے روم میں آیا اور احتیاطاً دروازہ بند کرلیا تھا۔ میں غلط سمجھ کر چلانے ہی والی تھی کہ خدا بخش نے میرے منہ پر اپنا ضعیف ہاتھ رکھ دیا تھا۔ السا میں نے تمہیں گود میں کھلایا ہے تم میری شبو (بیٹی) کی طرح ہو۔ میں تو تمہیں سچ بتانے آیا ہوں۔ بیٹا جلال حسین کو احمد بابا نے جوس میں زہر ملا کردیا تھا۔ صاحب جی کی موت معبود کی مرضی نہیں۔ احمد بابا اور حسنین صاحب کی سوچی سمجھی سازش ہے اب وہ تمہیں بیچنے کی باتیں کررہے ہیں۔ تم یہاں سے کہیں چلی جاؤ۔ وہ اس گھر کو بھی بیچ دیں گے اور پھر واپس فرانس چلے جائیں گے اور احمد بابا شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ ہیں۔ آذر میرے پاپا......" السا آذر کے گلے لگے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

آذر کا دل بھی دکھ میں ڈوبا تھا۔

"السا! تم یہاں کیسے پہنچیں؟" آذر مضطرب سا بولا۔

"آذر! خدا بخش مجھے بھگانے میں لگا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور احمد نے میرے بالوں کو جکڑ لیا تھا اور بولا۔ تو تجھے سچ پتہ چل گیا اور خدا بخش کو چچا نے لاتوں، گھونسوں سے مار مار کر ادھ مرا کردیا تھا۔ اس کی پوری فیملی کو ایک کمرے میں قید کردیا اور مجھے گاڑی میں بٹھا کر یہاں لے آئے۔ میں بہت روئی، چیخی چلائی، کہا کہ میری تمام جائیداد لے لو مجھے چھوڑ دو۔ چچا تنفر سے بولے۔ میں تیرے باپ کا سارا پیسہ لے کر ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔ تجھے بھکارن بنا کر لوگوں کے قدموں کی خاک بنا کر آذر وہ مجھے پانچ لاکھ میں یہاں فروخت کرکے چلے گئے۔ آذر یہاں روز رات کو حیوان نما انسان آتے ہیں، سات دن میں میں تمہیں بتا نہیں سکتی کس طرح اپنے آپ کو بچایا ہے۔"

آذر کا دل رو رہا تھا، تڑپ رہا تھا۔

"آذر! مجھے یہاں سے لے جاؤ گے ناں؟"

السا یقین بے یقینی کی کیفیت میں آذر کو دیکھ رہی تھی۔ ان کے درمیان محبت بھری ملاقاتیں، محبت بھرے جذبوں کے عہد و پیمان نہ تھے۔ دونوں یونیورسٹی کلاس فیلو تھے۔ آذر انسپکٹر کی سیٹ سنبھالنے کے بعد کورس کرنے آیا تھا۔ السا کو نہیں پتا تھا کہ وہ انسپکٹر بھی ہے اور نہ ہی آذر کی خاموش محبت کا علم تھا۔

"السا! میں تمہیں ابھی اسی وقت یہاں سے لے کر جاؤں گا اور تمہاری مرضی ہو تو میں تمہیں اپنا بنانے کے لیے بھی تیار ہوں۔" السا نے نمناک نگاہوں سے آذر کو دیکھتے ہوئے۔ سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ کیوں کہ وہ سچا چاہنے والا نہ ہوتا تو کبھی بھی السا کو تلاش نہ کرتا اور السا اس نائٹ کلب میں خود کو کب تک محفوظ رکھتی۔

"السا! So much I love you، ہم کل ہی نکاح کریں گے، شادی کی رسمیں اہم نہیں ہوتیں نکاح اہم ہوتا ہے۔ نکاح کرنے سے میں تمہیں مکمل تحفظ پرووائیڈ کرسکتا ہوں۔"

السا کا ذہن الجھا ہوا تھا پریشانی سے بولی۔

"آذر! تم مجھے یہاں سے کیسے لے کر جاسکتے ہو، پانچ لاکھ دیئے ہیں۔" آذر نے مسکراتے ہوئے اپنا سیل فون پاکٹ سے نکالا۔

"ارباز! مجھے السا مل گئی جلدی یہاں آجاؤ۔ میں اپنی پسٹل لے کر نہیں آیا۔ چیکنگ کی وجہ سے، جلدی آجاؤ مجھے السا کو فوراً اس گندگی سے نکالنا ہے۔"

"آذر! تم نے کس کو فون کیا ہے؟ کیا تم کسی پارٹی کے کارکن ہو۔ پلیز مجھے سچ بتاؤ۔ میری زندگی کس طرف جارہی ہے۔" السا رو رہی تھی۔

"السا! میں آذر شاہ ایس پی ہوں، تم غلط مت سوچو۔ یہاں اندر آنے سے پہلے چیکنگ ہوتی ہے۔ اسی لیے عام سا بندہ بن کر آیا ہوں ورنہ تمہیں کیسے تلاش کرتا، تم یہاں سے بہت شان کے جاؤ گی۔ آذر شاہ کی وائف بن کر۔" آذر شاہ مسکرا رہا تھا۔

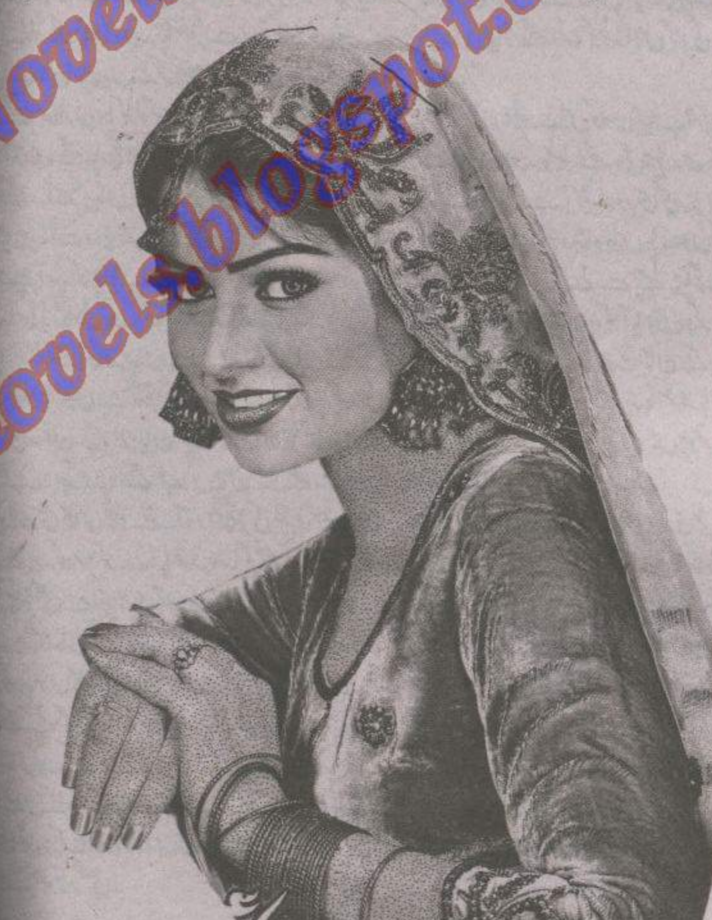
"آذر! تت...... تم پولیس میں ہو تم نے کبھی بتایا نہیں۔" السا حیران تھی حقیقت پر۔

کچھ ہی دیر میں ارباز پوری بھاری نفری کے ساتھ نائٹ کلب پر چھاپہ مار چکا تھا۔ پورا علاقہ سیل کرکے گرفتاری کا عمل جاری تھا۔ نائٹ کلب والے حیران تھے کہ ایک لڑکی کی وجہ سے ان کا پورا دھندا چوپٹ ہو گیا تھا۔ آذر شاہ نے السا کو اپنے گھر اپنی فیملی میں چھوڑ کر احمد اور حسنین کو اریسٹ کرلیا تھا اور السا کی تمام جائیداد واپس دلوادی تھی السا اور آذر کا نکاح ہو چکا تھا۔ دونوں خوش و خرم زندگی بسر کررہے تھے۔ تاریکی کے سائے ڈھل چکے تھے۔

......☆......

افسانہ

"عینارت، بیٹا اٹھ بھی جاؤ آخر کب تک سوتی رہو گی۔ چھٹی ہونے کا مقصد دیر تک سونا تھوڑی ہوتا ہے۔ بیٹا تمہارے پاپا بھی تمہارا ویٹ کر رہے ہیں۔ "اٹھو! شاباش۔" آصفہ بیگم نے عینارت کو پیار



بھرے انداز میں جگاتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا ہے ماما! تھوڑی دیر تو اور سونے دیں کہ اتنے دنوں کے بعد تو سکون کی نیند نصیب ہوئی ہے۔" عینارت نے منہ پر تکیہ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ کے پاپا ناشتے پر آپ کا ویٹ کر رہے ہیں ناں۔" آصفہ بیگم نے کہا تھا۔

"ہوں آپ چلیں میں فریش ہو کر آتی ہوں۔" عینارت نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ فریش ہونے کے بعد عینارت نے اسکائی بلو جینز پر ڈارک نیو بلو ٹی شرٹ پہن لی اور لاؤنج میں آ گئی۔

"السلام علیکم!" اس نے مسکراتے ہوئے ٹیبل پر موجود نفوس پر سلامتی بھیجی تھی۔

"صبح ہو گئی ڈاکٹر صاحبہ۔" آذر بھائی نے مسکراتے ہوئے اس کے دیر سے اٹھنے پر اسے تنگ کیا تھا۔

"جی ہاں ہو گئی صبح۔" عینارت کہا تھا۔

"بھائی! آپ آج آفس نہیں گئے خیریت؟" عینارت نے آذر سے استفسار کیا تھا۔



"میں اٹھا تھا یار آفس جانے کے لیے مگر طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگی۔ پھر سوچا فری میں ڈاکٹر صاحبہ سے چیک اپ بھی کروا لوں گا مگر ہماری ڈاکٹر صاحبہ کے بھی عجیب نخرے ہیں، مریض ٹریٹمنٹ کروانے کے لیے بیٹھا ہے اور ڈاکٹر صاحبہ کا پتہ ہی نہیں۔" آذر نے پیار بھرا شکوہ کیا تھا۔

"آپ بھی حد کرتے ہیں بھائی مجھے جگا دیتے، ویسے بھی میں ابھی رعایت کر رہی ہوں۔ بعد میں آپ کو مجھے باقاعدہ فیس دینا پڑے گی۔" عینارت نے پروفیشنل لہجے میں کہا تھا آذر اسے دیکھتا رہ گیا۔

"تم سے میں ٹریٹمنٹ کرواں گا تو کیا تم مجھ سے پیسے لوگی؟" آذر نے مدھم لہجے میں استفسار کیا تھا۔

"بالکل گھوڑا اگر گھاس سے دوستی کرلے گا تو کھائے گا کیا؟ کل کو خاندان کا کوئی بھی فرد منہ اٹھائے میرے پاس آئے گا تو کیا میں ان سب کا Free of cost ٹریٹمنٹ کروں تو کیا فائدہ میری اتنی Expensive پڑھائی کا۔" عینارت نے کہا تو ٹیبل پر موجود تمام لوگ ہی خاموش ہو گئے۔

"بیٹا ایسا نہیں کہتے اگر کسی ضرورت مند کا علاج بنا پیسوں کے کر دیں گی تو اللہ آپ کو اس کا اجر ضرور دے گا اور آپ اپنی لائف میں اور زیادہ کامیابی حاصل کریں گی۔" فاروقی صاحب نے اسے سمجھانے والے انداز میں سمجھایا تھا۔

"یو آر رونگ پاپا I am not social worker بلکہ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ اگر مجھے سماجی خدمات سرانجام دینا ہوتیں تو میں اتنی محنت کیوں کرتی پھر اتنی لمف پڑھائی کا فائدہ کیا بتائیں؟" عینارت نے کہا تو آصفہ بیگم نے فاروقی صاحب کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ ایسی ہی تھی اپنے اردگرد کے ماحول سے یکسر لاپروا، اپنوں سے لاپرواہ اس کے نزدیک خود اس کی اپنی ذات تھی۔ ایسے لگتا تھا جو وہ بولتی ہے جو سوچتی ہے جو اس کا نظریہ ہے وہی صحیح ہے باقی سب غلط ہے وہ تھی بھی تو بلا کی خوب صورت، ذہن ہمیشہ اپنی کلاس میں فرسٹ پوزیشن لیتی، فاروقی صاحب نے بیٹی کی ذہانت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ایڈمیشن میڈیکل کالج میں کروا دیا۔ بیٹی کو ڈاکٹر بنانا ان کا خواب تھا۔ کالج میں بھی اس کی ذہانت کے چرچے ہونے لگے تھے۔ مگر جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی چلی گئی۔ فاروقی صاحب کے لیے فکر کے نئے در وا کرتی چلی گئی۔ اس کا M.B.B.S کے بعد ہاؤس جاب بھی کمپلیٹ ہو گیا تھا۔ اس کے سینئر ڈاکٹر نے اسے اپنے ہاسپٹل میں اپائنٹ کر لیا تھا۔ جہاں وہ ایک ڈاکٹر کی ڈیوٹی پوری دلجمعی سے سرانجام دے رہی تھی۔

☆.....☆

شام کو جب عینارت ہاسپٹل سے گھر لوٹی تو فاروقی صاحب کو لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے پایا۔ اس نے اپنے پاپا پر سلامتی بھیجی تھی۔

"وعلیکم السلام بیٹا! آپ فریش ہو کر میرے پاس آئیں مجھے اپنی ڈاکٹر صاحبہ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔" فاروقی صاحب نے مسکرا کر کہا تو وہ مسکرا کر فریش ہونے چل دی۔ فاروقی صاحب جب بھی موڈ میں ہوتے تھے اسے ڈاکٹر صاحبہ کہہ کر ہی مخاطب کیا کرتے تھے۔

"جی پاپا! کہیں کیا کہنا ہے آپ کو۔" عینارت نے فاروقی صاحب کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"بیٹا! بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے لیے ڈاکٹر عابدی کے بیٹے کا پرپوزل آیا ہوا ہے۔ آپ دونوں کا پروفیشن بھی سیم ہے مجھے اور آپ کی مما اور آذر کو بھی اس پرپوزل پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اب آپ کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں میں کافی دنوں سے یہ بات کہنا چاہ رہا تھا۔ اب تم بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟" فاروقی صاحب نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو اس نے

کہا۔

"پاپا! میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ ابھی ابھی تو میرا Career اسٹارٹ ہوا ہے۔ شادی ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے میں ابھی صرف اپنے کیریئر پر فوکس کرنا چاہتی ہوں۔ شادی کرلوں گی تو میں آگے نہیں بڑھ سکوں گی۔ مجھے اپنی لائف میں آگے بڑھنا ہے۔ اپنے پروفیشن میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے ہیں۔ خوب سارا نام اور بہت سارا پیسہ کمانا ہے مجھے یاد ہے پاپا کتنی تکلیف سہہ کر آپ نے ہمیں پڑھایا ہے۔ میں آپ سب کے لیے خود کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں اگر میں شادی کرلوں گی تو میں اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکوں گی۔ پاپا میں آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ شادی کر کے میرے پر کٹ جائیں گے پاپا، مجھے شادی کی ذمہ داری نبھانا پڑے گی۔ جو ابھی میں نبھانا نہیں چاہتی نہ ہی میں شادی کے لیے تیار ہوں۔ آئندہ آنے والے کئی سالوں تک میرا شادی کا کوئی پلان نہیں ہے۔" عینارت نے فاروقی صاحب کے سامنے اپنی رائے دی تو وہ جیسے سکتے میں آ گئے تھے۔

"بیٹا! زندگی کے طویل سفر میں ایک ہمسفر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسا ساتھی جو آپ کے دکھ، سکھ میں آپ کا ساتھ دیتا ہے۔ پھر ہمارا کیا بھروسہ کب ہماری آنکھیں بند ہو جائیں، آذر کی بھی شادی ہو چکی ہے۔ اس کی اپنی ایک الگ لائف ہے، اس پر اس کی بیوی بچوں کی ذمہ داری ہے۔ تم میری ذمہ داری ہو اسی لیے میں چاہتا ہوں تم بھی اپنی لائف میں سیٹ ہو کر خوش رہو، ریان اچھا ہے ڈیسنٹ ہے۔ تمہیں سوٹ بھی کرتا ہے۔" فاروقی صاحب نے قائل کرنے والے انداز میں عینارت کو سمجھانا چاہا تھا۔

"پلیز پاپا! مت فورس کریں مجھے۔ میں نے کہا نا ریان اچھا نہیں ہے۔ میں شادی کر کے غلامی کی زندگی نہیں گزارنا چاہتی، مجھے آزاد رہنے دیں میں آزاد رہ کر آزادی سے اونچی اڑان اڑنا چاہتی ہوں۔ میں تنہا رہ کر بے حد خوش رہنا چاہتی ہوں پاپا مجھے بے حد سکون ملتا ہے میں اپنی لائف میں بے حد خوش ہوں پاپا، آج آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں کہ آئندہ آپ مجھ سے اس ٹاپک پر بات نہیں کریں گے۔ پرامس کریں۔" عینارت نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو فاروقی صاحب خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

"بیٹا! میں آپ سے پرامس تو نہیں کروں گا لیکن میں یہ دعا ضرور کروں گا کہ آپ کی سوچ بدل جائے۔" فاروقی صاحب نے اٹھتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا تھا۔

"تھینک یو پاپا۔" عینارت نے کہا اور اپنے روم کی جانب بڑھ گئی۔

☆.....☆

"ہیلو عینارت بیٹا! کہاں ہو تم ہم سب کھانے پر تمہارا ویٹ کر رہے ہیں۔" آصفہ بیگم نے اسے کال کر کے اس سے لیٹ ہو جانے کی وجہ پوچھی تھی۔

"مما! میں نے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ آپ سب میرا ویٹ مت کیا کریں آج تو ہاسپٹل میں کئی ایمرجنسی کیسز آئے ہوئے ہیں۔ میں بہت بزی ہوں، میں صبح تک گھر آؤں گی او کے بائے مما۔" عینارت نے جلدی سے اپنی بات پوری کی اور لائن ڈراپ کر کے سیل آف کر دیا تا کہ گھر سے دوبارہ کوئی کال کر کے اسے ڈسٹرب نہ کرے۔

"کس کی کال ہے ڈاکٹر؟" ڈاکٹر عابدی نے اس سے استفسار کیا تھا۔ "گھر سے مما کی کال تھی سر۔" ڈاکٹر عینارت نے جواب دیا۔

"اگر آپ جانا چاہتی ہیں تو جا سکتی ہیں، ایمرجنسی کے باعث میں نے ڈاکٹر ثروت اور ڈاکٹر فزا کو بھی بلوا لیا ہے۔ آپ کے لیے اتنی رعایت تو میں کر ہی سکتا ہوں۔" ڈاکٹر عابدی نے کہا تھا۔

"نو سر! اپنے سینئرز کے ساتھ رہوں گی تو مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔ گھر جا کر اپنا ٹائم میں کیوں ویسٹ کروں۔ میرے لیے گھر جانا اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔" عینارت نے ڈاکٹر عابدی سے کہا تھا۔

"ہوں آئم امپریسڈ آپ اپنے پروفیشن کے ساتھ بے حد مخلص ہیں، ڈاکٹر مجھے یقین ہے آپ بہت آگے جائیں گی اور بہت ترقی کریں گی۔" ڈاکٹر عابدی نے عینارت کو سراہا تو عینارت خوش ہو کر مسکرانے لگی تھی۔

☆......☆

"کیا بات ہوئی آپ کی عینارت سے کہ کب تک آئے گی وہ۔" فاروقی صاحب نے آصفہ بیگم سے استفسار کیا تھا۔

"ہاسپٹل میں ایمرجنسی نافذ ہے وہ نکلنے ہی والی تھی کہ ڈاکٹر عابدی نے اسے روک لیا جاب تو جاب ہے ناں۔" آصفہ بیگم نے نظریں چراتے ہوئے فاروقی صاحب سے کہا تھا۔ فاروقی صاحب نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ رات آصفہ بیگم سونے کے لیے لیٹیں تو نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور ہو چکی تھی۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہونے لگے تھے۔

"یا اللہ! ہم سے کہاں غلطی سرزد ہو گئی اپنی بیٹی کی تربیت میں وہ اتنی بے حس کیوں ہوتی جا رہی ہے۔ اسے اپنے سوا کوئی دوسرا کیوں نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ اپنے والدین بھی اس کی نظروں میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اسے کیوں احساس نہیں اس کے باعث ہم کتنے اضطراب کا شکار رہتے ہیں، کیوں اس نے پیسہ کمانے کو اپنا مقصد بنا لیا ہے۔ وہ کیوں اندھیری راہوں کی مسافر بنتی جا رہی ہے؟" آصفہ بیگم نے روتے ہوئے عینارت کے لیے اللہ سے بہت ساری دعائیں کی تھیں۔ جب وہ روتے روتے تھک گئیں تو ان کی آنکھ لگ گئی تھی۔ صبح ان کی طبیعت بے حد خراب ہو گئی تھی۔ ویسے بھی وہ شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں۔ عینارت کی ٹینشن اندر ہی اندر انہیں گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔ صبح سات بجے عینارت گھر آ گئی اور سو گئی۔ جب سو کر جاگی تو جلدی جلدی ہاسپٹل جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ تیار ہونے کے بعد گاڑی کی چابی اٹھائے وہ لاؤنج سے گزرنے لگی تو فاروقی صاحب نے اسے آواز دی تھی۔

"بیٹا! بات سنو۔" فاروقی صاحب نے عینارت سے کہا تھا۔

"کیا بات پاپا! میں لیٹ ہو رہی ہو۔" عینارت نے عجلت بھرے انداز میں کہا تھا۔

"بیٹا! آپ کی مما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بار بار تمہارے متعلق پوچھ رہی ہیں۔ آج تم ہاسپٹل نہ جاؤ آج کا پورا دن اپنی ماما کے ساتھ رہو۔" فاروقی صاحب نے عینارت سے کہا تو اس نے کہا۔

"آپ نے میڈیسن تو دے دی ہے نا پھر کیا مسئلہ ہے، میں شام کو ان سے مل لوں گی۔ آپ تو ہیں ناں مما کے پاس ہاسپٹل جانا میرے لیے بے حد ضروری ہے۔ آج بھی میری سینئرز ڈاکٹرز کے ساتھ اہم میٹنگ ہے۔ پلیز آپ میری طرف سے ماما سے سوری کہہ دیجیے گا۔ اللہ حافظ پاپا۔" عینارت کہتی ہوئی چلی گئی تھی اور فاروقی صاحب کا دماغ صدمے سے ماؤف ہونے لگا تھا۔ جب فاروقی صاحب اپنے روم میں آئے تو آصفہ بیگم نے انہیں دیکھتے ہی کہا تھا۔

"عینارت کہاں ہے فاروقی صاحب! اسے بلائیے میرے پاس، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کیوں نہیں آئی اب تک۔" آصفہ بیگم نے کہا تھا۔

"کیوں فضول بولتی ہو بیگم! آ جائے گی شام کو۔ اب تم آرام کرو اور تھوڑی دیر سو جاؤ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔" فاروقی صاحب نے ان کا بی پی چیک کیا اور آصفہ بیگم کو سونے کی تاکید کر کے ان کے بیڈ کے سامنے چیئر رکھ کر بیٹھ گئے۔ آصفہ بیگم آنکھیں

موندیں لیٹی ہوئی تھیں۔ وہ غور سے ان کا چہرہ دیکھنے لگے تھے۔ وہ پہلے سے بے حد کمزور اور نڈھال لگ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی شریک حیات کی صحت یابی کے لیے دعائیں کیں اور کرسی کی پشت سے سر کو ٹکا لیا۔ وہ بے حد تھکن محسوس کر رہے تھے تھوڑی ہی دیر میں فاروقی صاحب کی آنکھ لگ گئی۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ وضو کرنے کی نیت سے اٹھے تو دیکھا کہ آصفہ بیگم سو رہی ہیں۔ انہوں نے آصفہ بیگم کو ہلایا تو جیسے ان کے قدموں کے نیچے سے انہیں زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" فاروقی صاحب نے جیسے خود کو تسلی دی تھی۔ پھر انہوں نے آصفہ بیگم کی نبض چیک کی اور انہیں آصفہ بیگم کی ڈوبتی ہوئی نبض کی طرح اپنی زندگی بھی ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ انہیں ایسا لگا جیسے ان کی دنیا ہی اجڑ گئی ہو۔

"بہو! آذر کو کال کر دو دیکھو تمہاری ماں کو کیا ہو گیا ہے۔" فاروقی صاحب نے لڑکھڑاتے ہوئے سیرت سے کہا تھا۔

"امی! کو کیا ہوا ہے ابو صبح تو خود میں نے ناشتہ کروایا تھا۔ میں نے کال کر دی ہے۔ وہ پہنچنے والے ہیں۔" سیرت نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ ڈور بیل کی آواز پر وہ دروازہ کھولنے چلی گئی تھی۔ آذر کے آ جانے کے بعد انہیں قریبی ہاسپٹل لے جایا گیا تھا۔ چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے کہہ دیا پیشنٹ کو تو Xpire ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔ اس گھمبیر صورت حال میں آذر بار بار عینارت کو کال کر رہا تھا مگر اس کا سیل مسلسل آف جا رہا تھا تنگ آ کر اس نے عینارت کے قریبی کولیگ کو انفارم کر دیا تھا۔ جب ڈاکٹر ثروت سے آذر کی بات ہوئی تو ڈاکٹر ثروت نے کہا۔

"ڈاکٹر عینارت آپریشن تھیٹر میں ہیں جیسے ہی وہ فری ہوتی ہیں میں انہیں انفارم کر دوں گا۔"

"ہوں۔" آذر نے آنسو صاف کرتے ہوئے ہنکارا بھرا اور لائن ڈراپ کر دی۔ فاروقی صاحب آصفہ بیگم کو گھر لے کر آ گئے تھے۔ قریبی تمام عزیز و اقارب کو بھی اطلاع دے دی گئی تھی۔ گھر میں لوگوں کا ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آصفہ بیگم بڑی ہی ملنسار خاتون تھیں۔ ان کا اخلاق پورے خاندان میں مشہور تھا۔ سب ہی ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ فاروقی صاحب خاموشی سے ایک کونے میں سکتے کے عالم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔ انہیں اپنی شریکِ سفر سے بے پناہ انسیت تھی۔ ان کا دماغ بالکل ہی ماؤف ہو چکا تھا آذر اکیلے ہی اپنے رشتے داروں کے ساتھ تجہیز و تکفین کے انتظامات کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اسے رہ رہ کر عینارت پر غصہ آ رہا تھا کہ اسے گھر آنے میں دیر کیوں ہو رہی ہے۔ تب ہی روتی بلکتی ہوئی عینارت لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ اس کی نظر سامنے بیٹھے ہوئے اپنے پاپا پر پڑی وہ ان کے قریب جا کر ان سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی تھی۔

"ایسے کیسے ہو گیا پاپا! کاش آج میں ہاسپٹل انہیں چھوڑ کر نہ جاتی، مجھے ماما چاہیے پاپا، ماما ہمیں کیوں چھوڑ کر چلی گئیں۔" عینارت زار و قطار رونے میں مصروف تھی۔ تمام لوگ اس کی حالت دیکھ کر رو پڑے۔ فاروقی صاحب عینارت کو خود سے لگائے اسے تسلی دے رہے تھے۔

"بھائی کہاں ہیں پاپا؟" اس نے بلکتے ہوئے آذر کے متعلق استفسار کیا تھا۔

"بھائی! ماما ہمیں چھوڑ کر کیوں چلی گئیں۔ بھائی اب ہمارا خیال کون رکھے گا۔ ہم سے اتنا سارا پیار کون کرے گا بھائی بتائیں ناں، آپ چپ کیوں ہیں۔ کچھ بولتے کیوں نہیں ہیں؟" عینارت نے آذر کو جھنجوڑتے ہوئے کہا تھا۔ پھر وہ بچوں کی طرح

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اس کے بعد وہ بے ہوش ہوگئی۔ آذر ساری ناراضی بھلائے فکرمندی سے اس کے گال تھپتھپانے لگا۔

"عینارت آنکھیں کھولیے۔" آذر نے کہا تھا پھر اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے چھڑکنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے ہوش آنے لگا اور حواس بحال ہونے لگے تھے۔ ایک بار وہ پھر سے رونے میں مصروف تھی۔ میت کو آخری آرام گاہ کی جانب لے جانے کے لیے تمام انتظامات پایہ تکمیل تک پہنچ چکے تھے۔ فضا میں اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہونے لگی تھیں۔ عینارت ایک جھٹکے سے اٹھی اور پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے لگی تھی۔

"میں کہیں نہیں جانے دوں گی اپنی ماما کو، پلیز مت لے جائیں میں مر جاؤں گی ماما کے بنا اللہ میں کیا کروں۔" وہ صدمے سے اپنے بال نوچنے لگی تھی۔ سیرت آگے بڑھ کر اسے خود سے لگا کر اس کی پیٹھ تھپتھپانے لگی تھی۔

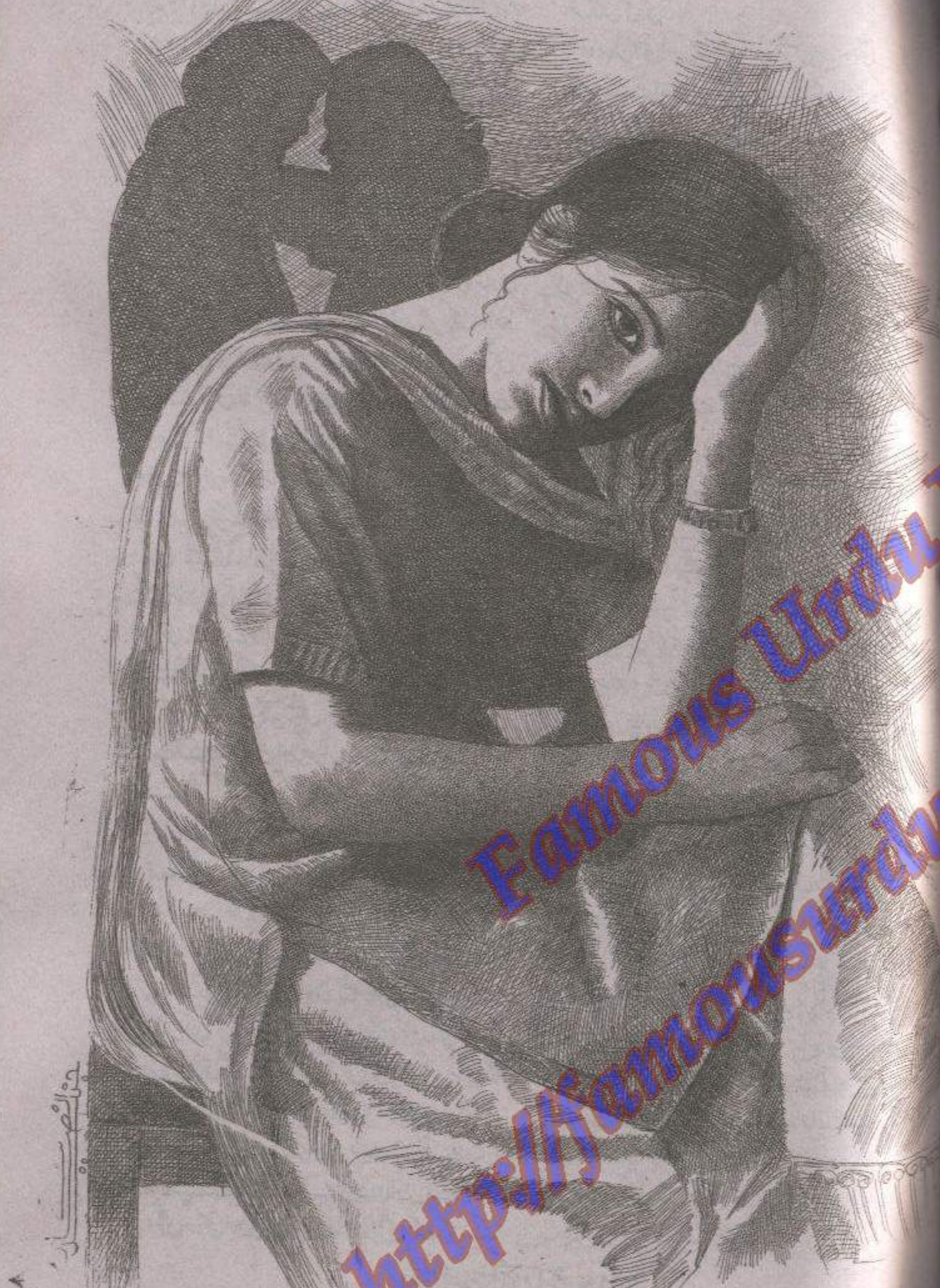
"ہمت کرو عینارت! ماما کو تکلیف ہو رہی ہوگی وہ تم سے بہت پیار کرتی ہیں ناں ان ہی کے لیے خاموش ہو جاؤ سنبھالو خود کو پلیز۔" سیرت نے بمشکل عینارت کو سنبھالا تھا اس کے بعد وہ سیرت کے بازوؤں میں بے ہوش ہوگئی۔

☆......☆

ایک مہینے اسپتال میں ایڈمٹ رہنے کے بعد وہ گھر آگئی تھی۔ پچھلا ایک مہینہ اس کی زندگی کا سب سے برا وقت ثابت ہوا تھا۔ اس عرصے میں اسے خود کو سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کا دل مردہ ہو چکا تھا۔ اسے کسی چیز میں بھی دلچسپی محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اسے اپنی زندگی بالکل فضول محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل ماننے کو تیار نہیں ہو پا رہا تھا کہ اس سے سب سے محبت کرنے والا وجود اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس نے اپنی زندگی کا مقصد ہی کھو دیا ہے۔ وہ اونچی اڑان اڑنا چاہتی تھی مگر اسے اب اڑنے سے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اپنے کیریئر پر فوکس کرنا چاہتی تھی مگر اب اسے اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ ٹوٹ کر بکھر چکی تھی۔ اسے اپنے وجود کو سمیٹنے کے لیے کسی کے پیار، کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ گھر والے عینارت کی دلجوئی میں لگے ہوئے تھے۔ سب ہی چاہتے تھے کہ عینارت دوبارہ زندگی کی رونقوں کی جانب لوٹ آئے۔ ڈاکٹر عابدی نے ایک بار پھر سے اپنے بیٹے کے لیے عینارت کا ہاتھ مانگا تھا۔ سیرت کے سمجھانے پر اس نے شادی کے لیے ہامی بھر لی تھی۔ اب اس کی خواہش کے عین مطابق شادی کا اہتمام نہایت سادگی سے کیا گیا تھا۔ شادی کی تمام رسومات نہایت سادگی سے سرانجام پائے تھے۔ شادی کے بعد ریان عابدی کی رفاقت میں وہ ایک بار پھر سے جینے لگی تھی۔ زندگی کی رونقوں میں حصہ لینے لگی تھی۔ اس نے ہاسپٹل بھی جوائن کر لیا تھا۔ وہ آسودہ تھی۔ کیوں کہ اس کے ساتھ اس کے اپنوں کی محبت جو ساتھ تھی اور سب سے اہم ریان عابدی کی محبت اور اعتماد کا ساتھ جو تھا۔ فاروقی صاحب کو اس کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا تھا۔ زندگی کا سفر بے حد طویل ہوتا ہے اگر اس سفر میں محبت کرنے والے، اپنوں کا وجود ہمارے ساتھ منسلک نہ ہو تو ہمیں ہماری زندگی لاحاصل، بے مقصد سی محسوس ہوتی ہے اور اگر ہمارے ساتھ ہماری زندگی کے سفر میں اپنوں کا ساتھ ان کی محبت ساتھ ہے تو آپ کو لگتا ہے کہ آپ زندہ ہیں آپ کا وجود سانس لے رہا ہے۔ آپ کے جینے کا مقصد زندہ ہے۔ پھر آپ کی مرضی۔ آپ جتنی اونچی اڑان اڑنا چاہیں۔

☆......☆





سدرہ شاہین

افسانہ

یقین کامل

اس نے آج خلاف معمول بڑی عجلت میں اپنا کام مکمل کرنے کی کوشش کی تھی کیوں کہ آج اسے جلدی گھر جانا تھا اور لنچ ٹائم تک وہ اپنا کام مکمل کر بھی چکی تھی۔ پھر باس کی اجازت سے لنچ ٹائم میں ہی آفس سے نکل آئی تھی۔ گھر جانے سے پہلے اسے کچھ خریداری کرنی تھی۔ کچھ خریداری بھی کیا محض ایک کیک وہ بھی مناسب قیمت میں، کیوں کہ آج اس کے شوہر ابوبکر کی سالگرہ تھی۔ سو وہ آفس سے نکل کر سیدھی بیکری کی طرف چلی گئی تھی۔ کیک خرید کر بیکری سے باہر آئی تو اس کی نظر سامنے پھولوں کی دکان پر گئی۔ دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اس نے لمحہ بھر کو رک کر پھولوں سے سجی دکان کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ آج ان کی زندگی کا اہم ترین دن تھا۔ اس کے شوہر ابوبکر کی سالگرہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ دنیا کی ہر چیز آج کے دن ابوبکر کو گفٹ میں دے مگر اس کے پاس کوئی بڑی رقم نہیں تھی جو وہ اپنی یہ حسرتیں پوری کر سکتی۔ عاتکہ نے گالوں تک آتے آنسو صاف کیے اور آگے بڑھ گئی۔ اسے پچھلے سالوں والی سالگرہ کے دن یاد آ گئے کتنی اچھی طرح وہ ہر سالگرہ کا دن مناتے، چاہے وہ اس کی سالگرہ کا دن ہوتا چاہے ابوبکر یا ان کے بیٹے احسن کی سالگرہ کا۔ پچھلے سال والی سالگرہ کا دن اس کی آنکھوں میں گھومنے لگا۔ کتنا حسین دن تھا وہ۔ وہ پارلر گئی تھی۔ بالوں کی کٹنگ کے ساتھ فیشل اور پارٹی میک اپ بھی کروایا تھا۔ بہت سی ڈشز بنائیں تھیں جب کہ ابوبکر کی پسند سے سالگرہ کے لیے اس نے خود پائن ایپل کاٹن پیک، ایپل فریش کریم کے علاوہ تمام کیک بنانے کے لوازمات خرید کر خود بہت بڑا کیک تیار کیا تھا جس پر بڑی سی دل شیپ والی شمع لگائی تھی۔

ابوبکر کو سرخ گلاب بہت پسند تھے۔ اس نے سارے گھر میں رکھے گلدانوں میں سرخ گلاب سجا دیے تھے۔ دیواروں پر گلاب کی سرخ ادھ کھلی کلیوں کے درمیان موتیوں کی پتیوں سے لکھا تھا۔

آئی لو یو ابوبکر۔

سب سے بڑھ کر اس نے اپنی دو مہینوں کی تنخواہ سے انتہائی قیمتی سوٹ ابوبکر کو تحفے میں دیا تھا اور ابوبکر نے اسے گولڈ کے ایئر رنگ۔ اب اس بار بھی اس کی خواہش تھی کہ وہ کوئی انتہائی قیمتی تحفہ ابوبکر کو دے اسی خواہش کے تحت وہ ایک شاپ پر گئی تھی۔ مختلف چیزیں دیکھنے کے بعد اسے ایک بہت خوب صورت ریسٹ واچ پسند آ گئی تھی مگر اس کی قیمت اتنی تھی کہ اس کے اگلے دو مہینوں کی تنخواہ بھی ٹھکانے لگ جاتی۔ وہ دل میں حسرت کی ایک پھانس لیے واپس آ گئی تھی۔

☆......☆

عاتکہ اپنے والدین کی اکلوتی لاڈلی اولاد تھی۔ وہ کسی امیر کبیر والدین کی اولاد تو نہیں تھی مگر جب تک اس کے والدین زندہ رہے اس کی کسی خواہش کو رد نہیں ہونے دیا۔ اب تو وہ دن جیسے خواب ہو گئے تھے۔ جب اس کے والدین نے اس کے لیے ابوبکر کو

چنا تو اس نے اپنے والدین کی پسند کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ یوں ابوبکر اس کی زندگی کا ہمسفر بن گیا۔ ابوبکر ایک اچھا شوہر ثابت ہوا۔ اسے اپنے والدین کی پسند پر فخر تھا۔ ابوبکر کو پا کر وہ مسرور ہو گئی تھی۔ ابوبکر سے اسے بے پایاں محبت اور اعتماد ملا تھا۔ عاتکہ کی خوب صورتی ہی نہیں اس کی خوب سیرتی نے بھی ابوبکر کو اس کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ عاتکہ سے دل کی تمام گہرائیوں سے محبت کرنے لگا تھا۔ جب اس کی شادی کے بعد اسی سال عاتکہ کے پہلے ابو اور پھر کچھ ماہ بعد امی اس جہان سے کوچ کر گئے تو وہ ابوبکر ہی تھا جس نے بے جان عاتکہ کو سنبھالا تھا۔ نہیں تو وہ بے موت مر جاتی۔ اتنے بڑے صدمے سے۔ شادی کے دو سال سسرال کے ساتھ ہنسی خوشی گزر گئے۔ پھر ان کی زندگی میں ایک چاند جیسا بیٹا آ گیا تو ان کو اپنی زندگی مکمل لگنے لگی۔ ابوبکر کے دو بھائی اور بھی تھے ان کی بھی شادیاں کر دی گئیں۔ ان کی شادیوں کے دو ماہ بعد ہی ان کے والد رحلت فرما گئے تھے۔ والدہ تو سات سال پہلے ہی رحلت فرما گئی تھیں۔ ان کے والد کی شہر میں ایک گارمنٹس کی دکان تھی مگر باپ کی وفات کے بعد دکان اور گھر فروخت کر کے سب کو ان کے حصے مل گئے۔ پھر گھر کا جو حصہ ابوبکر کے حصے میں آیا اس نے اس رقم سے ایک مناسب سا فلیٹ کرائے پر لے لیا اور ایک سال کا کرایہ ایڈوانس میں ادا کر دیا۔ وہ ایم بی اے تھا مگر ہمارے ملک میں ملازمت سفارش اور رشوت کے بغیر نہیں ملتی۔ اس کے پاس سفارش تو تھی نہیں مگر جو رقم دکان سے اس کے حصے میں آئی تھی وہ رشوت دے کر اچھی کمپنی میں جاب شروع کر دی تھی۔ اس طرح ان کی زندگی جنت کا نمونہ بن گئی۔ عاتکہ سارا دن خود کو گھر میں اور احسن میں مصروف رکھتی۔ انہیں اس فلیٹ میں آئے تین ہفتے ہو چکے تھے۔ ساتھ والے فلیٹ والوں سے ابوبکر کی اچھی دوستی ہو گئی تھی لیکن عاتکہ ابھی تک کسی کے گھر نہیں گئی تھی۔

دو سال اسی طرح گزر گئے۔ احسن بڑا ہوا تو اسے شہر کے سب سے اچھے اور مہنگے ادارے میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ پہلے تو ابوبکر کے آفس جانے کے بعد وہ احسن کے ساتھ لگی رہتی مگر اب احسن کے اسکول اور ابوبکر کے آفس جانے کے بعد وہ سارا دن اکیلی پڑی رہتی۔ اس نے ایک دن تنگ آ کر جاب کے لیے ابوبکر سے بات کی تھی کہ میں کوئی جاب کرنا چاہتی ہوں۔ جسٹ ٹائم پاس کرنے کے لیے۔ پہلے تو ابوبکر نہ مانا مگر عاتکہ بضد رہی کہ میں گھر میں سارا دن بور ہو جاتی ہوں۔

"اچھا بابا ٹھیک ہے کر لو جیسے تمہاری خوشی۔" ابوبکر جواب میں بولا تھا۔ اس طرح عاتکہ نے ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب شروع کر دی تھی۔ تنخواہ مناسب تھی۔ اس طرح اس کا ٹائم مصروفیت میں گزرتا۔

وہ بہت خوش تھے اپنی زندگی سے مگر ابھی ان پر بہت سی مشکلات آنی تھیں جن سے وہ بے خبر تھے۔ جس کمپنی میں ابوبکر جاب کرتا تھا اس کے مالک کا اچانک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بیٹے نے چارج سنبھال لیا۔ بیٹے نے چارج سنبھالتے ہی کئی ورکرز کو کمپنی سے نکال دیا تھا۔ ابوبکر بھی ان نکالے جانے والوں میں سے ایک تھا۔ تب سے وہ ہر روز اخبار میں نوکری کا ایڈ دیکھتا اور انٹرویو کے لیے جاتا مگر اب اس کے پاس کوئی رشوت نہیں تھی کہ اسے نوکری مل جاتی۔ ایک سال ہونے کو آیا تھا اب تو تمام بچت بھی ختم ہو گئی تھی۔ عاتکہ کی تنخواہ مناسب تھی جس سے احسن کی فیس، پانی، بجلی وغیرہ کے بل ادا ہو جاتے مگر اپارٹمنٹ کا کرایہ یہ سب کہاں سے پورا ہوتا۔ ان سب کے لیے اس کی تنخواہ کم پڑ جاتی تھی۔ تین مہینوں سے اپارٹمنٹ کے کرائے کے لیے مالک کو ٹرخایا جا رہا تھا۔ احسن کو پرائیویٹ سے گورنمنٹ اسکول میں داخل کروا دیا گیا تھا۔

پتہ نہیں ایسا کب تک چلنا تھا۔

☆......☆

اپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی عاتکہ کی نظر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ابوبکر پر پڑی جو سامنے انگریزی اخبار پھیلائے بیٹھا تھا۔ عاتکہ کو دیکھتے ہی اس نے سلام کیا اس نے مدہم آواز میں جواب دیا اور کچن میں چلی گئی۔ آج صبح ان دونوں میں ہلکی سی ٹڈبھیڑ ہو گئی تھی جس کی وجہ تھی پیسے۔ کیوں کہ عاتکہ کے پاس کوئی بڑی رقم نہیں تھی ابوبکر کو گفٹ دینے کے لیے اس لیے وہ چڑچڑی سی ہو گئی تھی اور کچھ دنوں سے بات بات پر ابوبکر اور احسن سے الجھ سی پڑتی تھی۔

وہ کیک فریج میں رکھ کر باہر آ گئی جہاں ابوبکر نے چائے کی فرمائش کر ڈالی۔ وہ پھر سے کچن میں گئی۔ چائے کا پانی چولہے پر چڑھا کر اپنے لیے ایک سینڈوچ بنایا اور چلتے پھرتے اسے کھانے لگی۔ ساتھ ساتھ چائے بنانے لگی۔ صبح سے اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ سینڈوچ کھانے کے بعد بھی بھوک باقی تھی مگر پیچھے صرف سات سینڈوچ بچے تھے۔ صبح ناشتے کے لیے۔ چائے بنا کر دو کپوں میں ڈالی اور ٹرے میں رکھے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ وہ ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ کر صوفے پر اس کے برابر بیٹھی تو وہ اسے اخبار سے ایک اشتہار دکھانے لگا۔ ساتھ ایک کپ اٹھا کر چائے کے سپ لینے لگا۔

"دیکھو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کو فریش ایم بی اے کیے ہوئے ٹرینی کی ضرورت ہے۔" عاتکہ پوری طرح اخبار پر جھک کر اشتہار دیکھنے لگی۔

"میں یہاں اپلائی کروں گا اگر مجھے یہاں جاب مل گئی تو زندگی بن جائے گی۔ اتنے شاندار کیریئر والی جاب اور اتنا بہترین سیلری پیکج۔"

عاتکہ کی آنکھوں میں ایک امید کی شمع روشن ہوئی۔

"مگر عاتکہ! مسئلہ یہ ہے کہ اس کمپنی کو فریش ایم بی اے ٹرینی چاہیے مگر مجھے تو چھ سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔" ابوبکر نے مایوسی سے کہتے ہوئے اخبار ایک طرف رکھا اور چائے پینے لگا۔ اسی پل ڈور بیل ہوئی۔ عاتکہ نے جا کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک انجان لڑکا کھڑا تھا۔

"جی!" عاتکہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ابوبکر کا گھر یہی ہے؟"

"جی ہاں! آپ کون؟" عاتکہ نے ایک بار پھر اس کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

"میں اس کمپنی کی طرف سے آیا ہوں جہاں پرسوں ابوبکر جاب کے لیے انٹرویو دے کر آئے تھے۔"

"اچھا......! آئیں، آئیں اندر آ جائیں۔"

عاتکہ کے اندر امید کی ایک کرن پھوٹی۔

وہ اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی جہاں ابوبکر اپنی چائے ختم کیے اس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پہلے تو وہ کسی غیر کو یوں آتا دیکھ کر ٹھٹکا مگر پھر فوراً پہچان گیا اور اسے سنگل صوفے پر بیٹھنے کی دعوت دی جسے آنے والے نے فوراً قبول کر لیا۔

"جی فرمائیں، کیسے آنا ہوا؟" عاتکہ بھی ابوبکر کے ساتھ ڈبل صوفے پر آ بیٹھی تھی۔

"میرا نام عباد ہے مجھے سیٹھ بلگرامی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

"جی کس سلسلے میں؟"

ابوبکر نے پرامید نظروں سے عباد کی طرف دیکھا کہ شاید تقدیر کو اس پر رحم آ گیا ہے۔

"یہ لیٹر انہوں نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔"

عباد نے ایک لیٹر آگے بڑھ کر ابوبکر کو تھما دیا۔

ابوبکر لیٹر کھول کر پڑھنے لگا جب کہ عاتکہ تجسس سے ابوبکر کی طرف دیکھنے لگی مگر جیسے جیسے ابوبکر لیٹر پڑھ رہا تھا اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

"آپ جا سکتے ہیں۔" ابوبکر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور عباد کو جانے کی اجازت دی۔

"سوچ لیں ابوبکر صاحب؟" عباد نے انتہائی اطمینان سے کہا تھا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" ابوبکر نے وہ لیٹر عباد کی طرف اچھالتے ہوئے انتہائی طیش سے کہا۔

لیٹر پاس ہی جا گرا جسے عاتکہ تجسس سے اٹھا کر پڑھنے لگی۔

"یہ بکواس نہیں بہت اچھی آفر ہے ابوبکر صاحب! سوچیں ذرا عقل سے سوچیں آپ کو بدلے میں اتنی بڑی رقم ملے گی کہ آپ کی اگلی دس نسلیں بھی بیٹھ کر آرام سے کھا سکتی ہیں۔ آپ کا جاتا کچھ بھی نہیں۔" عباد نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھاتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا تھا۔

"ہوں...... اچھی آفر......" ابوبکر نے نفرت سے کہتے ہوئے نگاہیں پھیریں۔ عاتکہ کا بھی لیٹر پڑھ کر مارے غصے کے برا حال ہو چکا تھا۔

"مسز ابوبکر! آپ ہی سمجھائیں ناں اپنے شوہر کو۔" عباد نے اب عاتکہ کی طرف مدد طلب نظروں سے رجوع کیا تھا۔

"آپ جاتے ہیں یا بلواؤں پولیس کو؟" ابوبکر نے اپنے پاس ٹیبل پر پڑے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"نہ نہ ابوبکر صاحب! ایسی غلطی کبھی بھول کر بھی مت کرنا تمہارے ایسا کرنے سے بلگرامی کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہاں البتہ وہ تمہاری بوٹی بوٹی کر ڈالے گا۔ شاید آپ اس کو جانتے نہیں کتنا خطرناک آدمی ہے سیٹھ بلگرامی صاحب۔" عباد نے انگلی اٹھا کر خاصے خطرناک انداز میں کہا تھا۔

"مجھے دھمکا رہے ہو؟" ابوبکر کی تیوری مزید چڑھ گئی۔

"جو بھی سمجھ لو۔" عباد نے بے نیازی سے کہا۔

"بھول کر بھی ایسی غلطی مت کرنا ابوبکر صاحب! بلند حوصلہ ہونا اچھی بات ہے لیکن اپروچ فل بندوں سے پنگا نہیں لینا چاہیے۔ میرا کام تھا تمہیں وارن کرنا۔ آگے تم اپنے اچھے برے کے خود ذمہ دار ہو گے۔"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" ابوبکر غصے سے چلایا تو عباد اٹھا۔

"ٹھیک ہے جا رہا ہوں مگر آپ پھر بھی ٹھنڈے دماغ سے سوچنا ضرور۔ وہ تو بلگرامی کو تم پر رحم آ گیا تو تمہیں آفر کر دی، ورنہ لاکھوں ہیں ان کی نظروں میں تمہارے جیسے تم نے بتایا تھا کہ تمہیں اشد ضرورت ہے نوکری کی سو تمہیں چن لیا۔"

"جاؤ۔" ابوبکر حلق کے بل چلایا۔

"ٹھیک ہے جا رہا ہوں مگر سوچ لینا پھر بھی، تین دن ہیں آپ کے پاس پھر فون پر بتا دینا آفر کا۔" وہ یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

ابوبکر غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ اس نے غصے سے دانت کچکچائے اور مٹھیاں بھینچیں اور کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ ان کی جو تھوڑی بہت خوشی تھی اب وہ بھی ختم ہو چکی تھی پھر احسن کے اسکول سے آنے پر بڑی خاموشی سے کیک کاٹا گیا تھا۔ رات کو عاتکہ تو لیٹتے ہی سو گئی مگر ابوبکر کو ساری رات نیند نہیں آئی۔ اس سوچ میں کہ وہ سب جان کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔

لوگوں کے ایمان کتنے کمزور ہو چکے ہیں کتنی بے دردی سے اپنے ہی ہاتھوں اپنے بے گناہ اور معصوم بہن بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ یہی سوچتے سوچتے تین بج چکے تھے۔ اس نے تمام خیال جھٹک کر سونے کی کوشش کی اور تھوڑی دیر میں کامیاب بھی ہو گیا۔ اگلے روز سنڈے تھا۔ عاتکہ اور احسن جلدی اٹھ چکے تھے جب کہ ابوبکر دیر سے سونے کی وجہ سے ابھی تک سو رہا تھا۔ سنڈے کو عاتکہ پہلے گھر کی صفائی کر لیتی تھی۔ پھر وہ آرام سے ناشتہ کرتے۔ احسن تھوڑی دیر پہلے باہر نکل گیا جب کہ عاتکہ صفائی میں لگی ہوئی تھی۔ صفائی کرتے وقت عاتکہ کو صوفے کے نیچے سے وہ لیٹر نظر آیا تو پھر سے اسے سارا واقعہ یاد آ گیا۔ اس نے لیٹر اٹھا کر پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔

"ایک ڈبا جو گفٹ کی طرح پیک ہو گا، بہت احتیاط سے شہر کی مین مارکیٹ میں رکھنا ہو گا۔ آپ کی جان محفوظ رہے گی کیوں کہ آپ کے وہاں سے نکلنے کے بعد وہ پھٹے گا۔ بدلے میں آپ کو بڑی رقم ملے گی۔" اس نے غصے سے لیٹر مٹھی میں بھینچ ڈالا۔

"لوگوں کا حال دیکھو خدا سے ہی ڈرنا چھوڑ دیا ہے جس نے ایک انسان کو قتل کیا گویا پوری انسانیت کا قتل کر دیا۔ مجھے ابھی پولیس کو اطلاع کرنی چاہیے۔" وہ یہ خود سے کہتے ہوئے ٹیلی فون کی طرف بڑھی ہی تھی کہ احسن باہر سے اندر داخل ہوا جس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

"ممی! یہ باہر دروازے میں پڑا تھا۔" اس نے عاتکہ کی طرف لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا جسے عاتکہ لے کر کھولنے لگی۔

لفافہ کھولتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ اپارٹمنٹ کے مالک کی طرف سے نوٹس تھا اگر ایک ہفتے میں پورا کرایہ ادا نہ کیا تو ان کا سامان ضبط کر لیا جائے گا اور ان کو نکال باہر کیا جائے گا۔

وہ سب بھول کر نوٹس پڑھتے ہی پریشان ہو چکی تھی۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آنی تھی۔ وہ یہی سوچنے لگی کیوں کہ انہوں نے پچھلے تین ماہ سے کرایہ نہیں دیا تھا۔ وہ یہی سوچ رہی تھی تبھی احسن نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"ممی! بھوک لگی ہے ناشتہ دو ناں؟"

وہ خیالوں کی دنیا سے پلٹی اور احسن کو لیے کچن میں آ گئی۔

"مما یہ کیا صرف تین سینڈوچ، اتنے سے سینڈوچ سے بھوک نہیں ختم ہوتی۔ مجھے نہیں کھانے یہ۔" وہ روٹھتے ہوئے دوسری طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔

"اچھا بیٹا! ابھی یہ کھا لو دوپہر میں چکن کڑاہی بنا کر دوں گی اپنے بیٹے کو۔" اس نے جھوٹی تسلی دیتے ہوئے تھوڑا سا سینڈوچ توڑ کر بیٹے کے منہ میں ڈالا تو وہ ماں کی اس محبت سے خوش ہو گیا تھا۔

"اب جلدی سے ناشتہ ختم کر لو میں باقی کام دیکھ لوں۔"

وہ جھوٹی مسکراہٹ کے ساتھ کچن سے باہر آئی تو سامنے زمین پر داخلی دروازے کے پاس پڑے بجلی اور گیس کے بل اس کا منہ چڑھا رہے تھے۔ وہ سر تھام کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیا بنے گا، اپارٹمنٹ کا کرایہ، گیس، بجلی کا بل کہاں سے ادا ہو گا۔" یہ سب سوچتے ہوئے اس کی نظر لیٹر پر پڑی۔ اس نے جلدی سے اٹھایا اور سیدھا کرتے ہوئے آخری لائن پڑھی "بدلے میں بڑی رقم" ملے گی۔ تو اس کے ذہن نے کایا پلٹی۔

"کیا ہے اس میں غلط جب کوئی ہمارے مسائل نہیں سمجھتا تو ہم کیوں لوگوں کی پروا کریں۔" اب صرف یہی حال بچا تھا۔ وہ دن بھر سوچتی رہی مگر پھر فوراً استغفار پڑھ کر وضو کر کے نماز کے لیے کھڑی ہو گئی اور خدا سے دعا مانگنے لگی۔

"اے مالک دو جہاں! میں تیرے دربار میں حاضر ہو کر تجھ سے رحمت اور مدد کی طالب ہوں۔ اے مالک تو ہی ہے جو ہمیں اس مشکل سے نکال سکتا ہے اور میری ایک لمحے کی غلط اور گمراہ کن سوچ کو معاف کر دے مالک جو میں کمزور پڑ گئی تھی میرے مالک ہماری مشکل آسان کر دے۔" یہ کہہ کر وہ بے ساختہ آنسوؤں سے رو پڑی تھی کہ تبھی اسے ابوبکر کی خوشی سے بھرپور آواز سنائی دی۔

"عاتکہ، عاتکہ کہاں ہو تم؟" وہ جلدی سے باہر کی جانب بڑھی جہاں ابوبکر خوشی سے جھوم رہا تھا۔ اسے ایک بہت بڑی کمپنی میں جاب مل گئی تھی اور ساتھ میں گھر اور دیگر تمام سہولیات بھی۔ اس نے بے ساختہ آگے بڑھ کر عاتکہ اور احسن کو گلے لگایا تھا تبھی عاتکہ دل ہی دل میں اپنے رب کی شکر گزار ہو گئی تھی جس نے اس کی دعا قبول کر لی تھی اور خدا پر اس کا یقین پہلے سے بھی بڑھ گیا تھا۔

......☆......



شہلا گل سحر

افسانہ

جنت کا راستہ

دکھوں کی بارش میں کیسے بھیگ سکتی ہوں
وہ دیکھو سامنے
شفقت کا چھاتا تھامے
کھڑی ہے
میری پیاری ماں

کانوں پر ہیڈ فون لگائے تیز میوزک سے لطف اندوز ہوتی۔ صبا اپنے بیڈ پر اوندھی پڑی تھی۔ ساتھ ساتھ موبائل پر ایس ایم ایس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ نرم نرم اسپاؤٹ دانتوں تلے کچلا جارہا تھا۔ اس کا یونیفارم صوفے پر پڑا تھا اور دوپٹہ نیچے لٹک رہا تھا۔ جوتے اور موزے الٹے سیدھے کارپٹ پر آرام فرما رہے تھے۔ کچن سے بلقیس بیگم کی پکار اس تک نہیں پہنچ پائی۔ تو وہ اس کے کمرے میں آگئیں۔ ایک تو پکارنے پر کوئی جواب نہ پا کے امی کا غصہ عروج پر تھا۔ مزید کمتر کی حالت دیکھ کر ان کا بلڈ پریشر مزید ہائی ہوگیا۔

"صبا! یہ کمرہ ہے یا کباڑ خانہ اوپر سے منحوس ہیڈ فون لگائے تم بالکل بہری ہوگئی ہو۔ چھوٹی بچی نہیں ہو میٹرک کی طالبہ ہو، یہی گن رہے تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ کام کاج میں تو ویسے بھی نکمی ہو کم سے کم اپنا کمرہ ہی سنبھال لیا کرو۔" امی شروع ہوئیں تو مسلسل بولتی چلی گئیں۔ ٹھیک ٹھاک ڈانٹ سے صبا کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔

"امی! اسکول سے آنے کے بعد آپ آرام بھی نہیں کرنے دیتیں۔" وہ منمنائی۔

"اسکول سے آئے تین گھنٹے ہوگئے ہیں۔ بس بہت کرلیا آرام اب کمرہ سمیٹو اور سیدھا کچن میں آؤ۔ ابو کے کچھ دوست شام کی چائے پر آرہے ہیں۔ میری لوازمات بنانے میں کچھ مدد کرو۔" امی صادر کرکے چلتی بنیں۔ صبا منہ بناتی با دل نخواستہ اٹھی اور کمرہ سمیٹ کے سیدھا کچن کا رخ کیا کہ مبادا پھر سے امی کی توپوں کا رخ اس کی طرف نہ ہوجائے۔

"امی نہ ہوتیں تو گھر میں کتنا سکون ہوتا۔" اس نے دل میں سوچا۔

صبا تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ باپ کے لاڈ و پیار نے اسے بہت آرام طلب اور پھوہڑ بنادیا تھا۔ بحیثیت ماں بلقیس بیگم اس سے بہت پیار کرتی تھیں مگر ساتھ ساتھ وہ چاہتی تھیں کہ صبا کی تربیت اسلامی خطوط کے مطابق ہو، نماز، روزہ، شرم وحیا یہ سب اوصاف اس میں ہوں۔ سگھڑ ہو مگر برا ہو اس ٹی وی اور موبائل کا جس کے اثرات کی وجہ سے صبا اکثر ان کے زیر عتاب رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اکثر ماں سے نالاں رہتی۔

"چلو صبا! اٹھو بھائیوں کے کپڑے استری کرو، بجلی کا کچھ پتہ نہیں چلتا وقت بے وقت کی لوڈشیڈنگ نے جان عذاب میں کررکھی ہے۔" امی نے بستر پر کمر سیدھی کرتے ہوئے صبا کو مخاطب کیا۔

"امی پلیز! یہ ڈرامہ دیکھ لوں پھر اٹھتی ہوں۔"

"یہ تو میں کافی ٹائم سے سن رہی ہوں۔ اٹھو جلدی کرو۔ بہت سست لڑکی ہو۔ ارے ماں کے لیے تمہارا بالکل دل نہیں دکھتا۔ صبح سے کام میں جتی ہوں۔ کپڑے دھوئے، صفائی کی، کھانا پکانا کمر دوہری ہو گئی ہے۔ تمہارے ساتھ پڑوس والی ثوبیہ بھی ہے۔ اسکول سے آ کے لیے ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ چھوٹے بھائی کو سنبھالتی ہے۔ ایک تم ہو۔ میں نے کوئی سکون نہ دیکھا۔" امی بولتے بولتے تھک سی گئیں تو آنکھیں موند کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ چاروناچار صبا کو اٹھنا ہی پڑا۔ امی کی باتیں اس کا حلق تک کڑوا کر دیتی تھیں۔

"یہ امی نہ ہوتیں تو گھر میں کتنا سکون ہوتا۔" اس نے ہمیشہ کی طرح سوچا۔

"ابو! آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے ناں کہ اگر میں میٹرک اچھے نمبروں میں کلیئر کروں گی، تو آپ مجھے انعام میں لیپ ٹاپ خرید کر دیں گے۔"

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے گڑیا! پہلے آپ میٹرک پاس تو کر لیں فرسٹ پوزیشن میں۔" "پھر ہم بھی اپنا وعدہ پورا کر لیں گے۔" ابو نے نثار ہوتی نظروں سے اپنی لاڈلی بیٹی کو دیکھا۔

"جی نہیں کوئی ضرورت نہیں۔" "ابھی سے اس کا یہ حال ہے کہ ٹی وی اور موبائل کی جان نہیں چھوڑتی، اس موئے لیپ ٹاپ سے چپک گئی تو باہر نظر بھی نہیں آئے گی۔ لڑکی ذات ہے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی بہت ضروری ہے۔ ان چیزوں نے نئی نسل کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ نماز روزہ تو درکنار بڑوں کی عزت کرنا بھی بھول گئے ہیں۔ گھنٹوں ان تباہیوں سے چپکے اپنا وقت اور ایمان دونوں بھول چکے ہیں۔" امی کا وعظ پھر شروع ہو چکا تھا۔

صبا نے پریشانی سے ابو کی طرف دیکھا مگر مسکراتے ہوئے سر ہلا کر گویا انہوں نے اسے تسلی دی۔

"یہ امی بھی کسی خوشی کے لیے نہیں چھوڑتیں اگر یہ نہ ہوتیں تو گھر میں کتنا سکون ہوتا۔" ہمیشہ کی طرح وہ سوچ کر رہ گئی۔

☆......☆

صبا کے اسکول میں ہر جمعے صبح اسمبلی کے بعد آدھے گھنٹے کا درس ہوتا تھا۔ اسلامیات کی ٹیچر مس صبیحہ کسی بھی دینی موضوع کو چن کر انہیں درس دیتی تھیں۔ ان کے لہجے کی فصاحت و بلاغت قابل دید تھی۔ اس لیے ہر لڑکی ان کی باتیں غور سے سنتی۔ آج بھی جمعہ تھا اور درس شروع ہونے والا تھا۔ صبا پر غنودگی طاری تھی کیونکہ وہ رات دیر تک اپنی کزن ماریہ سے ایس ایم ایس پر باتیں کرتی رہی تھی۔ مس صبیحہ درس شروع کر چکی تھیں۔ ان کا جادوئی لہجہ سب کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔

"جانتی ہو بچیوں! دنیا میں سب سے خوب صورت رشتہ ماں باپ کا ہے اور ہمارے رب کی طرف سے خوب صورت تحفہ بھی۔ معاشرے میں جو شخص چاہے کتنے ہی رشتوں سے منسلک ہو مگر سب سے مخلص اور سب سے مضبوط رشتہ یہی ہے۔ جب تک ہم چھوٹے ہوتے ہیں ہم اپنے ماں باپ پر انحصار کرتے ہیں۔ وہ ہماری ہر جائز خواہش پوری کرتے ہیں۔ اپنی خواہشوں کو مار کر ہمیں خوش کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں۔ خاص کر ماں جو اپنے خون اور اپنے دودھ سے بچوں کی آبیاری کرتی ہے مگر جب ہم شعور کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہیں تو ہمارے غصے اور چڑچڑے پن کا شکار یہی والدین بنتے ہیں۔ ہم اپنی ناسمجھی میں اپنی جنت کو خود اپنے ہاتھوں سے دور کرتے ہیں۔ وہ قصہ تو تم لوگوں کو یاد ہوگا جب اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰ ؑ ایک عام سے قصاب کے پاس گئے۔ کیوں کہ دنیا میں ہی اسے جنت کی بشارت ہو گئی تھی۔ وہ دیکھنے گئے تھے کہ قصاب کا کون سا خاص عمل ہے جس نے اسے

پیارے رب کی نظروں میں سرخرو کر دیا۔ اس کا عمل یہ تھا کہ وہ اپنی کمزور ضعیف العمر اور معذور ماں کی خدمت کرتا تھا اور اسے ایسے کھانا کھلاتا تھا جیسے چڑیا اپنے بچے کو کھانا کھلاتی ہے۔ اس کی بے لوث خدمت سے نہ صرف جنت واجب ہو گئی بلکہ اس وقت کے بلند پایہ پیغمبر بھی تجسس کے ہاتھوں اس قصاب سے ملنے آئے۔ والدین سے چھوٹی اور میٹھی بات بھی ہمیں اپنے رب کی نظروں میں سرخرو کر سکتی ہے اور اپنے اخلاص بھرے عمل سے نا صرف ہم قلبی سکون حاصل کر سکتے ہیں بلکہ یہ مختصر عمل ہماری نجات کا موجب بھی بن سکتا ہے۔ ہمارے پیارے پیغمبرؐ نے حضرت عزرائیل کے ساتھ مل کر ان لوگوں پر لعنت بھیجی جو والدین کو دنیا میں پا کے بھی جنت نہ حاصل کر پائیں۔ والدین کو اف کہنا بھی گناہ ہے حالانکہ یہ چھوٹا لفظ کہنے سے اگر منع کیا گیا ہے تو ماں باپ کی نافرمانی اور دل آزاری تو گناہ کبیرہ میں شامل ہے۔ یہاں تک کہ زیادہ وقت عبادت میں گزارنے کے بجائے ماں باپ کی خدمت میں گزارنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ کل کو تم اس عہدے پر فائز ہو تو تمہاری اولاد بھی تمہارے عمل کا رد عمل ہو۔ مکافات عمل تو برحق ہے جو بوؤ گے وہ کاٹو گے۔" مس صبیحہ کے لہجے کی حلاوت اور سچی باتوں نے صبا کی گویا آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں تھیں۔ اسے اپنی ماں یاد آ رہی تھی جس کی وہ کوئی بات نہیں مانتی تھی، نہ نماز پڑھتی نہ تلاوت کرتی، لڑلڑ کے کام کرتی اور ماں کے نہ ہونے کا سوچتی۔

آج کے بعد وہ ایک اچھی بیٹی بن کے دکھائے گی۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا۔ آج اسے بے صبری سے چھٹی کا انتظار تھا۔ گھر میں داخل ہو کر اس نے امی کی تلاش میں نظریں گھمائیں۔ جمعے کی وجہ سے آج ہاف ڈے تھا۔ دوپٹے سے پسینہ پونچھتی امی کچن سے برآمد ہوئیں۔

"السلام علیکم امی!" صبا نے جلدی سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! صبا میں نے تمہارے لیے لیموں پانی بنایا ہے۔ آج بہت گرمی ہے یاد سے پی لینا۔ میں نے آج تم لوگوں کی پسند کی مٹن بریانی بنائی ہے۔ بس اب رائتہ اور سلاد بناتی ہوں اور ساتھ میں کباب تل لوں گی۔ تم جا کے فریش ہو جاؤ۔" امی حسب معمول اپنی سنا کے کچن میں چلی گئیں۔

صبا کو زندگی میں پہلی بار ماں پر پیار آیا۔ پورے گھر کی ذمے داری اور سب کی خوشی کا خیال رکھنے والی ماں جیسے اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔ جب تھکن سے چور وہ غصہ کر لیتی تو ماں پر اسے بھی غصہ آ جاتا۔ حالانکہ ماں کا غصہ تو پانی کے بلبلے کی طرح ہوتا ہے جو منٹوں سیکنڈوں میں ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ صبا نے جلدی جلدی یونیفارم بدلا ہر چیز اس نے سلیقے سے رکھی اور کچن میں آ گئی۔

فریج سے شربت نکال کر اس نے ماں کو تھمایا۔

"امی! آپ جائیں باقی کا کام میں کر لوں گی۔"

"مگر تم ابھی تھکی ہوئی آئی ہو۔" امی نے کہا۔

"میں بالکل فریش ہوں بس آپ جائیں۔" اس نے رائتہ بنانے کے لیے دہی نکالا۔ تو امی حیرانی سے اسے دعا دے کر کچن سے نکل گئیں۔

صبا کے لبوں پر پرسکون مسکراہٹ تھی۔ ماں کے ساتھ ساتھ اس نے رب سے بھی معافی مانگی تھی جو دیر ہونے سے پہلے اسے راہ راست پر لے آیا تھا اور ساتھ میں شکرانے کے نفل بھی پڑھنے تھے کہ پیارے اللہ نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور اسے جہنم کا ایندھن ہونے سے بچا لیا۔ اب اسے اپنے عمل سے خود جنت حاصل کرنا تھی والدین کی خدمت کر کے۔

......☆......

قمروش شہک

سلسلہ وار ناول

قسط نمبر 22

تیرے پیار کی خوشبو

''میں ہر دکھ کا ازالہ کردوں گا لاروش! بس تم مجھے معاف کردو اور گھر چلو، بی جان اور ماما تمہیں بہت یاد کرتی ہیں اور جب تک تم مجھے معاف نہیں کروگی وہ لوگ بھی مجھے معاف نہیں کریں گی۔''



''بہت اچھی بات ہے جو بی جان اور ماما آپ کو معاف نہیں کر رہی ہیں ان کو کرنا بھی ایسا چاہیے۔''

لاروش اغولان نے اپنی دونوں ہتھیلیاں اس کے سینے پر رکھ کر اسے زور سے پیچھے دھکا دیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کے جو پیچھے ہوا پیچھے جہازی سائز بیڈ پر گرا مگر لاروش اغولان کی کلائی نہیں چھوڑی تھی۔ وہ پورے وزن سمیت اس پر آرہی تھی۔

لاروش اغولان کا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ سانسوں کا تنفس تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا تھا۔ ان ہرنی آنکھوں میں حنین آفریدی کو اپنا عکس بہت واضح نظر آیا تھا۔ بے اختیار ہی حنین آفریدی نے اس کے گرد اپنے دونوں بازوؤں کا حصار کھینچ کر خود سے مزید نزدیک کرلیا تھا۔

''میں جانتا ہوں تم بھی مجھ سے بہت پیار کرتی ہو۔ تمہاری آنکھوں کا یہ پیار میں نے بہت پہلے دیکھ لیا تھا مگر سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ آج سب کچھ واضح ہے ساری دھند چھٹ گئی ہے۔ ہر منظر صاف ستھرا نکھرا سا ہوگیا



ہے جس میں صرف میں اور تم ہیں۔" حنین آفریدی نے اس کی لرزتی گھنیری پلکوں پر اپنے دہکتے لب رکھ دیے تھے۔

لاروش اغولان کا سارا غصہ جیسے کہیں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اسے یہ دربدری کی زندگی نہیں چاہیے اسے حنین آفریدی کے ساتھ رہنا تھا۔ ان چاہنے والوں کے درمیان رہنا تھا۔ جنہوں نے اسے مان سمعان عزت، محبت چاہت دی تھی اسے اپنی بیٹی مانا ہے اور جو سب سے حیرت والی بات تھی اس کے لیے وہ یہ کہ وہ سب پہلے دن سے جانتے تھے کہ وہ حنین آفریدی کے نکاح میں ہے۔

☆......☆

"اف۔"

ثمرن بیڈ پر بیٹھ کر بری طرح کراہ رہی تھی ارشد ویسے بھی آج کل آفس سے ثمرن کی وجہ سے جلدی ہی آرہا تھا۔ وہ اپنا آرام دہ شلوار قمیض لے کر واش روم جا رہا تھا۔ ثمرن کی تکلیف دہ کراہ پر وہ شلوار قمیض صوفے پر پھینکے اس کی سمت آیا تھا۔

"کیا ہوا ثمرن طبیعت ٹھیک ہے نا تمہاری؟" ارشد اس کے قریب بیٹھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس کے چہرے پر درد کے آثار بہت زیادہ تھے۔

"بس ارشد ایسی ہی طبیعت ہو رہی ہے اتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بیٹھ جاؤں تو کھڑے ہونا مشکل ہو جاتا ہے اور اگر کھڑی ہو جاؤں تو بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جلدی سے یہ دو ماہ بھی گزریں بہت بے چینی ہو جاتی ہے۔"

"تو یار کیوں اٹھ بیٹھ رہی ہو لیٹی رہو آرام کرو۔"

"ارشد پتہ نہیں کیوں میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔" ثمرن نے ارشد کے دونوں ہاتھ اپنے لرزتے کپکپاتے ہاتھوں میں تھام کر اس پر گرفت سخت کر دی تھی۔

"کیوں!" اس کی گھبراہٹ ارشد نے اپنے اندر تک محسوس کی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم مگر اندر اندر میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔" ثمرن کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے تھے۔ ارشد کا دل خون ہونے لگا تھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا تھوڑی ہمت کرو میں ہوں سب ہیں تمہارے ساتھ۔" بس پھر کیا تھا درد کی ایک تیز لہر اٹھی تھی ثمرن کی جان نکل گئی تھی۔

"ارشد!" ثمرن چیخی تھی۔

وہ تڑپنے لگی تھی۔ اب گھبرانے کی باری ارشد کی تھی۔ اس نے نجمہ کو آواز دینی شروع کر دی۔

"ماما...... ماما...... جلدی آئیں۔"

ایک منٹ میں ارشد کے کمرے میں سب جمع ہو گئے تھے۔ گھر میں مردوں میں ارشد اور عارفین کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

"ارشد ثمرن کو اسپتال لے کر چلو۔"

"میں گاڑی نکالتا ہوں تم ثمرن بھابی کو اٹھاؤ۔" عارفین اپنی تکلیف کی پرواہ کیے بغیر تیزی سے بھاگا تھا۔ ارشد نے جلدی سے ثمرن کو بازوؤں میں اٹھایا تھا وہ بے انتہا رو رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی، ان کے ساتھ

نجمہ، آسیہ اور رابعہ بھی گئی تھیں۔ دوسری گاڑی میں ژالے، دانیہ نکلی تھیں۔ ثمرن کی ایسی حالت تھی کہ گھر پر رکھنے کو کوئی تیار ہی نہیں تھا۔

آپریشن تھیٹر میں ثمرن کو گئے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔

آفس میں زرمیل کو بھی اطلاع دے دی گئی تھی۔

آپریشن تھیٹر سے ڈاکٹر آئی تھی۔ نجمہ آسیہ تیزی سے آگے بڑھیں۔

"مبارک ہو ثمرن کے دو جڑواں بچے ہوئے ہیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔" سب کی خوشی کی حد ختم ہو گئی تھی۔ دس برس بعد ارشد کو خوشی دیکھنے کو ملی تھی۔ ثمرن کی گود بھری تھی، اس پر جتنی خوشیاں منائی جاتیں کم تھیں۔

ثمرن کو کچھ دیر بعد پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ اس کمرے میں سب اکٹھے ہو گئے تھے۔ خیرات وصدقہ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ شکرانہ نمازیں ادا کی گئیں مسجدوں میں دیگیں بھیجنے کا آرڈر دیا گیا، غریب ومساکین بچوں کو کھانا کھلانے کا کہا گیا۔ گو کہ جس کا جو دل کر رہا تھا وہ کر رہا تھا۔ ان سب میں کسی نے بھی مقسوم کی غیر موجودگی کو نوٹ نہیں کیا تھا۔ عارفین کی متلاشی نظریں اسے ہی ڈھونڈنے لگیں مگر ناکام ثابت ہوئی تھیں۔ اس کے دل ودماغ میں خطرے کا الارم بجنا شروع ہو گئے۔

"ژالے مقسوم کہاں ہے؟"

"عارفین بھائی یہیں ہوں گی۔" ژالے نے عارفین کا فکرمند چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

"ژالے وہ تمہارے ساتھ آئی ہے نا۔"

"نہیں میرا تو خیال تھا کہ وہ آپ کے ساتھ آئی ہوں گی۔" ژالے کو بھی فکر لگ گئی تھی وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تھی کہ حرا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اس کی گود میں ارشد کا بیٹا تھا۔ عارفین کے چہرے کی رنگت اڑنی شروع ہو گئی تھی۔ اس کے اندر جھکڑ سے چلنے لگے تھے۔ زرمیل کی زیرک نگاہوں سے عارفین کا ہوائیاں اڑتا چہرہ مفقود نہیں رہ سکا تھا۔

"عارفین کیا بات ہے اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہو سب خیریت تو ہے ناں۔"

"نہیں زرمیل میرا خیال ہے کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ مقسوم ہمارے ساتھ نہیں آئی ہے تم یوں کرو سلجوق کو لے کر پہنچو میں تمہیں وہیں ملتا ہوں۔" عارفین نے اپنے گلے ہاتھ میں بندھی پٹی بے دردی سے اتار کے پھینکی تھی اور اپنی گاڑی اسٹارٹ کر لی۔

"بے وقوف...... یہ لڑکی بالکل عقل سے پیدل ہے۔" وہ غصے میں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا تیزی سے گاڑی بھگا رہا تھا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا مگر قسمت نے بروقت اس کا ساتھ دیا تھا، گھر کے پاس ہی اسفند درانی کی گاڑی کھڑی تھی، جس میں وہ دونوں آگے اور مقسوم اکیلی پیچھے بیٹھی تھی۔ عارفین کا خون رگوں میں لاوا بن کر بہنے لگا تھا اس نے مزید اسپیڈ بڑھائی تھی اور لا کر اسفند درانی کی گاڑی کے آگے لا کر اس طرح روک دی کہ وہ گاڑی آگے بڑھا ہی نہیں سکتا تھا۔ یاور پسٹل لے کر غصے میں باہر نکلا تھا۔ مقسوم کا دل دہل کر رہ گیا تھا۔ یاور درانی کو یوں غصے میں پسٹل نکال کر گاڑی سے باہر نکلتے دیکھ کر وہ بھی باہر نکلی تھی۔

"نہیں یاور تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، تم عارفین کو کچھ نہیں کہو گے۔" مقسوم نے یاور درانی کا پسٹل پکڑا



تھا۔

''تو پھر اسے اپنی زبان میں کہو کہ یہ ہمارے راستے سے ہٹ جائے۔'' یاور درانی نے مقسوم کا ہاتھ جھٹک کر عارفین کو گھورا تھا۔

''عارفین پلیز! آپ جائیں یہاں سے میں ان لوگوں کے ساتھ اپنی مرضی سے جا رہی ہوں۔''

''شٹ اپ...... جسٹ شٹ اپ۔ اگر آگے ایک اور لفظ بھی کہا تو ابھی یہیں تمہاری جان نکال لوں گا۔'' عارفین نے مقسوم کو بری طرح جھڑکا تھا اس کو مقسوم سے اتنی بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔

''بس بہت ہو گیا آج اس بات کا فیصلہ ہو ہی جائے۔'' اس کا غصہ اتنا جلالی تھا کہ مقسوم اندر تک کانپ کر رہ گئی۔

''دیکھو مسٹر عارفین! تمہیں آرام سے سمجھا رہے ہیں ورنہ میرے اور میرے بیٹے کے لیے کسی کو بھی مارنا کوئی بڑی بات نہیں ہے اور اس کا ہلکا سا نمونہ تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔'' اسفند درانی کا اشارہ اس کے بازو پر لگی گولی پر تھا۔

''تم جیسے شیر کی کھال میں چھپے گیدڑ صرف دھمکیاں ہی دے سکتے ہو۔ ہمت تھی تو سامنے سے آ کر وار کرتے بزدلوں کی طرح پیچھے سے وار کیوں کرتے ہو۔''

''عارفین!'' اسفند درانی اور یاور درانی بری طرح دہاڑے تھے۔

''آواز نیچی...... ورنہ ایسا نہ ہو کہ تمہاری زبان حلق سے کھینچ کر تمہارے ہی ہاتھ پر رکھ دوں۔'' عارفین نے دونوں کو باری باری گھورا تھا اور عارفین بیگ صرف دھمکیاں نہیں دیتا کر گزرتا ہے۔

''اچھا اپنی بہادری اور طاقت پر بڑا غرور ہے نا تمہیں ابھی پتہ چل جائے گا کہ دھمکی کس چڑیا کا نام ہے۔'' اسفند درانی نے اپنی بڑی سی جیپ کے پاس کھڑے دونوں مسلح گارڈز کو آرڈر دیا تھا اسفند درانی کے آرڈر پر دونوں مسلح گارڈ عارفین کی طرف بڑھے۔

خوب زبردست ہاتھا پائی ہوئی تھی۔ ایک گارڈ نے تو ایک زور کا مکا عارفین کے کسرتی بازو پر رسید کر دیا تھا کہ اس کی ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ وہاں سے اب خون رسنے لگا تھا۔

مقسوم کی روح تک تڑپ کے رہ گئی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی مگر یاور درانی نے اس کا ہاتھ پکڑ کے روک لیا تھا۔

''یاور چھوڑ دو مجھے...... عارفین......'' وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی جان توڑ کوشش کرنے لگی تھی مگر یاور درانی کی گرفت بہت سخت تھی۔ مقسوم حلق کے بل چیخ رہی تھی۔ عارفین کے کسرتی بازو سے خون بہت بہہ رہا تھا۔

مگر وہ بھی عارفین تھا جس نے جوڈو کراٹے میں ماسٹر کیا ہوا تھا۔ وہ بلیک بیلٹ تھا۔ عارفین نے مقسوم کو چیختے چلاتے روتے تڑپتے دیکھا تو اس کا خون کھول اٹھا جس میں دگنا اضافہ یاور درانی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس نے مقسوم کا ہاتھ بری طرح سے پکڑا ہوا تھا۔ اس کا جوش مزید بڑھا اور ان گارڈز کو عارفین نے اتنا مارا کہ وہ دونوں خون میں لت پت ادھر ادھر گرے تھے اب باری تھی اسفند درانی اور یاور درانی کی۔

''عارفین تیری موت میرے ہی ہاتھ لکھی ہے۔'' یاور درانی نے مقسوم کو اسفند درانی کی طرف دھکیلا تھا۔ یاور درانی نے پسٹل کی نلی عارفین کی طرف کی مگر اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا۔ وہیں دور سے آتے سلجوق آفریدی نے اس کے ہاتھ پر گولی چلا دی تھی یاور درانی کے ہاتھ سے پسٹل دور جا گری تھی۔

اسفند درانی نے سلجوق آفریدی کو پولیس فوج کے ساتھ دیکھا تو مقسوم کو چھوڑا اور یاور درانی پر چیخا تھا۔

''یاور بھاگ۔''

مگر سلجوق آفریدی نے اسفند درانی کے پیر پر گولی ماردی تھی۔ سلجوق آفریدی نے اسفند درانی اور یاور درانی کو پکڑ لیا تھا۔ پولیس نے ان دونوں کو گارڈ سمیت پولیس وین میں ڈال دیا تھا۔

''فکر مت کرو اب کچھ نہیں ہوگا۔ کینیڈا کی گورنمنٹ کو تلاش ہے ان مجرموں کی، یہ وہیں جائیں گے۔'' سلجوق آفریدی نے زرمیل کو دیکھا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' سلجوق آفریدی نے عارفین کو دیکھا۔

''عارفین تمہارے ہاتھ سے تو بہت خون بہہ رہا ہے۔'' وہ پریشان ہوگیا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم ان لوگوں کو یہاں سے لے جاؤ۔'' عارفین نے اپنے ہاتھ پر توجہ دیئے بغیر مقسوم کو غصے سے دیکھا اور اس کی طرف بڑھا اس کی کلائی زور سے پکڑی تھی۔ مقسوم کو تقریباً گھسیٹتا ہوا اندر لایا تھا اور اپنے بیڈروم میں لا کر زور کا دھکا دے کر دروازہ اندر سے بند کر کے لاکڈ کر لیا تھا۔ عارفین دروازہ لاکڈ کر کے مقسوم کی طرف بڑھا اور ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ کہاں وہ نازک اندام سی اور کہاں وہ باڈی بلڈر عارفین، وہ عارفین کا وار سہہ نہ سکی اور دور جا کر گری تھی۔ عارفین پھر غصے میں آگے بڑھا اور اس کا بازو سختی سے پکڑ کے کھڑا کر کے مقابل کھڑا کیا۔

''کیا سوچ کر مجھ سے بغیر اجازت کے تم نے گھر سے قدم باہر نکالا میرے منع کرنے کے باوجود تم ان لوگوں کے ساتھ جا رہی تھیں۔'' عارفین کا اس قدر غیض وغضب بھرا انداز دیکھ کر وہ مزید خوفزدہ ہوگئی تھی۔

''عارفین میں نہیں چاہتی تھی کہ اسفند چاچو اور یاور آپ کا کوئی اور نقصان کریں آپ کو تکلیف پہنچائیں۔'' سیاہ آنکھوں میں ایک سمندر موجزن تھا۔ لب کپکپا رہے تھے۔ درد کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''اور جو تم میرا نقصان کر کے جا رہی تھیں اس کا کوئی احساس کوئی پرواہ ہے تمہیں۔'' عارفین کی ذومعنی بات مقسوم کی بالکل سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

اس نے خاموشی سے بھیگی پلکیں سرخ عارض پر گرالیں۔ عارفین نے غور سے دیکھا تھا۔

''آل رائٹ۔'' عارفین نے ایک سرد آہ لی اور اس کا بازو چھوڑ دیا تھا۔

''تم میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی ہو، ٹھیک ہے اسفند درانی اور یاور درانی کینیڈا کی جیل کی سلاخوں تک پہنچ جائیں پھر تمہارا ابھی فیصلہ کر دوں گا تم نے جس مقصد کے تحت مجھ سے شادی کی تھی، اس میں تم کامیاب بھی ہوگئی ہو، بہت جلد میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔'' عارفین کا بہت سا خون بہہ جانے کی وجہ سے اسے بہت کمزوری ہوگئی تھی اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس نے اپنے سارے عقل وخرد گنوا دیئے تھے۔ مقسوم ڈر وخوف کے زیر اثر عارفین کی طرف بڑھی تھی۔

''عارفین...... عارفین......''

وہ تو صد شکر کہ زرمیل یہیں ان کی طرف آرہا تھا۔ مقسوم کے چیخنے پر اس نے زور زور سے دروازہ پیٹا تھا۔ مقسوم نے جلدی سے دروازہ کھولا اور زرمیل اندر آیا تھا۔

''او مائی گاڈ!''

''زرمیل بھائی عارفین......'' اس کا پورا وجود ہچکیوں کی زد میں تھا۔

زرمیل کے فون کرنے پر ڈاکٹر بھی فوراً ہی آگیا تھا۔ اسی اثناء میں ثمرن اور دونوں جڑواں بچوں کے ہمراہ سب خوشی خوشی گھر میں داخل ہوئے تھے۔ سب کو عارفین کی طبیعت کے بارے میں پتا چلا تو سب پریشان ہو اٹھے۔

زرمیل نے رابعہ اور مقسوم کو تسلی دی کہ سب ٹھیک ہے عارفین جلد ہی صحت یاب ہو جائے گا۔

☆......☆

ڈاکٹر کی ٹریٹمنٹ نے عارفین کی حالت قدرے بہتر کر دی تھی۔ وہ اس وقت دوائیوں اور انجکشن کے زیر اثر پرسکون سویا تھا۔ گھر کے بھی لوگ اس سے مل کر جا چکے تھے۔ فہیم احمد نیروبی سے کچھ گھنٹے پہلے آئے تھے اور جیسے ہی عارفین کی طبیعت کے بارے میں پتہ چلا وہ فوراً اسے دیکھنے اوپر آئے تھے۔ زرمیل، عارفین اور ارشد میں انہوں نے کبھی کوئی فرق نہیں رکھا تھا۔ وہ جو کچھ زرمیل کے لیے لاتے بچپن میں عارفین کو بھی وہی دلاتے تھے۔ عارفین کا بھی یہی حال تھا باپ کی شکل تو اس نے کبھی دیکھی نہیں تھی جو اس کے پیدا ہوتے ہی کینسر کا شکار ہو کر یہ دنیا چھوڑ گئے تھے مگر اپنے دونوں ماموں اور ممانی کو ویسی ہی عزت و احترام دیتا جیسی اپنی ماں رابعہ کو دیتا، اسی لیے تو سب گھر والے اس کی تکلیف پر پریشان ہو اٹھے تھے۔

عارفین بیڈ پر کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ مقسوم آرام سے چلتی ہوئی آئی اور عارفین کے پاس بیٹھ گئی۔ آج اس کو کوئی جھجک کوئی عار نہیں تھا۔ عارفین کے پاس اس کے قریب بیٹھنے پر، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عارفین اتنا دیوانہ وار اس سے محبت کرتا ہے کہ اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے اور اس نے...... عارفین کو کیا دیا سوائے درد تکلیف اور اذیت کے...... وہ بغور اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی عارفین سوتا ہوا بہت معصوم لگ رہا تھا اس نے بلا جھجک اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اپنی بھیگی بھیگی آنکھوں سے لگا لیا تھا۔

''مجھے معاف کر دیں عارفین! میں آپ کو سمجھ ہی نہیں سکی۔ آپ بہت اچھے ہیں میں آپ کی قدر نہیں کر سکی۔'' اس کی ہچکیاں بندھ گئیں آگے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا بس روئے جا رہی تھی۔

''پلیز عارفین! مجھے معاف کر دیں مجھے خود سے جدا مت کریں میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی۔''

''اگر مرنے دیتا تو آج اس حالت میں بستر میں نہیں پڑا رہتا۔'' عارفین کی گھمبیر آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ یعنی وہ جاگ رہا تھا۔

کس قدر شرمندگی نے گھیرا تھا۔

''میرے لیے عارفین نے اتنا خطرہ مول لیا ہے اور میں پھر بھی انہی دھوکے باز لوگوں کا ساتھ دینے چلی تھی۔''

''آپ جاگ رہے ہیں۔'' لہجے میں شرمندگی ہی شرمندگی تھی۔

''اچھا ہے نا ورنہ اتنا خوب صورت اقرار اور اظہار محبت جس کے لیے میں ترس گیا تھا کیسے سن سکتا تھا۔''

مقسوم اس کی بات پر بری طرح نا صرف جھینپ کر رہ گئی بلکہ سیاہ آنکھوں سے اشکوں کا ایک ریلا ٹوٹ کر بہنے لگا تھا۔

''جانتی ہو نا میں کتنی تکلیف میں ہوں تم پھر بھی مجھے اپنے آنسوؤں سے اور تکلیف اور اذیت دے رہی

ہو۔''

عارفین کا بس اتنا ہی کہنا تھا کہ وہ اس کے چوڑے سینے پر سر دھر کے جو روئی تھی تو اگلا پچھلا سارا سیلاب آنکھوں کے ذریعے اس کے سینے پر جذب ہوتا چلا گیا تھا۔ عارفین کے ہونٹوں کی مسکراہٹ یکدم دم توڑ گئی اس نے سختی سے اپنے جبڑے بھینچ لیے تھے۔

''عارفین خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔'' اس کا پورا وجود ہچکیوں کی زد میں تھا۔ عارفین سے بھلا کہاں برداشت ہوتا اس کا یوں بلک بلک کر زار و قطار رونا اس نے بڑی مشکل سے اپنا زخمی بازو اٹھایا اور اس کے سر پر رکھ دیا تھا۔

''مقسوم! بس کرو کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں مجھ سے معافی مانگنے کی کیوں کہ جن لوگوں سے ہم بے انتہا محبت کرتے ہیں اپنے دل میں کسی قیمتی شے کی طرح سنبھال کے رکھتے ہیں، ان سے کبھی بھی ناراض نہیں ہوتے اور مقسوم...... '' عارفین نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تھا۔

''میں نے تم سے صرف محبت ہی نہیں کی تم میرا عشق بھی ہو۔'' عارفین نے اس کا بھیگا چہرہ اپنے ہاتھ سے صاف کیا تھا۔

''مگر ہاں میں تم سے ضرور معافی مانگوں گا۔'' آنکھوں میں مسکراہٹ لیے وہ بغور ان سیاہ آنکھوں میں جھانکنے لگا تھا۔

''وہ کس لیے؟''

''میں نے تمہیں یہاں زور سے تھپڑ مارا تھا۔'' عارفین نے ہولے سے اس کے گال پر اپنی ہتھیلی پھیری تھی۔

''وہ تو میں نے غلطی کی تھی نا۔'' ہولے سے پلکوں کی باڑ گرالی تھی۔

''مقسوم اگر میں بروقت نہ پہنچتا تو جانے وہ کہاں لے جاتے تمہیں، کیا کرتے یہی سوچتا ہوں تو جسم سے ایسا لگتا ہے روح نکل رہی ہو۔''

''لیکن عا......''

''شش......'' عارفین نے مقسوم کے ہونٹوں پر انگلی رکھ تھی اور نفی میں اِدھر اُدھر گردن ہلائی تھی۔

''اب ہم کبھی بھی اس ٹاپک پر بات نہیں کریں گے او کے۔''

''عارفین۔'' مقسوم نے اس کی اپنے ہونٹوں پر رکھی انگشت شہادت پکڑ کر دھیرے سے پکارا تھا۔

''ہوں۔''

''میں آپ سے الگ رہ کر جینا نہیں چاہتی، مجھے اس گھر سے بہت پیار ملا ہے آپ مجھے چھوڑیں گے تو نہیں نا۔'' اس کے دل کا ڈر اس کی زبان پر آ گیا تھا۔

''یہ واہیات خیال تمہارے ذہن میں کیونکر آیا۔''

''آپ ہی نے کہا تھا کہ آپ میرا فیصلہ کر دیں گے مجھے آزاد کر دیں گے۔'' کتنی مشکل سے اس نے یہ چند لفظ بولے تھے۔ عارفین نے بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا وہ تو بھول چکا تھا کہ اس نے ایسا کچھ کہا ہے۔ اس نے مقسوم کی کمر میں اپنا بازو ڈال کر اسے خود سے اتنا قریب کر لیا کہ دونوں کی گرم سانسیں ایک دوسرے سے الجھنے لگی تھیں۔

''مسز مقسوم عارفین آپ ہماری رگوں میں لہو بن کر بہتی ہیں۔ میری آتی جاتی سانسوں میں خوشبو بن کر مہکتی ہو، میرے جسم میں مقید میری روح ہو تم تو کیا اگر جسم سے روح الگ کر دی جائے جسم زندہ رہ پائے گا۔ تم میری قسمت ہو اور اپنی خوش قسمتی سے جدا ہو کر کون زندہ رہ سکتا ہے۔''

کتنا خوب صورت اقرار کر رہا تھا وہ کہ مقسوم کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ دل بہت پر سکون ہو گیا تھا اس نے آسودہ ہو کر عارفین کے وسیع سینے پر اپنا سر دھر دیا اور آنکھیں موند لیں۔ عارفین ہولے سے مسکرا دیا اور اس کے سر پر اپنے پیار کی مہر ثبت کر دی۔

☆......☆

وانیہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔ جب ہی حسن چلا آیا۔

''السلام علیکم!'' وانیہ نے نہایت چونک کر پلٹ کر دیکھا تھا۔ ہاتھ سے ریموٹ بھی گر گیا تھا۔ ایسا لگا جیسے اچانک سے آفریدی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔

''......وعلیکم......السلام......!'' زبان بری طرح لڑکھڑا کے رہ گئی تھی۔

حسن آفریدی نے بغور اسے دیکھا تھا۔ پھر قالین پر پڑے ریموٹ کو دیکھا وہ آگے بڑھا اور اس کے قدموں پر جھک کر ریموٹ اٹھا لیا۔ حسن آفریدی کے اس طرح جھکنے پر وہ ڈر کر پیچھے کھسکی تھی۔ اس کی کلون کی تیز خوشبو وانیہ کے نتھنوں میں گھس کر بہت کچھ یاد دلا گئی تھی اس نے پھر چونک کر حسن آفریدی کو تکا تھا۔ یہ خوشبو کتنی جانی پہچانی ہے۔

وانیہ کے یوں گم صم ہونے پر حسن آفریدی نے پہلے ریموٹ ٹیبل پر رکھا پھر اس کی پرسوچ آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی تھی۔ وہ گڑبڑا کے رہ گئی۔

''کیا میں عارفین سے مل سکتا ہوں۔''

''جج......جی......''

''یہ میرے سوال کا جواب ہے یا حیرت کا اظہار۔'' وہ دلکشی سے مسکرا دیا تھا۔

''جی وہ اپنے کمرے میں ہیں۔''

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ عارفین اپنے کمرے میں ہے مگر میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟'' حسن آفریدی نے بغور اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور ان آنکھوں سے نظر ہٹتی ہوئی سیدھی اس کی صراحی دار شفاف گردن پر پڑے سیاہ تل پر ٹھہر گئی تھی۔

حسن آفریدی کے یوں گھور گھور کر دیکھنے پر وانیہ بری طرح جھینپ کر نا صرف رہ گئی تھی بلکہ اپنے دوپٹے کو اور ٹھیک کر کے اپنی گردن بھی چھپالی تھی۔ حسن آفریدی نے اپنی نظروں کا رخ پھیر لیا تھا۔ ہونٹوں سے مسکراہٹ یکدم غائب ہو گئی تھی۔

''میں رابعہ ماما کو بلا کے لاتی ہوں۔'' وانیہ سے وہاں رکنا محال ہو رہا تھا وہ سیدھی بھاگتی ہوئی رابعہ کے بیڈ روم میں آئی تھی۔

وہ عارفین سے ملا یا نہیں وہ نہیں جانتی مگر وہ بیڈ روم سے باہر نہیں نکلی تھی۔ آج پھر اسے وہ بلوریں آنکھیں یاد آ گئی تھیں۔

☆......☆

لاروش اغولان کو دو دن ہو گئے تھے یہاں آئے مگر کسی کے بھی رویے سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس سے ناراض ہیں بلکہ زوباریہ نے تو اسے خود سے لپٹا کے خوب پیار کیا تھا۔ بی جان نے بھی اسے گلے سے لگایا تھا۔ صمد آفریدی نے اس کے سر پر دستِ شفقت رکھا تھا۔

''اسی لیے بار بار بول رہا تھا کہ مجھ سے دوستی کر لو فائدے میں رہو گی مگر تم تو کچھ سمجھ ہی نہیں رہی تھیں اگر عارفین کا مسئلہ بیچ میں نہ آیا ہوتا تو تمہیں اس گھر میں واپس آنے میں اتنے دن بھی نہیں لگتے۔'' سلجوق آفریدی نے نرمی سے لاروش اغولان کو دیکھا تھا۔

''غلطی کچھ ہماری بھی ہے جب یہ گھر آئی تھی ہمیں اسی دن بتا دینا چاہیے تھا کہ تم اس گھر کی بہو ہو حنین کی بیوی مگر ہم ان دونوں کا انتظار کرتے رہے کہ کب یہ بتائیں گے اور دیکھ لو ہماری دیری نے یہ دن دکھایا کہ ہماری بیٹی کو گھر سے در بدر ہونا پڑا۔'' بی جان نے لاروش اغولان کا سر اپنے کندھے سے لگایا تھا۔

''آئی ایم سوری بی جان!'' اس نے شرمندگی سے بی جان کا نرم ہاتھ تھام لیا تھا۔

''نہیں کوئی بات نہیں اگر تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا وہ یہی کرتا ہنی نے جو کیا وہ غلط کیا اور اسے اپنی غلطی پر نا صرف پچھتاوا ہے بلکہ اسے تمہاری قدر بھی ہو گئی ہے۔'' لاروش اغولان ہولے سے مسکرا دی اور کن انکھیوں سے سلجوق آفریدی کے برابر میں بیٹھے حنین آفریدی کو دیکھا۔

''یار! اتنی آؤ بھگت ہو گئی اتنا پیار سمیٹ لیا، اب ذرا مجھ پر بھی توجہ دے لو۔ صبح سے بھوکا ہوں۔'' حنین آفریدی نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا تھا۔ ''سچی جب سے گئی ہو کچھ اچھا کھانے کو نہیں ملا۔''

''شاباش بیٹا! کیا کہنے ہیں تمہارے۔'' زوباریہ نے اسے گھور کے دیکھا تھا۔ حنین آفریدی کان کھجا کے رہ گیا تھا۔

''ماما اس کو سزا تو ملنی چاہیے نا۔'' سلجوق آفریدی نے شریر لہجے میں کہتے ہوئے اپنے برابر میں بیٹھے حنین آفریدی کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

''بالکل ملے گی اور سزا یہ ہے کہ حنین ہی آپ کی شادی کے ہر فنکشن کا سوٹ شادی کی پوری تیاری لاروش کو اپنے پاکٹ منی سے کرائیں گے۔''

''یہ سزا......'' حنین آفریدی یکدم خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہن میں حسن آفریدی گھوم گیا۔ اس نے بھی تو ہم سب لوگوں سے دور رہ کے سزا کاٹی ہے اکیلے ہی سب سنبھالا ہے اور اب گھر کی شادی ہے وہ کیسے اس گھر کی شادی میں نہ ہو۔

''کیا ہوا یہ سزا کم ہے کیا؟'' سلجوق آفریدی نے پر مزاح انداز میں اسے چھیڑا تھا۔

''میرے پاس آپ سب کے لیے ایک سرپرائز ہے۔''

''بات پلٹنا تو کوئی تم سے سیکھے۔''

''او کے نہ یقین کریں مگر جب یہ سرپرائز کا بم پھٹے گا نا تو آپ سب مجھے شادی کی شاپنگ کرانے کی آفر کریں گے۔''

''بیٹا! مجھے مغرب کی نماز ادا کرنی ہے میں تو چلوں۔'' بی جان کو اس کا سب پتہ تھا۔ یقیناً کوئی لڑکی کی کہانی ہو گی اور ابھی ان کے پاس ٹائم نہیں تھا کہ وہ سنتیں۔ ''بی جان سمجھ گئی ہیں تمہارے سارے بہانے اور میں بھی جانتی ہوں کہ یقیناً کسی لڑکی کے بارے میں کوئی سرپرائز ہے مگر یاد رکھنا اس بار تمہارے بابا

تمہارے کان پکڑیں گے۔'' زوباریہ بھی بور ہوتی ہوئی اٹھیں اور ساتھ لاروش اغولان بھی۔

''بھئی میں تو آپ سب کو سرپرائز دے رہا تھا ابھی، اب انتظار کریں پھر مجھ سے شکایت مت کرنا۔''

''کسی میں ہمت نہیں ہے اس وقت پکنے کی سو باتیں مت بناؤ۔''

''یہ تم کہاں جا رہی ہو۔ مجھے کچھ کھانے کو تو دے دو بھوک لگ رہی ہے۔'' حنین نے جاتی ہوئی لاروش اغولان کو ٹوکا تھا۔ لاروش اغولان نے پلٹ کر دیکھا تو اس نے اتنی معصوم سی شکل بنا لی تھی کہ اسے ترس آ گیا۔ سلجوق آفریدی نے مسکرا کے دیکھا۔

وہ اندر جانے کا ارادہ کینسل کرتی ہوئی کچن میں چلی آئی تھی۔

☆......☆

حرا اور سلجوق آفریدی کی شادی کے سلسلے شروع ہو چکے تھے۔ تاریخ رکھ دی گئی تھی۔ اس اچانک شادی پر سب خوش تھے مگر جو جھنجلا گئی تھی وہ تھی ژالے جسے اپنی شاپنگ کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔

''شادی کی اتنی جلدی کیا پڑی تھی میری تو کوئی شاپنگ نہیں ہے۔ شادی میں پہننے کے لیے ہر فنکشن کا سوٹ چاہیے۔'' وہ جھنجلاتی ہوئی بولی تھی۔

''جی ہاں ہم سب جانتے ہیں کہ جب تک ژالے مارکیٹ کے دس چکر نہ لگا لے سب کا کھانا ہضم نہیں ہونے دے گی۔'' عارفین نے جی بھر کے چڑایا۔

''آپ تو چپ ہی رہیں تو اچھا ہے لیکن میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ میں مقسوم بھابی کو ہی پکڑوں گی۔ مقسوم بھابی آپ میرے ساتھ شاپنگ پر چلیں گی نا؟'' ژالے کا ڈائریکٹ رخ مقسوم کی سمت تھا۔

''میں......'' ژالے کا رخ اور پھر ڈائریکٹ اس سے کہنا سب کے درمیان وہ بھونچکا کے رہ گئی تھی۔ اس کی شکل پر ایسی مسکینی تھی جو حلال ہونے والے بکرے کی شکل پر قربانی کے بعد ہوتی ہے یا جیسے کسی مجرم کو پھانسی پر لٹکانے پر اس سے آخری خواہش پوچھ لی ہو۔ مقسوم کی معصومیت بھری شکل دیکھ کر عارفین کا چھت پھاڑ قہقہہ پورے ہال میں گونجا تھا۔ ژالے نے نہایت گھور کے عارفین کو دیکھا پھر مقسوم کو دیکھا تھا۔

''ژالے! میں ضرور چلتی مگر تم دیکھو ماں آج کل عارفین کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ان کے لیے سوپ پرہیزی کھانا اور دوائی وغیرہ کا خیال مجھے ہی دیکھنا ہوتا ہے۔''

''مقسوم بھابی! آپ کو عارفین بھائی کی محبت نے سچ کا بگاڑا ہے۔'' عارفین اس پر بھی چپ نہیں رہا۔ ایک تو مقسوم کا بہانہ پھر ژالے کی بات وہ پھر سے زور سے ہنسا تھا۔

ژالے نے ثمرن کو دیکھا تھا۔ ثمرن جو کیری کاٹ میں لیٹے اپنے بیٹے کو جھلا رہی تھی اس کے ہاتھ میں ذرا تیزی آ گئی تھی۔

''اللہ ژالے! میں تو ضرور چلتی مگر دیکھو تو تمہارا بھتیجا اتنا روتا ہے کہ کیا بتاؤں وہ میرے بغیر رہتا ہی نہیں ہے۔''

''ثمرن بھابی! ہم زیادہ ٹائم نہیں لیں گے۔''

''نہیں چندا! یوشع بہت روتا ہے اور مارکیٹ میں تو مزید گھبرائے گا۔''

''ثمرن، لاروش کا کوئی فون وغیرہ آیا، کہاں ہے وہ بچی اتنا پتا شادی میں بلایا ہے نا اس بچی کو؟'' رابعہ کو اچانک سی لاروش اغولان کی یاد آئی تھی۔

''رابعہ پھپھو! لاروش کو اس کا ہسبینڈ لے گیا ہے اور فون تو کوئی نہیں آیا۔ میں بھی انتظار کر رہی تھی۔ اس کے فون کا کہ اگر آئے گا تو بلاؤں۔''

''ماشاء اللہ سے اتنی پیاری بچی تھی کہ دل خوش ہوتا تھا اس بچی کو دیکھ کر۔'' رابعہ کی نظروں میں لاروش اغولان کا چہرہ گھوم گیا تھا۔

''اگر وہ یہاں ہوتی تو وہ ژالے کے ساتھ چلی جاتی۔''

''جی ہاں بجا فرمایا آپ نے جو یہاں موجود ہیں وہ تو میرے ساتھ چل نہیں رہی ہیں اور جو نہیں ہیں ان کی فکر کے لیے چل رہی ہیں۔'' ژالے، ثمرن کی چالاکی سمجھ گئی تھی۔

''بے چاری پھنس گئی۔'' ارشد نے دھیرے سے کہا تھا۔

''مت جاؤ کوئی بھی میری بیسٹ فرینڈ حرا میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گی۔'' ژالے نے بڑے یقین سے کہتے ہوئے حرا کے گلے میں ہاتھ ڈالا تھا۔

''سوری یار ژالے! میں تو مایوں بیٹھ رہی ہوں ابھی کل ہی پانچ ہزار کا فیشل، مینی پیڈی کیور کروایا ہے، دھوپ اور گرمی سے خراب ہو جائے گا۔'' ژالے کا ہاتھ اپنے گلے سے نکالا اور تھوڑا پیچھے کھسک گئی۔

''دیکھ لیا کوئی حامی نہیں بھر رہا تھا۔ تمہاری بیسٹ فرینڈ حرا نے بھی ہری جھنڈی دکھا دی۔ اب سمجھ جاؤ کہ تمہارے ساتھ شاپنگ پر جانا دانتوں کے نیچے پسینہ آ جانے کے مترادف ہے۔'' ارشد باز نہیں آیا تھا اسے چھیڑنے سے۔

''مجھے تو لگ رہا ہے آپ نے پیسہ کھلایا ہے ان لوگوں کو۔'' ژالے نے تپ کر عارفین کو دیکھا تھا۔

''خدا کا خوف کرو کیوں مجھے مشکوک بنا رہی ہو۔''

ژالے کچھ بولتی کہ زرمیل بول پڑا۔

''ژالے اپنی شاپنگ کی ساری لسٹ پندرہ منٹ میں بناؤ میں لے کر چلتا ہوں ابھی۔''

''چلو جی آ گیا زرمیل کو جوش۔'' عارفین نے اپنے دونوں ہاتھ جھاڑے تھے۔

''آپ!'' اب سٹپٹانے کی باری ژالے کی تھی۔

''کیوں میں نہیں چل سکتا کیا؟'' زرمیل نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ کافی دیر سے بیٹھا لیپ ٹاپ پر کچھ کر رہا تھا۔

''نہیں زرمیل وہ بات نہیں ہے مگر آپ کو شاپنگ کرنا نہیں آتی ہے۔'' وہ منمنائی تھی۔

''لیکن تمہیں شاپنگ میں ہی کراؤں گا کیوں کہ تمہیں میرے علاوہ کوئی ہینڈل نہیں کر سکتا۔'' زرمیل نے لیپ ٹاپ بند کر کے ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور بغور ژالے کو دیکھا۔

''جی میرے شیر۔'' عارفین نے پھر جملہ کسا۔

''اچھا آپ رہنے دیں میں ارشد بھائی کے ساتھ ہی چلی جاتی ہوں۔''

''سوری گڑیا! اگر میری میٹنگز اور ڈیلی گیشن کا مسئلہ نہ ہوتا یا میں نے حسن کے ساتھ نیا بزنس اسٹارٹ نہیں کیا ہوتا تو میں ضرور تمہارے ساتھ چلتا مگر ابھی بالکل ٹائم نہیں ہے۔ میرے پاس لو یہ دیکھو میرا فون بھی آ گیا۔'' ارشد کا فون بج رہا تھا۔ فون آن کر کے وہ فوراً وہاں سے نکلا تھا۔ زرمیل نے ژالے کو ایسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ''اب''۔

''وانیہ...... وانیہ فارغ ہے وہ میرے ساتھ چلے گی۔''

''آئی ایم...... سو...... سو...... سوری...... ژالے......'' وہ گڑبڑا کے دیکھنے لگی۔

''وہ دراصل میں نے ابھی اپنی ٹانگوں کا آپریشن کرایا ہے۔ میں زیادہ چل نہیں سکتی۔ میرے پاؤں میں درد اٹھنے لگتا ہے۔'' وانیہ نے بھی خود کو صاف بچا لیا اس کا پہلا تجربہ ہی کافی تھا۔

''تو یار! ہم کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ جائیں گے۔'' چہرے پر بے چارگی ہی بے چارگی تھی مگر عارفین کی دبی دبی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ!'' عارفین بھرپور مزے لے رہا تھا اس وقت ژالے کی بے چارگی کے مقسوم گھور کے رہ گئی تھی۔ عارفین کو حالانکہ اندر ہی اندر وہ خود بھی مسکرا رہی تھی مگر ژالے کی ناراضی کی وجہ سے چپ رہی تھی۔

''ژالے ابھی اور اسی وقت شاپنگ کی لسٹ تیار کرو جو تمہیں چاہیے سب لکھو ایک پیپر پر میں صرف تمہیں آدھا گھنٹہ دوں گا۔ جو آئے گا آج ہی آئے گا تمہیں میرے ساتھ جہاں چلنا ہے چلو، اس کے بعد تم مارکیٹ نہیں جاؤ گی۔'' زرمیل دوٹوک لب و لہجے میں کہتے ہوئے اٹھا تھا۔ جیب سے موبائل نکالا اور کسی کو فون ملاتا باہر نکل رہا تھا۔ شاپنگ پر جانا وہ بھی زرمیل کے ساتھ، ایک دو دفعہ وہ جا چکی تھی اس کے ساتھ۔

''جو شے تمہیں پسند آ رہی ہے گھنٹوں بحث کے چکر میں پڑ کے گنواؤ نہیں، خرید لو مجھے ٹائم ضائع کرنا پسند نہیں ہے۔'' بہت سال پہلے کا کہا گیا زرمیل کا یہ جملہ ابھی ابھی اس کے کان میں گونجا تھا۔

''زرمیل نے کہا ہے کہ اسے آدھے گھنٹے بعد باہر آنا ہے تو آنا ہے ورنہ وہ بنا لسٹ کے بھی اس کو لے جائے گا اور سب جانتے ہیں کہ جو زرمیل بول دے پتھر پر لکھی لکیر ہے۔'' وہ سب کو ایک نظر دیکھ کر رہ گئی مگر اس نے غصے و غم کی شدت سے مغلوب ہو کر صرف عارفین کو گھورا تھا جس کی ہنسی کو بریک ہی نہیں لگ رہا تھا۔

''یار! میری طرف مت دیکھو ان ظالم نظروں سے میں معصوم بچہ ہوں ڈر جاتا ہوں۔'' وہ ڈرنے کی ایکٹنگ کرنے لگا تھا۔

''اور تم دیکھ بھی رہی ہو کہ میرے بازو پر گولی لگی ہے میں بیمار ہوں، مقسوم بے چاری میری تیمارداری میں لگی ہوئی ہے۔'' وہ جان کر چٹکلے چھوڑ رہا تھا۔ مقسوم گھورے بنا نہیں رہ سکی۔

ژالے نے اپنے پیچھے سے کشن نکالا اور کھینچ کر عارفین کو مارا تھا۔

''مجھ سے بات بھی مت کیجیے گا۔'' نہایت جل بھن کر وہ پیر پٹختی ہوئی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی مگر پیچھے سے عارفین کا ایک اور جاندار قہقہہ ضرور اس کی جان جلا گیا تھا۔

''عارفین! بہت بدتمیز ہیں آپ، اتنا تنگ کرتے ہیں آپ ژالے کو۔ بچی اس بار آپ کی کوئی خلاصی نہیں ہوگی۔'' مقسوم نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا تھا۔

''ٹھہرو بھئی مجھے سانس لینے دو ژالے کے غم و غصے کی وجہ سے کب سے سانس روکے بیٹھی تھی۔'' رابعہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لو دیکھ لو۔'' عارفین نے مقسوم سے کہا۔ مقسوم رابعہ کو دیکھ کر ہنس دی۔

''امی! ژالے بہت غصے میں گئی ہوگی عارفین نے مزید اسے غصہ دلا دیا ہے۔''

''اگر تمہیں اتنی فکر ہے تو جاؤ تم چلی جاؤ ژالے کے ساتھ شاپنگ پر۔''

''خدا کو مانیے عارفین! میں نے آپ سے یہ کب کہا ہے کہ میں ژالے کے ساتھ شاپنگ پر جاؤں۔'' مقسوم اس طرح گڑبڑائی جیسے ابھی ژالے کہیں سے نکل کر آئے گی اور اس کا ہاتھ پکڑ کے لے جائے گی۔ عارفین اس کے گڑبڑانے پر ہنس دیا تھا۔

''خوب ہنس لو مگر یاد رکھنا ژالے تمہیں چھوڑنے والی نہیں ہے اس بار۔'' ثمرن نے اپنے بیٹے یوشع کو کیری کاٹ سے نکالا جو رونے لگا تھا۔ بیٹی عانیہ آسیہ کے پاس تھی۔

''دیکھیں گے۔'' عارفین نے بات ہوا میں اڑائی۔

''دیکھ لیجیے گا مگر میں ژالے کا ہی ساتھ دوں گی۔'' مقسوم کھڑی ہوگئی تھی۔

''ابھی تم ہی بڑی بڑی تقریریں کر رہی تھیں کہ میں عارفین کی تیمارداری کر رہی ہوں ان کا خیال رکھ رہی ہوں وغیرہ وغیرہ اب فوراً پارٹی بدل لی یعنی شوہر کی نافرمانی۔'' عارفین نے مقسوم کو مسکرا کے دیکھا مگر مقسوم نے کچھ نہیں کہا اور ایک پتپتی ہوئی نظر سے دیکھتی ہوئی چلی گئی کیوں کہ وہ سمجھ گئی تھی عارفین اس وقت فل موڈ میں ہے۔

''عارفین! تمہاری خیریت نہیں ہے آج مقسوم بھی چھوڑ کے چلی گئی اور میں بھی جا رہی ہوں۔'' ثمرن، یوشع کو لے کر نیچے آنے لگی تھی ژالے کے پاس۔

''یعنی میں اکیلا محاذ پر کھڑا ہوں۔''

''جی ہاں اور میں تو ویسے بھی ژالے کی بیسٹ فرینڈ ہوں۔''

''بیسٹ فرینڈ، بہت خوب تو ذرا اپنی دوستی نبھاؤ، جاؤ ژالے کے ساتھ شاپنگ پر۔'' عارفین نے حرا کو رگیدا۔

''ہاں تو......''

''تو......'' عارفین نے فوراً کہا حرا نے گھور کے دیکھا اسے۔

''صحیح کہتی ہے ژالے آپ ہیں ہی بدتمیز۔ اچھی بات ہے آپ کی کلاس لی جائے۔'' حرا تیزی سے وہاں سے نکلی۔

''کہاں جا رہی ہو رکو ابھی بلاتا ہوں۔ ژالے کو کہتا ہوں کہ حرا جانے کو تیار ہے تمہارے ساتھ۔'' حرا زور زور سے کوئی انگلش سونگ گاتی ہوئی باہر نکلی تھی، عارفین ہنس دیا تھا۔

''دیکھیں ذرا سب ژالے کے ساتھ ڈرتے ہیں شاپنگ پر جانے سے۔'' اس نے رابعہ سے کہا۔

''اگر تم صحیح ہوتے نا تو زبردستی میں تم کو ژالے کے ساتھ بھیجتی۔''

''امی تسلی تو کرلیجیے سب ڈرتے ہیں اس سے۔ مراد اس میں، میں بھی شامل ہوں۔''

''مگر تمہارے لیے اس سے اچھی سزا ہو ہی نہیں سکتی۔'' عارفین مسکرا دیا تھا۔

☆......☆

حسن آفریدی اوپر رابعہ کے پورشن میں آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خاکی کلر کا ایک لفافہ تھا گھر میں سب لوگ شادی کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ وہ بھی ابھی حنین آفریدی کے ساتھ شاپنگ مال سے آیا تھا۔ حنین آفریدی نے لاروش اغولان کے لیے بہت سی شاپنگ کی تھی۔ وہ تو گھر چلا گیا تھا۔ حسن آفریدی

یہاں آ گیا تھا۔ رابعہ مقسوم شاپنگ پر گئی ہوئی تھیں۔ وانیہ نے جانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ اپنے روم میں بیڈ پر نیم دراز کوئی میگزین پڑھ رہی تھی۔ جبھی دروازے پر دھیرے سے دستک ہوئی تھی۔ وانیہ نے دروازے کی طرف دیکھا اور میگزین ٹیبل پر رکھ کے دروازے کی سمت بڑھی تھی۔ دروازہ کھولا وہاں حسن آفریدی کھڑا تھا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔" اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"وہ عارفین بھائی تو گھر پر نہیں ہیں۔"

"میں نے آپ سے کب کہا کہ مجھے عارفین سے ملنا ہے۔" حسن آفریدی نے مسکراتے ہوئے اس کی جھجک سے حظ اٹھایا تھا۔ وہ خاموش رہی مگر اس کی آنکھوں اور چہرے پر سوالیہ نشان ضرور پڑھا جاسکتا تھا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کے لیے یہ لایا تھا۔" حسن آفریدی نے ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا تھا جس میں وہ خاکی لفافہ تھا۔

"یہ... یہ کیا...... ہے؟" وانیہ نے وہ خاکی لفافہ دیکھا اور اندر سے گھبرانے بھی لگی تھی۔

"میں ابھی مال سے آ رہا ہوں مجھے یہ سوٹ بہت پسند آیا تو میں نے آپ کے لیے لے لیا۔ مجھے خوشی ہو گی اگر آج کی کمبائن مایوں میں آپ یہ سوٹ پہنیں گی تو۔" وانیہ نے حسن آفریدی کی بلوریں آنکھوں میں دیکھا۔

"پلیز لے لیجیے اگر آپ نے میری خواہش کا احترام کیا تو میں سمجھ جاؤں گا کہ آپ کے دل میں میرے لیے کوئی سوفٹ کارنر ہے۔"

وانیہ شش و پنج میں پڑ گئی تھی اس کے پرسوچ چہرے کو حسن آفریدی نے بغور دیکھا تھا اور دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔

"وانیہ!" گھمبیر لہجے میں ہولے سے پکارا تھا۔

وانیہ نے نظر اٹھا کے دیکھا۔

"پلیز......!" حسن آفریدی کے لہجے میں ایسی التجا تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی جانے کیوں وانیہ نے ہاتھ بڑھا دیا۔

"تھینکس۔ آج رات میں آپ کی ہاں کا انتظار کروں گا۔"

اور پھر وہ رکا نہیں وانیہ کے چہرے پر ایک اپنائیت بھری نظر ڈالتا ہوا وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔ وانیہ نے جاتے ہوئے حسن آفریدی کو ایک نظر دیکھا پھر اس بند خاکی لفافے کو اور دروازہ بند کر کے بیڈ پر آ کر پھر سے بیٹھ گئی۔ کتنی ہی دیر تک اس نے اس بند خاکی لفافے کو دیکھا تھا۔ بالآخر بہت سوچنے کے بعد اس نے وہ خاکی لفافہ کھولا تھا جس میں سے نہایت ہی قیمتی خوب صورت سی بائل گرین اور میرون امتزاج کی نیٹ کی اٹھارہ کلیوں والی فراک نکلی تھی۔ جس پر بہت ہی نازک مگر مہنگا کام کیا گیا تھا جو بول رہا تھا کہ یہ فراک بہت ہی مہنگی ہے اس کا دوپٹہ تو زیادہ خوب صورت تھا پورے دوپٹے پر چوڑی سی ایپلک کے ساتھ کڑھائی ہوئی تھی۔ وانیہ نے پورا دوپٹہ کھولا تھا۔ بے شک حسن آفریدی کی چوائس لاجواب تھی اس کی سوچوں کا محور حسن

آفریدی ہی تھا وہ دلکشی سے مسکرانے لگی تھی مگر یہ مسکراہٹ تادیر اس کے ہونٹوں پر نہیں رہ سکی تھی۔ اس کے ذہن کی اسکرین پر ہی نہیں آنکھوں کی پتلیوں پر بھی ایک چہرہ پورے استحقاق و طمطراق کے ساتھ وارد ہوا تھا اور وہ چہرہ وہ عکس تھا آفریدی کا۔

"نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ غلط ہے مجھے سپنے دیکھنے کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ ہی حسن کو دھوکے میں رکھ کر اس کے ساتھ زیادتی کرنی ہے۔ یہ سراسر ناانصافی ہے اس کے ساتھ وہ میری پچھلی زندگی سے ناواقف ہے اور اگر اسے میری گزری پچھلی زندگی کے بارے میں پتا چل گیا تو وہ مجھ سے نفرت کرے گا نا صرف بلکہ اپنے بڑھتے قدموں کو بھی روک لے گا۔"

ان گلابی آنکھوں میں سے جانے کب دو موتی ٹوٹ کر حسن آفریدی کے دیے ہوئے سوٹ پر گرے اور اندر ہی جذب ہو گئے تھے۔ وانیہ نے اس سوٹ پر ایک افسردہ بھری نظر ڈالی تھی اور پھر اسے واپس تہ کر کے اسی خاکی لفافے میں قرینے سے ڈال دیا تھا۔

☆......☆

لاروش اغولان، حنین آفریدی کا بیڈروم سمیٹ رہی تھی۔

"پتا نہیں کیوں اتنا پھیلا دیتے ہیں یہ سب، ایسا لگتا ہے جیسے پوری رات اپنے کمرے کی ہر شے سے فائٹنگ کرتے ہیں۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی۔ حنین آفریدی نے پورے کمرے کو تہس نہس کیا ہوا تھا۔ وہ وارڈ روب میں کپڑے رکھنے لگی تھی کہ ایک شاپر اوپر کے خانے سے اس کے پیروں پر گرا تھا۔ لاروش اغولان نے وہ شاپر دیکھا۔ پھر ہاتھ میں تہ شدہ اس کے کپڑے خانے میں رکھ کے وہ شاپر اٹھانے کو جھکی شاپر کھولا اس میں سے ایک چھوٹی سی ٹاپ یلو کلر کی نکلی جس پر ریڈ کلر سے پریٹی لکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جینز کی بلیک ٹائٹس تھی۔ لاروش اغولان نے نہایت عجیب نظروں سے وہ ٹاپ اور ٹائٹس دیکھا تھا۔ اسی اثناء میں حنین آفریدی بھی بیڈروم میں آ گیا تھا۔ حنین آفریدی نے اس کے ہاتھ میں وہ ٹاپ اور ٹائٹس دیکھا تو اسے یاد آیا کہ وہ یہ سب زیدی کو پارٹی میں دینے کے لیے لایا تھا مگر حالات ایسے ہو گئے کہ یہ رکھا کا رکھا ہی رہ گیا۔

"کیسا لگ رہا ہے تمہیں یہ؟" حنین آفریدی کی مسکراتی آواز میں اسے چونکا دیا تھا۔

"کس کا ہے اور آپ کی الماری میں کیا کر رہا ہے؟" لاروش اغولان نے حق سے پوچھا تھا۔

"تمہیں لگ کیسا رہا ہے یہ بتاؤ۔"

لاروش اغولان نے کچھ نہیں کہا خاموشی سے وہ ٹاپ اور ٹائٹس تہ کر کے واپس شاپر میں ڈالنے لگی تھی کہ حنین آفریدی آگے بڑھا تھا۔

"ارے یار! کیا ہوا اچھا نہیں لگ رہا کیا دیکھو تو ذرا۔" حنین آفریدی نے اس کے ہاتھ سے شاپر لیا اور اس میں سے وہ یلو ٹاپ نکال کر اس پر لگایا۔

"دیکھو کتنی اچھی لگ رہی ہے اور آج کی پارٹی ویئر کے حساب سے یہ کلر بھی اچھا لگے گا۔"

"آپ کو لگتا ہے یہ اتنا واہیات سوٹ میں پہنوں گی؟" لاروش اغولان نے وہ ٹاپ سمیت اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔

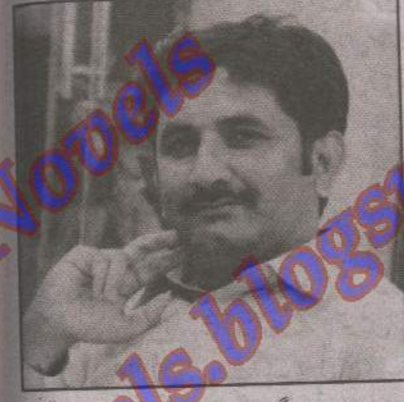
"واہیات کی کیا بات ہے لڑکیاں پہنتی ہیں ایسے سوٹ۔"

(جاری ہے)

ملاقات

ایف ایم 95 پنجاب رنگ کے پریزنٹر

R.J عامر حیات



ایف ایم 95 پنجاب رنگ اور ایف ایم 106-6 کے معروف آر جے عامر حیات جب آن ایئر ہوتے ہیں تو ان کا اپنا منفرد انداز ہوتا ہے۔ جو لسنرز بہت پسند کرتے ہیں ان کے شوز کے انتظار میں ہوتے ہیں۔

عامر حیات سے کیا گیا ایک انٹرویو قارئین ردا کے لیے پیش خدمت ہے۔

☆السلام علیکم جی عامر حیات کیسے ہیں آپ؟

☆وعلیکم السلام بالکل خیریت سے ہوں۔

آپ کا پورا نام کیا ہے؟

☆عامر حیات۔

تاریخ پیدائش۔

☆12 مئی 1988ء۔

آپ کا اسٹار کیا ہے اور اسٹارز پر یقین رکھتے ہیں؟

☆Twrus ہے اور اسٹار پر کم یقین رکھتا ہوں۔

ایف ایم کی فیلڈ میں کیسے آنا ہوا؟

☆شروع سے ہی ریڈیو اور ٹی وی چینلز پر کام کرنے کا شوق تھا۔ اس شوق کی وجہ سے ایف ایم کی فیلڈ میں آ گیا۔

ایف ایم پر کس نے متعارف کروایا؟

☆ایف ایم پر بہت پیار کرنے والے میرے ماموں لیاقت علی اور ان کے بڑے اچھے دوست شاہین بھٹی صاحب نے متعارف کروایا۔

پہلا پروگرام کہاں سے کیا؟

☆پہلا پروگرام ایف ایم 95 کے معروف آر جے ممتاز ملک کے ساتھ کیا۔

پہلا پروگرام کیا تو کیا کیفیت تھی؟

☆پہلا پروگرام جب کیا تو بہت کنفیوژ تھا اور ڈر لگ رہا تھا کوئی غلط بات نہ کر دوں۔ کیونکہ پہلی دفعہ میری آواز آن ایئر جا رہی تھی۔

☆آج کل کون سے شوز کر رہے ہیں؟

آج کل ایف ایم 95 پنجاب رنگ لاہور سے پروگرام "گلاں دل دیاں" اور بوم ایف ایم 106.6 سے Bombastic Moring کے نام سے شو کر رہا ہوں۔

☆کون سا پروگرام وجہ شہرت بنا؟

ایف ایم 95 پنجاب رنگ سے مارننگ شو کرتا رہا جو کہ وجہ شہرت بنا۔

☆اپنے شوز میں کس موضوع پر زیادہ بات کرتے ہیں؟

میں اپنے شو میں کبھی بھی ایک ٹاپک پر بات نہیں کرتا۔ کوشش کرتا ہوں کہ ہر دفعہ ایک نئے ٹاپک پر بات کروں تاکہ لوگوں تک کوئی نئی اور اچھی بات پہنچا سکوں۔

☆ایف ایم کا کامیاب ترین پروگرام کون سا تھا؟

ایف ایم 95 پر پروگرام "گلاں دل دیاں" کامیاب ترین پروگرام تھا۔

☆کبھی ایسا ہوا کہ پروگرام کرنے کو دل نہ چاہ رہا ہو لیکن پروگرام کیا ہو؟

جی ہاں! بہت دفعہ ایسا ہوا کہ پروگرام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا ہوتا لیکن پروگرام کیا ہے۔

☆لسنرز کی طرف سے آپ کے پروگرام کا کیا فیڈ بیک ملتا ہے؟

لسنرز کی طرف سے بہت زیادہ فیڈ بیک ملتا ہے اور بہت سے لوگ بہت محبت سے اور چاہت سے میرا پروگرام سنتے ہیں۔ جب لسنرز کی کالز اور میسج ملتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ اتنے سارے لوگ میرے شو میں ہیں اور میرے ساتھ ہیں اور پسند کر رہے ہیں۔

☆کیا شادی شدہ ہیں؟

غیر شادی شدہ ہوں۔

☆تقدیر یا قسمت کس چیز پر بھروسا کرتے ہیں؟

قسمت پر بھروسا رکھتا ہوں۔

☆آپ کے نزدیک غم کیا ہے؟

خوشی کے ساتھ ساتھ غم بھی زندگی کا حصہ ہیں غم نہ چاہتے ہوئے بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں غم اپنوں سے دوری کا احساس۔

☆عام بولنے اور ایف ایم پر بولنے میں کیا فرق ہے؟

عام بولنے اور ایف ایم پر بولنے میں بہت زیادہ فرق ہے۔ گھر یا دوستوں کے ساتھ آپ جس طرح چاہیں بول سکتے ہیں لیکن ایف ایم پر ایک مخصوص انداز اور اخلاقیات کے دائرے میں رہ کر اچھی بات دوسروں تک پہنچانی ہوتی ہے اور ایسے کہ دوسرے اچھے طریقے سے سمجھ سکیں۔

☆ایف ایم کے علاوہ آپ کی مصروفیات کیا ہیں؟

ایک نیوز چینل میں جاب کر رہا ہوں اور زیادہ جاب میں ہی مصروف رہتا ہوں۔

☆کھانے میں کیا شوق سے کھاتے ہیں؟

کھانے میں بریانی شوق سے کھاتا ہوں۔

☆پسندیدہ خوشبو؟

خوشبو ہر قسم کی پسند کرتا ہوں چاہے وہ پھولوں کی ہو یا پرفیوم کی۔ گلاب کی خوشبو زیادہ پسند کرتا ہوں۔

☆کس ساتھی پریزینٹر کے ساتھ شو کرنے میں مزہ آتا ہے؟

جو میری طرح ہلکے ہلکے انداز میں بات کرے اور ہنسی مذاق کا ماحول رہے۔

☆آپ کے خیال میں ایک آر جے دوسرے کی نقل کر رہا ہے؟

ایک آر جے دوسرے کی نقل کر سکتا ہے لیکن نقل کرنے والے انسان کی ہمیشہ اپنی کوئی پہچان نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے نام سے ہی پہچانا جاتا ہے۔

☆ایک اچھے اور معیاری پروگرام میں آر جے کا کتنا ہاتھ ہوتا ہے؟

ایک اچھے اور معیاری پروگرام میں ایک آر جے کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔ وہی لوگوں کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھتے ہوئے پروگرام کو بہتر کر سکتا ہے۔

☆دوستوں کو ایس ایم ایس کرنا اچھا لگتا ہے کہ فون کرنا؟

دوستوں کو ایس ایم ایس کرنا اچھا لگتا ہے لیکن جہاں کال کی ضرورت ہوتی ہے وہاں کال بھی

ضرور کرتا ہوں۔
☆ کیا گفٹ کا تبادلہ پسند ہے؟
❀ گفٹ دینا اچھا لگتا ہے لیکن کسی اپنے دوست عزیز یا فیملی میں سے اگر کوئی گفٹ ملے تو زیادہ خوشی ہوتی ہے۔
☆ آپ سالگرہ مناتے ہیں؟
❀ دوستوں کی فرمائش پر سالگرہ مناتا ہوں۔
☆ تنہائی میں کیا سوچتے ہیں؟
❀ گزرے ہوئے اچھے لمحات اور دوستوں کی اچھائیوں کو یاد کرتا ہوں۔
☆ کسی کے خلوص کا کیسا جواب دیتے ہیں؟
❀ خلوص سے پیش آنے والے لوگوں کی بہت قدر کرتا ہوں۔
☆ وہ لمحہ جس نے زندگی میں قوس قزاح کے رنگ بکھیر دیے؟
❀ وہ لمحہ جس نے زندگی میں قوس قزح کے رنگ بکھر دیے جب میں اپنی فیملی کے ساتھ عمرے پر گیا اور وہاں جاکر اللہ پاک کے گھر کی زیارت نصیب ہوئی مجھے لگا وہ لمحہ میری زندگی کا اہم ترین لمحہ تھا۔
☆ جو ریڈیو ایف ایم کی فیلڈ میں آنا چاہتے ہیں وہ کیا کریں؟
❀ جو لوگ اس فیلڈ میں آنا چاہتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ اپنی بول چال پر توجہ دیں اپنی تعلیم کے ساتھ جنرل نالج پر توجہ دیں۔
☆ آپ کو کیا اچھا لگتا ہے دن یا رات؟
❀ دن رات دونوں اچھے لگتے ہیں چاندنی راتیں بہت پسند ہیں۔
☆ کیسے لوگ پسند ہیں؟
❀ جو دل اور زبان کے سچے ہوں۔
☆ مزاج کیسا ہے؟
❀ ہنسی مذاق والا مزاج رکھتا ہوں جلد فرینک ہو جاتا ہوں۔
☆ بارش برستی ہے تو کیسا لگتا ہے؟
❀ بارش سے دلی سکون ملتا ہے۔
☆ غصہ آئے تو کیا کرتے ہیں؟
❀ کچھ نہیں کہتا۔ چپ ہوجاتا ہوں اور سوجاتا ہوں۔
☆ دوستی کے بارے میں آپ کا نظریہ؟
❀ دوستی ایک پاکیزہ رشتہ ہے دوستوں کی قدر کرنے والے کبھی تنہا نہیں رہا کرتے۔ دوستوں کی باتوں کا غصہ نہیں کرنا چاہیے دوستوں کی باتوں کو نظر انداز کرنے سے دوستی مضبوط ہوتی ہے۔
☆ کیا موسیقی پسند ہے کیسی موسیقی سنتے ہیں؟
❀ موسیقی شوق سے سنتا ہوں لیکن ماحول کے مطابق رات میں اکثر غزلیں سنتا ہوں اس کے علاوہ پاپ میوزک بھی۔
☆ آپ حقیقت پسند ہیں یا خوابوں میں رہتے ہیں؟
❀ حقیقت کی دنیا میں رہنا پسند کرتا ہوں۔
☆ آپ فضول خرچ ہیں یا کنجوس؟
❀ فضول خرچ ہوں۔
☆ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ آر جے بننے کے لیے سفارش کا ہونا ضروری ہے؟
❀ آر جے بننے کے لیے سفارش ضروری ہے۔ انسان کی اپنی قابلیت اسے عروج پر پہنچاتی ہے۔
☆ آپ کو اپنی کون سی عادت پسند ہے؟
❀ دل کی بات دل میں نہیں رکھتا چاہے بات کسی کو بری لگے یا اچھی بات منہ پر کردیتا ہوں۔
☆ دل پسند منظر؟
❀ آسمان پر نیلے بادل ہوں۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہو یہ مجھے بہت پسند ہے اور یہی میرا دل پسند منظر ہے۔
☆ فرصت کے لمحات کیسے گزارتے ہیں؟
❀ دوستوں کے ساتھ گزارتا ہوں اور فیملی کے ساتھ بھی۔
☆ آپ کی کامیابی کا راز؟
❀ اساتذہ کی محنت اور والدین کی دعائیں۔
☆ پسندیدہ گلوکارہ یا گلوکار؟
❀ لوک گلوکار اچھے لگتے ہیں۔ غزلیں زیادہ سنتا ہوں۔ نصرت فتح علی خان، عطاء اللہ خان، نور جہاں، لتا منگیشکر، ندیم عباس پسند ہیں۔
☆ پسندیدہ موسم؟
❀ سردیوں کا موسم پسند ہے۔
☆ آپ کے نزدیک زندگی کیا ہے؟
❀ زندگی اللہ پاک کی طرف سے دی ہوئی ایک نعمت ہے اپنی خوشی سے زیادہ اگر دوسروں کی خوشی کا خیال رکھیں تو میرے خیال میں یہی اصل زندگی ہے۔
☆ ایف ایم کے معیار سے مطمئن ہیں؟
❀ جی مطمئن ہوں۔
☆ کن لوگوں پر رشک آتا ہے؟
❀ جو لوگ اپنی پریشانی چھوڑ کر دوسروں کے دکھ میں شریک ہوتے ہیں۔
☆ کیا پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتے ہیں؟
❀ میں پہلی نظر کی محبت پر یقین نہیں رکھتا۔
☆ کوئی ایسی عادت جو آپ کے دوستوں اور گھر والوں کو سخت ناپسند ہے۔
❀ جاب کی وجہ سے دوستوں اور گھر والوں کو ٹائم نہیں دے پاتا۔ جس کی وجہ سے مجھ سے شکوہ رہتا ہے کہ ٹائم نہیں دیتے یہ برا لگتا ہے گھر والوں کو۔
☆ کس جذبے کی قدر کرتے ہیں؟
❀ سچے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔
☆ شدید اداسی میں کیا کرتے ہیں؟
❀ غمگین گانے سنتا ہوں۔
☆ کیا آج کے دور میں سچی محبت موجود ہے؟
❀ آج کے دور میں سچی محبت موجود ہے بس سچے جذبے ہونے چاہئیں۔
☆ اپنی کوئی خوبی؟
❀ کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتا۔
☆ کوئی خامی؟
❀ کھانا وقت پر نہیں کھاتا۔
☆ ایف ایم چینلز کے بارے میں کیا رائے ہے؟
❀ ایف ایم پر جتنے بھی چینلز ہوں کم ہیں کیوں کہ ایف ایم پر آر جے پروگرام پیش کرتے ہیں جو ہزاروں لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ لاتے ہیں۔
☆ دن کا کون سا وقت اچھا لگتا ہے؟
❀ ڈھلتا سورج اور اس کے بعد کا ٹائم بہت پسند ہے۔
☆ کیا راستے کی دشواریاں کامیابی کی دلیل ہیں؟
❀ کوئی بھی کامیاب انسان ایسے کامیاب نہیں ہوا ہر کامیاب انسان کو بہت زیادہ دشواریاں برداشت کرکے ہی کامیابی نصیب ہوتی ہے۔
☆ ردا ڈائجسٹ کے بارے میں آپ کی رائے؟
❀ ڈائجسٹ بہت سے لوگ پڑھتے ہیں میرے خیال میں فارغ وقت میں یہ ایک اچھی عادت ہے۔ ردا ڈائجسٹ ایک اچھا نام ہے اس کا معیار بہت بہتر ہے۔
☆ قارئین اور لسنرز کے نام پیغام؟
❀ آپ کا اور ہمارا آواز کا رشتہ ہے اس کو ایسے نبھائیں کہ ہمیشہ دوسروں کو اس سے خوشی ہو۔
☆ آپ کا بہت شکریہ، آپ نے کچھ ٹائم قارئین ردا کو دیا۔
آپ کا بھی بہت شکریہ میں ردا کی ترقی کے لیے دعاگو ہوں۔

......☆......

ردا کی ڈائری

فریدہ فرید کی ڈائری سے

بقاء امرہوی کی غزل

مدحتِ اہلِ بیت کا یہ صلہ ہے
ہم کو ملا ہے جو کچھ درِ زہرہؓ سے ملا ہے
کوئی اور وسیلہ کام نہ آیا بروزِ حشر
بنام حضرت زہرہؓ ہر ایک عذاب ٹلا ہے
اپنا ایمان ہے کہ سرورِ کائناتؐ کے حضور
پہنچا ہے اسی در سے ہو کر جو بھی چلا ہے
بگڑے ہوئے بن گئے سب کام عاصی کے
ہر زخم ہوا مندمل ہر چاک سِلا ہے
درِ زہرہؓ وہ در ہے کہ جس کی ہے شان
بقاء پھر نہ ہوا بند جس پر بھی اک بار کھلا ہے

گیتی آراء کی ڈائری سے

علامہ اقبال کی غزل

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو شاید
تیری آنکھ مستی میں ہوشیار کیا تھی
تأمل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی
کھنچے خود بخود جانبِ طور موسیٰ
کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

سفینہ جمشید کی ڈائری سے

سیدہ ثمینہ شاہین کی نظم

تربت لہورنگ ہوا
ایک بار پھر لاشیں گریں
پھر زمیں لہو رنگ ہوئی
پھر ایک بار کہرام مچ گیا
یہ لاشیں ان کی ہیں جن کا قصور
جن کا گناہ بس صرف اتنا تھا کہ وہ غریب تھے
جن کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ دو وقت کے لقمے کمانے
چند روپوں کے حصول کے لیے
گھروں کو چھوڑ کر
پردیسی بنے ہوئے تھے
نجانے کس کی گولیوں کا نشانہ بن گئے
ایک بار پھر کئی گھر اجڑ گئے
سنا ہے ایک مقتول کے ہاتھوں پر
شادی کی مہندی لگی تھی
مہندی کے رنگ پر اب
لہو کا رنگ غالب آ گیا
آہ
کتنا سناٹا چھا گیا
یہ بھی سنا ہے کہ اک مقتول نے کچھ دن بعد
دولہا بننا تھا
آہ
سارے ارمان ٹوٹ گئے ایک بار پھر بے گناہ
لوگوں کی سسکیاں سنائی دیں
تربت لہورنگ ہوا اور
ایک بار پھر میری دھرتی رو اٹھی
غربت کے ماروں کے خون میں لتھڑے وجود
دیکھ کر
ایک بار پھر کہرام مچ گیا
اور ایک بار پھر دل میں یہ سوال اٹھا
کہ
یہ خون خرابہ کیوں اور
آخر کب تک

ریما نور کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی نظم

میں تیری ذات کا حصہ ہوں
میں تیری سوچ میں شامل ہوں
میں تیری یاد کا محور ہوں
میں تیری سانس کا جھونکا ہوں
جذبے کا کوئی نام نہیں
بس
تو میرا نام نہ پوچھا کر

شاء کنول اللہ دتہ کی ڈائری سے

ابن انشاء کی نظم

دل کا تمہارے جو صفحہ ہے
وہ آج جو بالکل سادہ ہے
اس پر بھی تو لکھا تھا ہم نے
اک نام کبھی
اک پیغام کبھی
اشعار کبھی
سرکار کبھی
وہ صفحہ تم نے دھو ڈالا
وہ صفحہ بالکل خالی ہے
اب کاغذ کے اس صفحے کو
کیوں آگے لا کے رکھتے ہو
کیوں نام پیغام، اشعار لکھیں
ہم لوگ تو جو سرکار لکھیں
اک بار لکھیں

رابعہ افضال خان کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی ایک پیاری نظم

بارہا ہم نے اس کو آزما کے دیکھا ہے
بارہا وفا کا گیت ہم نے گا کے دیکھا ہے
بارہا اس کوچے میں دل جلانے پہنچے ہیں
بارہا ہم حال دل اس کو سنانے پہنچے ہیں
لیکن وہ جو لڑکی ہے
نین جھرنکوں کی اور سے
چوری چوری ہم کو تکتی ہے
اور پھر ہم پہ ہنستی ہے
یہ جو گیت محبت کا تم روز سناتے ہو
یہ جو ہر روز گلی میں میری چلے آتے ہو
کیسے تم سمجھو گے کیسے تم جانو گے
تیری دستک پہ جو کھل جائے یہ وہ در نہیں ہے
تو جہاں آن بسے میرا دل وہ گھر نہیں ہے
تم اپنے دل کو لے جاؤ
کسی اور پہ وار ڈالو تم
ورنہ دل تو دل ہی ہے
اس کو مار ڈالو تم

☆......

اشعار

سباس گل..........رحیم یار خان
ابھی تو زخم بھی چاہتوں کے تازہ ہیں
ابھی سے سوجھی ہے پھر تم کو مسکرانے کی

ریمانور..........کراچی
ہاں میں نے تجھے چاہا انکار نہیں مجھ کو
یہ جرم تو ثابت ہے کیا اس کی صفائی دوں

ریحل آرزو..........اوکاڑہ
آشوبِ چشم کی تریاق تیری دید
تیری صورت، صورتِ علاج ہے جاناں

سدرہ شاہین..........خانیوال
افسانہ غم دل پر کتاب لکھوں گی
تمہارے نام اس کا انتساب لکھوں گی
کسی کے دکھ سے ہے شاہین بجی حیات میری
تو کیوں نہ کانٹوں کو پھر سے گلاب لکھوں گی؟

فریدہ فرید..........پاکپتن شریف
کتنی بہاریں آئیں ٹھہریں چلی بھی گئیں
کھلا نہ کوئی پھول میرے آنگن میں اب کے برس بھی
چاند عید کا اب کے بھی ہم نے تنہا دیکھا
ہوئی نہ کوئی دعا قبول اب کے برس بھی

صبا عبدالغنی..........کراچی
جب بھی ہم اس دنیا سے جائیں گے
اتنی خوشیاں اور اپنا پن دے جائیں گے
جب بھی یاد کرو گے ہمیں
ہنستی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئیں گے

عابد محمود..........ملکہ ہانس
سکوت لب پر آنکھوں میں انتظار ہے
ہر اک شام تری آرزو رہی مجھ کو

سیما ناصر..........ڈی آئی خان
اس غم زدہ سے پوچھو وقت سحر کی قیمت
جلتا ہے جس کا خون چراغوں میں رات بھر

ساجدہ جمشید..........ڈی آئی خان
ہاتھ آیا نہ کچھ رات کی دلدل کے سوا
ہائے کس موڑ پر خوابوں کے پرستار گرے

اسماء جمشید..........ڈی آئی خان
چہرہ بتا رہا تھا مارا ہے بھوک نے
لوگ کہہ رہے ہیں کچھ کھا کے مر گیا

عائشہ سجاد..........ڈی آئی خان
اسے کہنا صدا موسم بہاروں کے نہیں رہتے
پتے جب بھی گرتے ہیں جب ہوائیں رخ بدلتی ہیں

ثناء سجاد..........ڈی آئی خان
باہر گلی میں ہلچل سی مچ گئی وصی
بارش کے بعد چھت سے جو اس نے جھاڑی زلفیں

ثمینہ سلیم..........کراچی
اِک میٹھا درد بھی دل میں کبھی پیدا ہو
کیا اکیلے میں کسی دن آپ نے سوچا ہمیں
تو سمندر ہے ہماری پیاس کی کچھ لاج رکھ
یوں نہ اک دو گھونٹ پانی کے لیے ترسا ہمیں

......☆......

اس ماہ میں

ایک سفر ردا افشاں علی کے ساتھ

السلام علیکم! پیاری پیاری قارئین! آج آپ کو مابدولت یعنی افشاں علی ایک سفر پر لے کر جائیں گی تو آئیے جناب اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔

"ردا نامی یہ ملک بہت کم ہی عرصے میں آسمان ادب کا ایک درخشاں ستارہ بن کر چمکا ہے۔ اس کی دن دگنی رات چوگنی ترقی سے ہر کوئی واقف ہی ہے۔ تو مابدولت اور آپ سب کی جانی پہچانی افشاں علی نے سوچا اپنے قلم سے اس خوب صورت سے ملک کی شان میں کچھ الفاظ تحریر کیے جائیں۔ ردا کے ملک کا داخلی دروازہ "گوشہ آگہی" ہے۔ جس سے گزرے بغیر ہم ملک کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتے جیسے ہی ہم یہ دروازہ کراس کرتے ہیں "ردائے جنت" نامی لائبریری ہماری منتظر ہوتی ہے۔ جہاں ہر مسافر کو اچھی اچھی باتیں سیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہاں ہم نئے نئے لوگوں سے ملاقات بھی کرتے ہیں اس ردا ملک کی ملکہ خاص صالحہ محمود ہیں یہاں کے محل ردا کی شہزادیوں میں پرستان سے ہر بار نئی نئی پریاں ملنے آتی ہیں۔ ردا ملک کے چار صوبے ہیں۔ مکمل ناول، سلسلے وار ناول، افسانہ اور ناولٹ۔ اس ملک میں بہت ہی خوب صورت اور ترقی یافتہ شہر آباد ہیں جیسے اشعار، خوشبو اس ماہ میں، ردا کی ڈائری، سنگھار، دوستوں کے نام پیغام، خالص سیاحوں کا شہر ہے۔ جہاں آپ اپنے چاہنے والوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ اس ملک میں کچن نامی ریسٹورنٹ بھی ہے جہاں ہر طرح کے پکوان ملتے ہیں۔ الغرض اس خوب صورت سے ملک کی جتنی تعریف ہو کم ہے۔ یقین نہیں تو آپ خود جا کر سیر کر آئیں جہاں قدم قدم پر خلوص پیار کے ساتھ ویلکم کے بورڈ آویزاں ہیں۔ اس ملک کو اور اس سیاح کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا اور ضرور بتائیے گا یہ سفر کیسا رہا؟

افشاں علی۔ کراچی

اس ماہ کی محبت

ہر انسان اپنی زندگی میں ایک بار ضرور اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ خدا کے سوا کسی انسان کے آگے جھک جاتا ہے۔ اس کے لیے اپنے سجدے قضا کرتا ہے اور اس کے لیے وقت پر سجدے کرتا ہے۔ دعائیں مانگتا ہے اور خدا سے شکوے کرتا ہے۔ اس کی دی ہوئی نعمتوں کو بوجھ سمجھتا ہے صرف ایک انسان کی خاطر اور یہ سب کرنے کی وجہ ہوتی ہے "محبت"......صرف محبت!

راجکماری سارہ احسان۔ بہاولپور

اس ماہ کا ڈائٹ پلان

ڈائٹ پلان کو چن کر قائم ایسی رہتی ہیں
اپنی بھوک پیاس کو شام تک وہ سہتی ہیں
ڈائٹنگ کے اوقات مقرر 9 تو 5 رہتی ہیں

ڈنر کے ٹائم پر لیکن آف ڈیوٹی رہتی ہیں
ان کی فگر پہ دھی کترینہ کرینہ رہتی ہیں
شوقیہ ایکسٹرا لارج کپڑے پہنے رہتی ہیں
شام ڈھلے جب میاں آئے، تو وہ کہتی ہیں
فرق پڑا ہے مجھ پہ سکھیاں میری کہتی ہیں
ڈائٹنگ کی خوشی میں ٹریس باقی رہتی ہیں
اک ڈنر اور بیٹھے کی متلاشی سی رہتی ہیں
اتنی ڈائٹنگ کے بعد اب تھوڑا جی لیتی ہیں
بس ڈبل چیز کا برگر، پیزا [illegible] لیتی ہیں

ثمینہ فاطمہ۔ کراچی

اس ماہ کا مزاحیہ قطعہ

قلم دو چار ایسے ہی لگا لیتا ہوں جیبوں میں
مرے احباب میں اس سے میری توقیر بڑھتی ہے
کبھی لکھنے لکھانے کی نوبت ہی نہیں آتی
میں ناڑا ڈال لیتا ہوں ضرورت جب بھی پڑتی ہے

ریما نور رضوان۔ کراچی

اس ماہ امید کی کرن

زندگی کتنی مشکل ہے؟ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے چپکے چپکے، دھیرے دھیرے کوئی اندھیرا سا نگل رہا ہے۔ کچھ خالی پن ہے، کچھ ادھورا ادھورا سا ہے کیا زندگی یونہی گزر جائے گی؟ تپتے صحرا میں کھڑے اس وجود نے اِدھر اُدھر سائبان کی تلاش میں نظر دوڑاتے ہوئے زیرِ لب کہا اور مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک درد تھا جس نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ بے بسی سے سوچنے لگا کہ بارش تو ریگستانوں میں برسوں بعد آتی ہے تو کیا وہ یونہی ان بیابان ریت کے ٹیلوں میں زندگی کی بازی ہار جائے گا۔ خوف اور وحشت نے اس کو مزید چلنے سے روک دیا۔ اس کے زخموں سے خون رسنے لگا اور اس کی آنکھیں اذیت سے تڑپ اٹھیں اور وہ درد سے زار و قطار رونے لگا۔ اتنے میں ٹھنڈک کا ایک احساس جاگا امید کا جگنو چمکا اور اس کی روشنی کی کرن نے اس کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور بارش کا ایک قطرہ اس کے ماتھے کو چھوتا ہوا اس کے دل پر آ گرا جس نے نرمی سے اس کے آنسوؤں کو دھو ڈالا اور آنکھوں میں امید کا دیا جلا دیا اور دل میں آرزوؤں کا شہر بسا دیا۔ پھر اس کے وجود نے اذیت بھرے لمحات کا تصور دل سے نوچ ڈالا۔ اب اسے اپنے جلتے پاؤں اور ان سے رسنے والے خون کی پرواہ نہ تھی بس وہ امید اور یقین کی ڈور اپنے ہاتھ میں تھامے اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گیا۔

حریم فاطمہ۔ جھنگ

اس ماہ جواب دیں......!

☆ خشک سالی زیادہ خطرناک ہے یا صرف سالی؟
☆ بیوی کی ڈانٹ زیادہ زوردار ہوتی ہے یا ساس کی؟
☆ شوہر کی زندگی پہلے ختم ہوتی یا بیوی کی فرمائشیں؟
☆ عورت کے آنسو مرد کو جلدی گھائل کرتے ہیں یا اس کی مسکراہٹ؟
☆ عورتیں دکھاوے کے لیے روتی ہیں یا دکھاوا انہیں رلاتا ہے؟
☆ لڑکیاں ایک دوسرے سے زیادہ حسد کرتی ہیں یا عورتیں؟
☆ آج کل برقع پردے کے لیے پہنا جاتا ہے یا چہرے کے عیب چھپانے کے لیے؟
☆ ماں کی دعا جنت کی ہوا کھلاتی ہے تو ساس کی دعا کیا کھلائے گی؟
☆ محبوبہ کو دیکھنے سے دل کی دھڑکن زیادہ تیز ہوتی ہے یا محبوبہ کے ہٹے کٹے بھائی کو دیکھنے سے؟
☆ میاں بیوی گاڑی کے دو ایسے پہیے ہیں جس میں ایک بھی خراب ہو جائے تو زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی، اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں تو کیا اسے رکشہ کہا جا سکتا ہے؟
☆ برف زیادہ ٹھنڈی ہوتی ہے یا برف کا پانی؟
☆ اگر پچاس کلو آٹا مفت مل جائے تو آدھا کس کو گفٹ کیا جائے، بھائی کو، سالے کو یا پولیس والے کو؟
☆ پولیس ڈیوٹی پر موجود ہونے کے باوجود نظر کیوں نہیں آتی؟
☆ ڈاکو، حکمران لٹیروں اور پولیس میں کیا فرق ہے؟

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اس ماہ کی مزاحیہ غزل

عشق کے میدان میں دوڑے تو نہیں تھے
کبھی گدھے ہو پہلے بھی گھوڑے تو نہیں تھے
آج بھی لیٹ آئے ہو اور کان بھی ہیں لال
بیگم نے رات کو کان مروڑے تو نہیں تھے
شکایت کیوں کی اپنے باپ سے جا کر
پکڑے تھے ہاتھ تیرے توڑے تو نہیں تھے
کل شام مجھے دیکھ کر تم بھاگے کیوں اس طرح
سا گر میرے ہاتھ میں کوڑے تو نہیں تھے

ریما نور رضوان۔ کراچی

اس ماہ کا قطعہ

[illegible] میں دردِ شدید رہتا ہے
بن کے ایک نوید رہتا ہے
کام کوئی ڈھنگ سے کر نہ پائیں ہم
اس قدر یہ شدید رہتا ہے

سباس گل۔ رحیم یار خان

اس ماہ میں

محبتوں کی منزل

کچھ لوگ ندی کے دو کناروں جیسے ہوتے ہیں سدا ساتھ ساتھ چلنے والے ایک جگہ سے چل کر ایک ہی مقام پر ختم ہونے والے لیکن وہ ساتھ ساتھ چلتے رہنے کے باوجود کبھی مل نہیں پاتے۔ وہ ایک لمحہ جسے پُل بنا ہوتا ہے۔ وہ ان کے درمیان کبھی آتا ہی نہیں ندیاں جب دریاؤں پہاڑوں سے نکلتی ہیں تو بڑی پرشور ہوتی ہیں لیکن آخر میں ایک چھوٹا سا کھائی رہ جاتی ہیں اس طرح محبتیں بھی آغاز میں بڑی تیز بڑی پیاری ہوتی ہیں یہ آخر میں دو انسانوں کی زندگیاں ختم کر دیتی ہیں اور محبت کرنے والوں کے درمیان صرف مجبوریوں کا پانی ہوتا ہے جو ان دو کناروں کی طرح کبھی ملنے نہیں دیتا۔ کوئی کوئی خواب کبھی پورے نہیں ہوتے۔ کچھ محبتیں سدا ادھوری رہتی ہیں۔ کچھ لوگ کبھی مل نہیں پاتے، کچھ آرزوئیں کبھی پوری نہیں ہوتی۔ کچھ حالات کبھی ہمارے حق میں نہیں ہوتے کچھ مطالبے کبھی مانے نہیں جا سکتے اور کچھ راستوں کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔

عابد محمود۔ ملکہ ہانس

اس ماہ کی غزل

اپنے لبوں کو دشمنِ اظہار مت بنا
سچے ہیں جو لوگ انہیں گناہ گار مت بنا
جتنے بھی لفظ ہیں وہ مہکتے گلاب ہیں
لہجے کے فرق سے انہیں تلوار مت بنا
الزام کچھ تو گردشِ ایام کو بھی دے
اپنے ہر ایک غم کو غمِ یار مت بنا
ہر ایک کے لیے کھلا مت رکھ اسے فراز
یہ دل ایک گھر ہے اسے بازار مت بنا

شاعر: احمد فراز
سفینہ جمشید۔ ڈی آئی خان

☆......

خوشبو

حضورؐ نے فرمایا

’’سیدنا نا جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ قبروں کو پختہ کریں اور اس بات سے کہ ان پر بیٹھیں اور اس سے کہ ان پر گنبد (یا عمارت) بنائیں۔‘‘ (مسلم)

فرمان رسولؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’قابل رشک دو ہی آدمی ہو سکتے ہیں، ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی دولت عطا فرمائی اور وہ شب و روز اس پر عمل کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا اور وہ شب و روز اس کے حکم کے مطابق اس مال کو خرچ کرتا رہتا ہے۔‘‘ (صحیح مسلم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں، رسول کریمؐ مسجد میں بیٹھے تھے کہ قبیلے مزینہ کی ایک عورت زینت والا لباس پہنے اتراتی ہوئی مسجد میں آئی، نبی کریمؐ نے فرمایا:

’’لوگو! اپنی عورتوں کو زینت والا لباس پہننے اور تفاخر والی چال چلنے سے منع کرو۔ بنی اسرائیل پر اسی وقت لعنت کی گئی تھی جب ان کی عورتوں نے زینت والا لباس پہنا اور مسجدوں میں فخر سے چلنے لگیں‘‘۔ (سنن ابن ماجہ)

سیدہ نورین۔ کراچی

بڑی رحمت

انسان کی دیرینہ خواہشات میں سے ایک خواہش یہ بھی ہے کہ وہ کسی طرح اپنے مستقبل میں جھانک کر دیکھے اور یہ معلوم کر سکے کہ آنے والا کل کیسا ہوگا؟ اس کی عمر کتنی ہوگی؟ وہ آگے چل کر غم دیکھے گا یا خوشیاں؟ حادثے اور سانحے کب اور کہاں پیش آئیں گے اور شادمانی کے اسباب کیا کیا میسر ہوں گے؟

مگر یہ تو سوچیے کہ اگر خالق کائنات انسان کو یہ سب کچھ پیشگی بتا دیتا تو زندگی اس کے لیے موت سے بدتر ہو جاتی۔ آنے والے غموں کے تصور میں اس کی موجودہ خوشیاں بھی زہر کا پیالہ بن جاتیں۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ زندگی کے کس مرحلے میں اس کے کون کون سے پیارے داغ مفارقت دینے والے ہیں تو ایک اسی غم کے باعث دنیا سے اس کا دل اچاٹ ہو جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ قدرت نے مستقبل پر غیب کے پردے ڈال رکھے ہیں اور دیکھا جائے تو یہ بھی اللہ کی رحمتوں میں سے ایک بہت بڑی رحمت ہے۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

فرق

شیخ سعدی سے کسی نے دوست اور بھائی کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا: ’’ان میں وہی فرق ہے جو ہیرے اور سونے میں ہے۔ دوست ہیرے کی مانند اور بھائی سونے کی مانند۔‘‘ وہ شخص بہت حیران ہوا اور کہا: ’’حضرت بھائی جو حقیقی اور سگا رشتہ ہے اسے آپ کم قیمت یعنی سونا سے منسوب کر رہے ہیں اس میں کیا حکمت ہے؟‘‘

شیخ سعدی نے فرمایا: ’’سونا اگرچہ کم قیمت ہے لیکن اگر ٹوٹ جائے تو اسے پگھلا کر اصل شکل دی جاسکتی ہے جب کہ ہیرا ٹوٹ جائے تو اصل شکل نہیں دی جاسکتی۔ بھائیوں میں وقتی ناراضی ختم ہو سکتی ہے لیکن اگر دوستی میں دراڑ آجائے تو اسے دور نہیں کیا جاسکتا۔‘‘

فرزانہ شوکت۔ کراچی

چٹکلہ

ایک دوست دوسرے دوست سے۔ ’’بتاؤ آملیٹ کسے کہتے ہیں؟‘‘

دوسرا دوست۔ ’’جو آم دیر سے پکتا ہے اسے آم لیٹ کہتے ہیں۔‘‘

ریما نور رضوان۔ کراچی

مدت

زندگی روگ لگنے لگی ہے
مشکلیں مجھ پہ اتنی پڑی ہیں
بحرِ امداد مدت سے آقاؐ
آپؐ کے در پہ نظریں لگی ہیں

راؤ تہذیب حسین تہذیب۔ رحیم یار خان

کہاں جا کے رہیں

اب بھی وہی اک سعی پیہم ہے وہی ہم ہیں۔ وہی مقدر، وہی وقت کی ناراضگیاں ادھر سے سنوارو تو ادھر سے پھر اسی طرح پر پیچ، یہ برس ہا برس کا سفر اور یہی موسموں کا جنگل سب رتیں بیت جاتی ہیں پر دکھ کی رت کیوں نہیں بیتتی یا پھر یہ ہم ہی ہیں جو انہیں ساتھ لیے پھرتے ہیں ان دکھوں سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ ہم پہ تو یہ زمین تنگ ہو گئی ہے کہاں ایسی جگہ ڈھونڈیں؟ کہاں جا کے رہیں جہاں دکھ، مایوسیاں اور آنسو نہ ہوں۔ جہاں محرومیاں اور ناکامیاں نہ ہوں؟ ایسی جگہ جہاں دھوپ زیادہ روشن ہو اور دن زیادہ شفاف ہوں جہاں نگاہوں میں دیپ جلتے ہوں اور جن پر اعتماد ہو جن کے لیے سب کچھ تیج دیا جائے وہ دھوکہ نہ دیتے ہوں۔

عابد محمود۔ ملکہ ہانس

باتوں سے خوشبو آئے...!

☆ محبت ایسا دریا ہے کہ بارش روٹھ بھی جائے تو پانی کم نہیں ہوتا۔

☆ ہم ضرورت سے بہت زیادہ کی آرزو کرتے ہیں اس لیے ناکام ہوتے ہیں۔

☆ جب انسان کو شہرت مل جائے تو دولت خود بخود اس کا پیچھا کرتی ہے۔

☆ یاد رکھیں جو چیز اچھی مگر کامیاب ہو، اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔

☆ انسان کی سب سے بڑی خوبصورتی اس کی مسکراہٹ ہے۔

☆ اپنے دامن کو سچائی اور خلوص کے موتی سے بھر کر اس کو تحفتاً اپنے دوستوں میں تقسیم کرو کیونکہ یہ بے مول تحفہ ہے۔

☆ شک کا پہلا سوراخ محبت کی کشتی کو ڈبو دیتا ہے۔

☆ سب سے اچھی بات وہ ہے جس کے معنی زیادہ اور الفاظ کم ہوں۔

☆ محبت قیمتی بھی ہے اور سستی بھی، اگر کی جائے تو سستی ہے اور اگر نہ ملے تو قیمتی ہے۔

☆ دل ایک آئینہ ہے اگر وہ بدی سے پاک ہے تو اس میں خدا بھی نظر آ سکتا ہے۔

☆ مرد کا امتحان عورت سے اور عورت کا امتحان پیسے سے ہوتا ہے۔

☆ بہترین کی امید رکھو اور بدترین کے لیے تیار رہو۔

☆ جو لوگ تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں وہ باصلاحیت نہیں ہوتے۔

☆ محبت صرف ملتی ہے اور دی جاتی ہے، خریدی نہیں جاسکتی۔

☆ اگر تم تیس برس میں طاقتور اور چالیس برس میں عقل مند نہیں بنے تو پھر کبھی طاقتور اور عقل مند بننے کی امید نہ رکھو۔

☆ سب سے بڑی فتح اپنے آپ کو فتح کرنا ہے۔
ایس۔ امتیاز احمد۔ کراچی

انسان بچ سکتا ہے

☆ تکبر سے سلام کے ذریعے۔
☆ مصیبت سے صدقے کے ذریعے۔
☆ بیماری سے دعا کے ذریعے۔
☆ گناہ سے اللہ کے خوف کے ذریعے۔

صائمہ طاہر سومرو۔ حیدر آباد

چالان

تیز رفتاری کے جرم میں ایک صاحب کا چالان ہوا اور انہیں مجسٹریٹ صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے کہا۔
''جناب عالی! میں تو صرف بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا۔''
''کیا ثبوت ہے اس بات کا؟'' مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔
''جناب والا! ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ میں اس وقت اپنے سسرال جا رہا تھا۔''

عابدہ اسلم۔ لاہور

جلترنگ

کسی ملک کے وزیر خزانہ بے تکلف احباب کے حلقے میں چہک رہے تھے۔
بچپن کا زمانہ بھی کیا زمانہ ہوتا ہے۔ ان دنوں میری تمنا تھی کہ بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا۔
''مبارک ہو۔'' کسی ستم ظریف نے کہا۔
''مراد پوری ہوئی۔''

صائمہ ادریس۔ کراچی

بہت اچھی باتیں

☆ شکر ادا کرتے رہا کرو اس رب کا جو برداشت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا مگر اوقات سے زیادہ سکھ دیتا ہے۔

☆ زبان کا وزن بہت ہی ہلکا ہوتا ہے مگر کم لوگ اسے سنبھال پاتے ہیں۔
☆ اگر کسی کو کچھ دینا ہے تو اسے اچھا وقت اور دعا دو کیونکہ تم ہر چیز واپس لے سکتے ہو مگر کسی کو دیا ہوا اچھا وقت اور دعا واپس نہیں لے سکتے۔

صبا نور۔ ہارون آباد

میں نکلا شام شہر کو دل میں کچھ ارمان تھے
ایک طرف تھیں سبز جھاڑیاں ایک طرف ٹوٹے قبرستان تھے
پاؤں تلے ایک ہڈی آئی جس کے یہ بیان تھے
سنبھل کر چل اے چلنے والے کبھی ہم بھی انسان تھے

روبینہ خان۔ کوہاٹ

اقوال زریں

☆ چاند کے بغیر رات بے کار ہے اور علم کے بغیر ذہن۔
☆ مرد آنکھ ہے تو عورت اس کی بینائی، مرد پھول ہے تو عورت اس کی خوشبو ہے۔
☆ نیکی کی طرف بلانے والا نیکی کرنے والے کے برابر ہے۔
☆ بدترین گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ بدسلوکی ہو۔
☆ محبت تو چتوں کی سائیں سائیں کی طرح ہوتی ہے نہ دکھائی دیتی ہے نہ پکڑ میں آتی ہے بس اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔
☆ وہاں رہنا آپ کی نادانی ہے جہاں آپ کی ضرورت اور قدر نہ ہو۔
☆ دنیا تمہیں اس وقت تک نہیں ہرا سکتی جب تک تم اپنے آپ سے نہ ہار جاؤ۔
☆ حوصلہ کبھی یہ نہیں پوچھتا کہ پتھر کی دیوار کتنی اونچی ہے۔
☆ انسان کی باشعور زندگی کسی آزمائش کے بعد شروع ہوتی ہے۔
☆ اعتبار کی دیواروں کو اتنا مضبوط کر لو کہ اسے شک کا کوئی طوفان گرا نہ سکے۔
☆ جب ہمارا خود اپنے دل پر اختیار نہیں تو کوئی دوسرا ہم مزاج کیسے بن سکتا ہے۔

سائرہ کنول۔ بہاولپور

ذرا پھر سے کہنا

حمد

اپنے رب العزت کی حمد و ثنا
لکھنے کو جی چاہتا ہے
سجدے کی حالت میں
ہی زندگی گزارنے کا
جی چاہتا ہے
بے حد و بے پناہ و بے شمار
میرے رب کی عنایتیں
ہیں مجھ گناہ گار پر
روز و شب گزار کر
اپنے پروردگار کا
شکر ادا کرنے کا جی
چاہتا ہے
بخش دے گا میرا
پاک رب میری
خطاؤں کو بس
اسی بات پر یقین
کرنے کو جی چاہتا ہے

ریما نور رضوان

سیرتِ سیدہ زہرا سلام

کردار فاطمہؓ کی ضیاء پاشیوں سے جینے کا سلیقہ سیکھو
کس طرح حاصل ہوتا ہے مقام عظمت کا قرینہ سیکھو
اپنے اندر کو ڈھالو اے بیٹیو اطوارِ بتولؓ میں
کیسے پار لگتا ہے پھر یہ تمہارا سفینہ دیکھو
ملکہ فردوس بریں کے آئین عبادت کو شعار بنا کر
لب ہائے زہرا کی جنبش سے تلاوت کا نگینہ سیکھو
حرف شکایت نہ لایا زباں پہ کبھی تقدیس کی رانی نے
خاتونِ قیامت سے شوہر کی اطاعت کا سلیقہ سیکھو
منشور فاطمہ کو اپناؤ کنیز فاطمہ بن کر تم
اسوۂ بتول کی روشنی میں پردے کا طریقہ سیکھو
صداقت، امامت اور سخاوت کا جو مرکز ہے
اس گھرانے سے تم قناعت کا سلیقہ سیکھو
زہرا کی تربیت ہے راز حسنین کی سرفروشی کا
شہزادگان بتول سے تکمیل شہادت کا قرینہ سیکھو
جاں کو لٹا دو سر سجدے میں رکھ کر اے مون
حسین ابن علیؓ سے عبادت کا طریقہ سیکھو

حافظہ مون شاہ

نظم

میرے خدایا! میری زمیں پر یہ قہر سا کیوں
بپا ہوا ہے
ہر آنکھ نم ہے ہر دل دریدہ ہر گھر میں
ماتم کا سماں ہے
یہ میری مٹی، یہ میری دھرتی، لہو کے رنگ
میں رنگی گئی ہے
ہر ماں کا چہرہ، دھرتی ماں کا چہرہ گئی
دنوں سے دھواں دھواں ہے

سباس گل

محبت چیز کیا ہوتی ہے

تم سے مل کے جانا ہے
محبت چیز کیا ہوتی ہے
اک مسکراہٹ پر دل ہار جانا
چیز کیا ہوتی ہے
اک نظر کرم کی خاطر تڑپنا
چیز کیا ہوتی ہے
کسی کو دیکھ کر کھلنا
چیز کیا ہوتی ہے
تم سے مل کے جانا ہے
محبت چیز کیا ہوتی ہے

علیشبہ احمد

غزل

سحر ہوئی تو سحر یہ ٹوٹا رات کا
ہر موسم لگتا ہے موسم برسات کا
نگر نگر پھول کھلتے ہیں سمن کے
نہیں گرتا مقام گلاب کا
چھپ کے دیکھ رہا تھا چاند
بدلی کی اوڑھ سے
کچھ سرک کے بادل ہٹے
ہالا پھل گیا تھا جناب کا
سمجھ لے میرے دل کی بات کیوں ہے روٹھا
دل کی بزم میں رہتا ہے مکھڑا آپ کا

مہرین کنول

غزل

انداز ہزار اس نے پائے ہیں ستانے کے
لمحات کبھی نہیں گنواتا وہ میرا دل جلانے کے
خفا کر کے ستم گر بھول ہی جاتا ہے
خدا ہنر بھی کوئی دیتا اسے منانے کے
دم بھر شاد ہو گئے سر محفل ہم
ہزار عنوان ہوئے اک ذرا مسکرانے کے
کبھی خوشیوں کی تمازت کبھی غموں کی دھوپ
تمام جدا ہی لگے زیست کے افسانے کے
خوش حالی میں دوست بدحالی میں اجنبی
یوں ہی اطوار بدل جاتے ہیں زمانے کے

درخشاں ضیاء

انتظار

تمہیں معلوم تو ہوگا
رات کی تاریکی میں
کوئی دریچے سے سر ٹکائے
تمہیں بہت یاد کرتا ہے
بھیگی آنکھوں سے دیکھ کر آسمان کو
تمہارے لوٹ آنے کی دعا کرتا ہے
کسی کی بے چین آنکھیں
انتظار کی آگ میں جلتی ہیں
سنو جاناں!
اب تو لوٹ کر آجاؤ
اس سے پہلے کہ میری بے قرار آنکھیں
ہجر کی آگ میں جھلس کر پتھرا جائیں
میری آس کے سارے معصوم پھول
ٹوٹ کر کسی ویرانے میں بکھر جائیں
تم لوٹ آؤ
مجھے بکھرنے سے بچالو
میرے ٹوٹے بکھرے وجود کو
اپنے سینے میں چھپالو!

رابعہ افضال خان

کتاب لکھنا

تم اپنی ایک کتاب لکھنا
محبتوں کا حساب لکھنا
چاہتوں کو بے تاب لکھنا
تم جو کہتے ہو
گزارنے آتے نہیں ہیں

شب و روز محبتوں کے
پھر اس میں تم
محبتوں کا نیا باب لکھنا
کیسی الفت ہے تم کو ہم سے
کہتے ہو اکثر دوستوں سے
پھر ایسا کرنا
تمام شکوے اکٹھا کرنا
تمام گلوں کا حساب لکھنا
تم اپنی ایک کتاب لکھنا
محبتوں کا حساب لکھنا
چاہتوں کو بے تاب لکھنا

کائنات غزل

نظم

مجھے چپکے سے
تنہائی نے مار دیا
کوئی تو ہو
جو آئے اور آکر
میری قاتل
میری تنہائی سے
میرے قتل کا حساب لے......

ربیل آرزو

نظم

میرے چہرے پر
اس کی یادوں کی شدت کے اثرات دیکھ کر
دسمبر کی یہ آخری رات
مجھ سے ڈر کے کانپ رہی ہے
شاید اس کو خوف ہے
کہ
کہیں میں اس کا قتل نہ کر دوں
مگر یہ پاگل رات
کیا جانے!
کہ یہ خود اپنی موت مر جائے گی
دو تین گھنٹوں بعد
اس کا وجود مٹ جائے گا
پھر میں کیوں اپنے ہاتھ
خون سے رنگوں گا؟
یہ سوچ کر میں ہنستا ہی چلا گیا
اور دسمبر کی یہ آخری رات
اپنی موت آپ مر گئی
میری ہنسی کے ساتھ!

ساتھی زبیر پنہیار

غزل

مٹی کی پوشاک کے اندر
زندہ ہوں میں خاک کے اندر
ایک جہاں آباد زمیں پر
ایک جہاں افلاک کے اندر
اس کی سمجھ میں نہ آسکی جو
بات تھی وہ ادراک کے اندر
پھر نہ کسی پر انگلی اٹھائی
دیکھا جب اس نے جھانک کے اندر
نفرت، دھوکہ، جھوٹ ہے اس میں
پیار نہیں اشراک کے اندر
ظلم غریبوں پر ڈھاتا ہے
رحم نہیں سفاک کے اندر

حکیم خان حکیم

غزل

وہ پیاری لڑکی کہ اک پری سی
ادائیں اس کی ہیں پھلجھڑی سی
وہ ایک لمحے میں مسکرا دے
تو دوجے لمحے لگے لڑی سی
کبھی ہے تیور میں سخت غصہ
کبھی ہے آنکھوں میں اک جھری سی

میں ڈر سا جاتا ہوں جب بھی دیکھوں
نگاہ اس کی کڑی کڑی سی
میں ڈوب جاؤں کہ جھیل ہیں یہ
نگاہیں اس کی بڑی بڑی سی
شرم سے رخ پھیرے جب بھی پائے
وہ خود پہ نظریں میری گڑی سی
یہ زندگی اس کے ساتھ ساجد
ہے موتیوں سے جڑی جڑی سی

سید ساجد

غزل

صحن چمن میں آگ جو برسا گئے ہیں لوگ
اپنے کیے کی آپ سزا پا گئے ہیں لوگ
پژمردگی چہار سو چھائی ہے آج کل
شاید غم حیات سے اکتا گئے ہیں لوگ
ایسی چلی ہے شہر میں کچھ باد تیز رو
پھولوں کی طرح آج جو مرجھا گئے ہیں لوگ
کچھ مسئلے ہیں رو برو ایسے جہان میں
انجام سوچ سوچ کے گھبرا گئے ہیں لوگ
جن کو جنون شوق نے وحشی بنا دیا
امتیاز بس وہ راہ وفا پا گئے ہیں لوگ

ایس امتیاز احمد

غزل

بس اتنی سی سہولت چاہیے تھی
مجھے تیری محبت چاہیے تھی
اتر آتے ہیں سبھی منظر زمین پر
ان آنکھوں کی اجازت چاہیے تھی
میرے چاروں طرف ہو بس محبت
محبت کی حکومت چاہیے تھی
ٹھٹھرتی روح اور سوکھے بدن کو
تیری سانسوں کی حدت چاہیے تھی
میرے خوابوں کے بنجر آئینے کو
نمی کی ایک صورت چاہیے تھی

ٹھہرنا تو اسے آتا نہیں تھا
اسے تو یار ہجرت چاہیے تھی
اذیت ہی اگر ہے یہ محبت
محبت میں اذیت چاہیے تھی

راؤ وحید اسد

غزل

تیرے ساتھ جو موسم تھے ان کا کیا حال ہوا کبھی لکھنا
میرے بعد تجھے کوئی خوشی ملی کہ ملال ہوا کبھی لکھنا
کبھی ساتھ ہوا نے رقص کیا دکھ کہ بانٹا سچ کہنا
کوئی ساتھ ہنسایا رویا کتنا نڈھال ہوا کبھی لکھنا
جو تجھ میں تجھے تلاش کرے اور کاش کہ ایسا ہو
کوئی لمحہ جاں میرے جیسا سخن مثال ہوا کبھی لکھنا
وہی آب و ہوا کا فیصلہ ہے کہ اکیلا ہے تو اب تک
کہیں پھول کھلے یا سبزہ پامال ہوا کبھی لکھنا
میرا سانس سے رشتہ باقی ہے دل ساتھی ہے کیا لکھنا
تو چین سے ہے یا جینا کار محال ہوا کبھی لکھنا

فرزانہ شوکت

غزل

میرے ناز اٹھانے والے کیسے ہو
مجھ کو تنہا چھوڑ کے جانے والے کیسے ہو
تیرے بغیر نیند نہ آئی شب بھر ہمیں
میرے خواب چرانے والے کیسے ہو
جنہیں ٹوٹ کے چاہا تھا زندگی میں ہم نے
وفا کو میری ٹھکرانے والے کیسے ہو
وعدہ کیا تھا تو نے ساتھ نبھانے کا
چاہت کا وعدہ توڑ کے جانے والے کیسے ہو
تجھ بن نہ جی سکے گا جاوید کبھی
مجھ کو یوں دل سے مٹانے والے کیسے ہو

محمد اسلم جاوید

آج پھر شہر میں دھرنا تھا

چھوڑ دو
مجھے جانے دو
میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟
گھر پر میری ماں
میری بہنیں
میری بیوی
میری بیٹی
میرا انتظار کر رہے ہیں
میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں
تم جو چاہے لے لو
میری بائیک رکھ لو
مجھے جانے دو
میں یہ شہر ہی چھوڑ جاؤں گا
میری ماں کے آپریشن کے لیے
لی ہوئی میری یہ
دو ماہ کی ایڈوانس میں لی ہوئی تنخواہ
رکھ لو
مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو
یہ سونے کی بالیاں لے لو
جو میں اپنی آٹھ مہینے کی بیٹی
کے لیے
لایا ہوں
جس نے
آج صبح
پہلی بار مجھے
بابا
کہہ کر پکارا تھا
مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو
مجھے مت مارو
وہ اپنی آخری سانس تک
التجائیں فریاد کرتا رہا
آج پھر
شہر کی معروف شاہراہ پر
دھرنا تھا
اس نے اپنی بائیک
متبادل راستے کی طرف موڑ دی تھی
مگر
اُسے کیا پتہ تھا
وہ متبادل راستہ
تو اس کی زندگی کا متبادل!
موت کا رستہ بن جائے گا

شیریں تبسم

عشق عبادت

شہر خموشاں کے ویرانے کونے میں
دنیا کی رنگینیاں سب فراموش کیے
اپنے ذکر میں مصروف جوگن
جس کے بے ترتیب لفظوں سے
جذبوں کی سچائی چھلکتی تھی
آنکھیں بے چینی سے موندھے
سر گھٹنوں پر ٹیکے
من ہی من میں گنگناتی ہوئی
کچھ پراسراری وہ کمال جوگن
وہ جیسے دنیا قہر آلود نگاہوں سے تکتی
اور پھر قہقہے لگاتی بڑی بے دردی سے گزر جاتی
مگر اس بے ضرر سی دنیا میں
میں چاہ کر بھی ملنے سے قاصر رہتی
اب نکلتی ہوں اب چلتی ہوں
مسلسل ارادہ تو باندھتی تھی
سہ پہر گزر جاتی تھی
میں دل پر پتھر رکھ کر جبراً
دو قدم ہی چل پاتی تھی
کہ سامنے کی راہ گزر مجھے
جیسے کانٹوں بھری سی لگتی تھی
اپنی ذات میں مگن وہ بے مثال جوگن
گرد میں لپٹا جس کا بکھرا وجود
اس قدر نکھرا سا لگتا تھا

که آنکھیں چندھیانے لگتی تھیں
اس کے بوڑھے نڈھال جسم کی مہک
محسور کن تھی اتنی کہ
شہر مدفن کا اِک اِک گوشہ
شہر گلاب لگنے لگتا تھا
اپنی دھن میں گم وہ گنگناتی جوگن
جسے پہر کی خبر ہوتی
نہ سحر کا پتا ہوتا
جانے اسم کیسا پھونکتی تھی
کہ جس کے طلسم میں کھو کر
میں گھنٹوں کی کھوئی ہی رہتی تھی
شہر کہکشاں سے دور
پرے دور کہیں
شہر گورکن میں کئی بوجھل شام کا
کچھ پراسرار سا وہ پرسکون منظر
جسے لوگ نحوست سمجھ کر
یوں رخ پھیرتے کہ
پلٹ کر نہیں تکتے تھے
مجھے جنت سا لطف دے جاتا تھا

ثناء ناز

نظم

اب جو بیٹھے ہو سامنے میرے
چلو کچھ سوالوں کے جواب دے دو
میرے گزرے کل کا حساب دے دو
تمہارے بن لمحے جو گزرے ہیں
کس اذیت سے گزرے ہیں کیا بتاؤں
ان بیتے ہوئے لمحوں کا کچھ تو ازالہ کرو
چلو چھوڑو یہ سب باتیں
یہ شکوے اور شکایتیں
بلکہ ایسا کرو
کچھ وعدے تم کرو
کچھ وعدے میں کروں
کہ اب سنگ سنگ رہیں گے سدا
نہ چھوڑ کے جاؤ گے تم مجھے
نہ تڑپاؤ گے یوں پہلے کی طرح
چلو اب وعدہ کرو
چلو اب وعدہ کرو

رمنا نور

اس روز

اس روز جب
میں تنہا تھی
تمہاری خاموشی سہا
گئی میری روح کو
دل ساکت کر گئی
میرے ہاتھوں سے
کانچ نہیں بکھرا
میری زندگی بکھری
تھی اس روز
کانچ نہیں ٹوٹا
میرا دل ٹوٹا
تھا اس روز
کانچ کی کرچیاں نہیں
میری روح کرچی کرچی
ہوئی اس روز
جب میں ہاری
اور تم جیتے
تب میں ہاری
نہیں بلکہ جیتی
کیوں کہ تمہاری
جیت ہمیشہ سے
ہے میری جیت!

مدیحہ اعجاز حسین

نظم

سمندر کی گہرائی
میں
جا چھپوں
دل میرا کرے
کسی گہری کھائی
میں
جا مروں
دل میرا کرے
اب نہ کوئی
آس ہے
نہ امید
تیری بے وفائی
پہ رووں
دل میرا کرے
پر یہ زمانے کے
سخت بندھن
ہیں مجھے جکڑے ہوئے
نہ ہو فریب کہیں
دل میرا کرے

نورالصبا

شب تنہائی

روٹھ جاتے ہیں ہم خود سے
شب تنہائی میں
نگاہیں برسی ہیں
شب تنہائی میں
دھڑکنِ دل کو کرتے ہیں محسوس
شب تنہائی میں
یاد آتی ہے جب تیری
شب تنہائی میں
دل لہو کے آنسو روتا ہے
شب تنہائی میں
بہت تڑپتے ہیں ہم
شب تنہائی میں
کسی روز آ جاؤ گے تم
شب تنہائی میں
یہ امید کے چراغ جلاتے ہیں ہم
شب تنہائی میں

عائشہ جمیل۔ کراچی

نظم

دلوں میں میل آئے
بدگمانی کے بادل چھا جائیں
سنو تو جانِ جاں میرے
کبھی بھی تم مجھ سے
تعلق توڑ نہ لینا
کبھی بھی زندگی کا رستہ
میرے رستے سے تم الگ نہ کر لینا
یہ تو زندگی کی خو ہے
کہ تصویر کا ایک رخ ہے
اگر کہہ سکیں اس کو
محبت کی آزمائش ہے
محبت کی انتہا حد تک
پہنچنے کی سیڑھی پر
بدگمانی ایک منزل ہے
منزل سے کامیابی سے
گزر جانا ہی معراج ہے
محبت ہے تو ہمدم دست جانِ جاں
کبھی زندگی میں
ایسے لمحات بے خیالی میں جو آ جائیں
کبھی تم میرے بارے میں
بدگمان نہ ہونا
تعلق توڑ نہ لینا

مریم ماہ منیر

سندیسے

صبا عبدالغنی.............کراچی

میری جانب سے تمام قارئین ردا، رائٹرز، صالحہ آپی، نورین ملک اور ردا اسٹاف کو باربی ڈول کا سلام پرخلوص قبول ہو السلام علیکم۔ جولائی میں مجھے کس کس نے مس کیا؟ آپ لوگ نہیں بھی بتائیں گے تو بھی مجھے پتا ہے کہ آپ لوگوں نے مجھے بہت مس کیا۔ غیر حاضری پر معذرت۔ اب آتی ہوں تبصرے کی طرف تو ٹائیٹل اچھا تھا۔ ماڈل بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ بس پس منظر سادہ تھا۔ ''گوشہ آگہی'' میں اس بار آپ کی پیار بھری باتیں بہت اچھی لگیں۔ نائلہ طارق اور فاطمہ خان کے ناول کی کمی بھی بہت محسوس ہوئی۔ پھر سب سے پہلے اپنے فیورٹ ناول ''تیرے پیار کی خوشبو'' کی طرف دوڑ لگائی۔ اس بار کی قسط بہت زبردست تھی۔ ساری الجھنیں سلجھ گئیں۔ قمروش آپی! یو آر دی بیسٹ۔ ''تجھ سے مانگوں میں تجھ کو'' شازیہ آپی! تھوڑی اسپیڈ پکڑیں اور شہریار اور حسنٰی کی جلدی شادی کروائیں۔ آپ کا ناول بھی سپرہٹ جا رہا ہے۔ ''ایک چاند ہم سفر ہے'' نوشابہ فاروق! ہنسی سے بھرپور، مسکراہٹوں سے سجا اور شرارت سے نکھرا ہوا آپ کا ناول زبردست رہا۔ پڑھ کر میں کتنی ہی دیر تک ہنستی رہی۔ ویلڈن ''اندھیری رات میں نکلا چاند'' روشنی فاطمہ! آپ کا ناول زبردست رہا۔ خاص کر کہ ناول کا نام بہت خوب صورت ہے، ویلڈن۔ اس بار کے دونوں ناولٹ بیسٹ رہے۔ ''جنہیں رستے میں خبر ہوئی'' نیلم ریاست، پہلی تحریر بہت کمال کی ہے۔ پڑھ کے لگا ہی نہیں کہ یہ آپ کی پہلی کاوش ہے۔ ماشاءاللہ آپ کا اندازِ تحریر بہت پختہ ہے۔ ردا سے یونہی جڑی رہیے گا۔ ''اترے چاند دریچے میں'' نائلہ طارق! اف آپ کے لیے کیا کہوں؟ کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا۔ بہت زبردست تحریر ہے آپ کی۔ بہت خوب صورتی سے آپ نے قرآن شریف کی اہمیت واضح کی ہے ویلڈن۔ ''چاند رات کی چاندنی'' عائشہ الیاس! کہانی کا نام جتنا خوب صورت تھا کہانی بھی اتنی ہی خوب صورت تھی زبردست۔ ''ردا کے رنگ اپنوں کے سنگ'' سیدہ فرزانہ حبیب فرزین! آپ کی تحریر بہت زبردست تھی۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ''محبت نجوگ ہے جاناں'' جویریہ بانو آپ کی کہانی واقعی شاندار تھی۔ موضوع بھی بہت اچھا تھا اور کہانی بھی زبردست تھی۔ ''امتحان'' ایقان علی بہت اچھا اور بہت اداس افسانہ تھا۔ عمر سے بہت ہمدردی محسوس ہوئی۔ آپ کا ایک الگ انداز ہے جو آپ کو منفرد بناتا ہے۔ مجھے آپ کا افسانہ بہت پسند آیا اوسم، ''جینا تو ہے'' سحر مبین افسانہ لاجواب تھا۔ ''وطن کی مٹی گواہ رہنا'' ثناء ناز! آپ نے بہت خوب صورت افسانہ لکھا۔ شہادت کی اور حب الوطنی کی ایسی عظیم مثال آج کل کہاں ملتی ہے۔ ''اور سب ٹھیک ہو جائے'' راجکماری سارہ احسان آپ نے بھی بہترین لکھا۔ اسپیشلی وہ نظم جو آخر میں آپ نے لکھی تھی بہت پیاری تھی۔ ''ردا کی ڈائری'' میں مہرین کنول، افشاں

علی، مہوش جواد، دانیہ آفرین، روشنی فاطمہ اور مابدولت کے انتخابات زبردست تھے۔ ''اشعار'' میں سب نے اچھا لکھا۔ ''اس ماہ میں'' فریدہ فرید، عانیہ نیازی، صبا سحر، نور بانو، نور ملک، فرزانہ شوکت، ریما نور رضوان، سیدہ فرزین اور ایس امتیاز احمد کے انتخابات اچھے لگے۔ ''خوشبو'' بہت زبردست رہا۔ ''ذرا پھر سے کہنا'' میں رابعہ افضال، زینب ملک ندیم، ثناء کنول اور شہلا گل سحر کی شاعری اچھی لگی۔ باقی سب کی شاعری بھی متاثر کن تھی۔ ''سندیسے'' میں رابعہ افضال خان، مصباح مسکان اینڈ امینہ، درخشاں ضیاء اور عانیہ نیازی کے سندیسے زبردست تھے۔ صالحہ آپی! آپ نے بھی اپنے تمام محبت کرنے والوں کو یاد رکھا بہت اچھا لگا۔ ''دوستوں کے نام پیغام'' بھی ہر بار کی طرح بیسٹ تھا۔ ''گوشہ چشم'' ہر بار کی طرح شاندار تھا۔ دانیہ آفرین کی والدہ کی رحلت کا پتا چلا۔ بہت افسوس ہوا۔ آپ کے اس غم میں ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے تمام گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، آپ کی والدہ کے درجات بلند فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ سعدیہ اقبال، زینب ملک ندیم، رمنا نور، ثوبیہ ملک، بسمہ ناز اور رخشندہ علوی کو خوش آمدید۔ ردا کے سنگ اپنا سفر یونہی جاری رکھیے گا۔ ''عید سروے'' میں مصباح مسکان اینڈ امینہ، شہلا گل سحر اور مون شاہ تینوں نے اچھے جوابات دیئے اور اچھا لکھا۔ کچن اور سنگھار دونوں ہی اپنی جگہ بے مثال تھے۔ آخر میں اس دعا کے ساتھ اجازت کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی زندگی خوشیوں سے ہمکنار کرے۔

افشاں علی.............کراچی

پیاری سی صالحہ آپی و نورین آپی سمیت میرے ہر دلعزیز قارئین! محبتوں کی ٹھنڈی میٹھی ہواؤں کے سنگ اور خلوص کی رم جھم پھوار لیے افشاں علی سندیسے کی محفل میں حاضر خدمت ہے۔ پڑھنے والی تمام خوب صورت بصارتوں کو افشاں علی کا پُرخلوص سلام۔ جناب ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد افشاں علی پھر سے موجود ہیں امید ہے کہ آپ سب نے خوب سارا مس کیا ہوگا۔ عیدالفطر کے موقع پر عیدی کے طور پر ہمیں جولائی کا خوب صورت سا سجا ہوا شمارہ موصول ہوا۔ سب سے پہلے ''گوشہ آگہی'' کو پڑھا۔ ایک بار، دو بار اور پھر تین بار۔ صالحہ آپی نے خوب صورت الفاظوں کو پیار کی مالا میں پرو کر کیا خوب لکھا۔ شاہدہ علی کا مکمل ناول بھی ٹھیک رہا۔ ناولٹ جو کہ ثناء کنول کے قلم کا شاہکار تھا۔ بہت ہی خوب تھا۔ اتنے پیارے پیارے ناموں کے ساتھ تھوڑی سی Sad مگر بہترین تحریر پڑھنے کو ملی۔ فریدہ فرید خوب صورت سے انداز میں آپ نے تمام لڑکیوں و ماؤں کو بہت اچھا سا پیغام دیا۔ ویل ڈن۔ اقراء چنا، کائنات غزل، مہرین کنول، تبسم فیاض، رابعہ افضال، سعدیہ اقبال، ماریہ عمران، شیریں تبسم، نوشین طاہر اور امبرین ناز ان سب نے بھی کافی اچھا لکھا۔ عید کے موقع پر صالحہ اپیا آپ کے قلم کا جادو بھی خوب رہا۔ درخشاں ضیاء نے بھی اچھے موضوع کی طرف توجہ دلائی۔ پیاری گیتی آراء اور عائشہ ذوالفقار ان دونوں نے بھی انوکھے اور دلچسپ موضوع پر لکھا۔ عید سروے میں سب کے جوابات پڑھے۔ مزا آیا۔ سندیسے کی محفل تو اس بار بہت بارونق رہی۔ پیاری سی رابعہ، صبا عبدالغنی، ثمینہ آپی، ثناء کنول، گیتی آراء اور درخشاں ضیاء، افسانہ آفتاب ڈیئر آپ سب کا بے حد شکریہ میری تحریر کو پذیرائی و پسندیدگی کی سند بخشنے کا۔ صباء عبدالغنی آپ کا پیغام دل کو چھو گیا۔ اب بات ہو جائے اگست کے شمارے کی۔ ماہِ اگست وہ مہینہ

ہے جو ہمارے پیارے پاکستان کی سالگرہ کا مہینہ ہے۔ وہیں یہ ردا کی سالگرہ کا بھی مہینہ ہے۔ تو میں دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت اس پاکستان کو اپنی امان میں رکھے اور ساتھ ہی ہمارے پیارے سے ردا کو بھی ہمیشہ ہمارے سر پر سایہ فگن رکھے۔ آمین۔ فریش سا اگست کا سرورق دل کو بے حد بھایا۔ سب سے پہلے صالحہ آپی سے باتیں کیں۔ مطلب ''گوشہ آگہی'' میں آپی کی باتیں قطرہ قطرہ شبنم بن کر دل کے گلابوں پے بکھری

سالہ سفر کی داستان دو صفحوں میں رقم کرلینا آسان بات نہیں وہیں یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ بہت جلد آپ کا نیا ناول ردا کی زینت بن رہا ہے۔ شازیہ آپی اور قمروش کے ناول کی قسطیں مزیدار تھیں۔ فاطمہ خان اور نائلہ طارق کے ناول غیر حاضر نظر آئے۔ ''اندھیری رات میں چاند نکلا'' تو ''چاند رات کی چاندنی پھیلی''، ''ردا اپنوں کے سنگ'' دیکھ کر دل بے ساختہ بولا ''اترے چاند دریچے میں''، ''محبت سنجوگ ہے جاناں'' اور واقعی ''امتحان'' بھی پر ''جینا تو ہے'' کیونکہ ''ایک چاند ہمسفر ہے''، ''وطن کی مٹی گواہ رہنا'' اور ''سب ٹھیک ہوجائے گا'' نوشابہ فاروق کا نام بہت ٹائم بعد نظر سے گزرا ناول اچھا لکھا۔ روشنی فاطمہ کا مکمل ناول خوب رہا۔ جنہیں راستہ میں خبر ہوئی کہ عنوان سے نیلم ریاست نے بھی اچھا لکھا۔ نائلہ طارق کے ناول کی قسط نہ سہی پر ان کی تحریر پڑھنے کو ملی۔ جویریہ بانو کا اندازِ تحریر کافی انوکھا اور اچھا لگا۔ ایقان علی، سحر مبین، راج کماری اور سب کے افسانے بھی اچھے تھے جب کہ حب الوطنی سے چور ثناء ناز کا افسانہ بھی اچھا رہا۔ اب بات ہوجائے اس افسانے کی جس نے محفل لوٹ لی جی بالکل ہماری پیاری رائٹر فرزانہ حبیب فرزین نے ''ردا کے رنگ اپنوں کے سنگ''

دکھائے اور کیا خوب صورتی سے دکھائے پڑھ کر مزا آ گیا۔ ویل ڈن ڈیئر۔ تم نے واقعی اچھا سرپرائز دیا۔ بیسٹ ناول آف دا ایئر کے لیے ایڈوانس مبارک باد اور تمہارے قلمی سفر کو تین سال کا عرصہ مکمل ہوا۔ دعا ہے کہ یہ سفر یونہی کامیابی کے ساتھ جاری وساری رہے۔ نوٹ! میں تمام قارئین و رائٹر سے التماس کرتی ہوں کہ وہ ہماری پیاری رائٹر فرزانہ حبیب فرزین کے مرحوم والد اور دانیہ آفرین کی مرحومہ والدہ کے لیے خصوصی دعا فرمائیں جو کہ گزشتہ ماہ رحلت فرما گئے۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے اور گھر والوں کو صبر عطا فرمائے۔ آمین۔ ردا کی ڈائری سے لے کر سنگھار تک سب ٹپ ٹاپ رہا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار تو گوشہ چشم بھی شامل رہا۔ واہ کیا کہنے۔ اب آتے ہیں سندیسوں کی جانب سب سے پہلا سندیسہ واہ جی صالحہ آپی کی جانب سے آیا دل خوش ہوگیا۔ دعا ہے کہ آپ یونہی خوش رہیں ردا دن دوگنی ترقی کرے اور یونہی ردا کے سنگ ہم سب بھی جڑے رہیں۔ آمین۔ مسکان بکھیرتی مصباح مسکان دعا کے لیے شکریہ روشنی کی طرح چمکتی ہوئی درخشاں ضیاء آپ کے پیار بھرے شعر کے لیے شکریہ جب کہ ہماری پیاری سسٹر عانیہ نیازی آپ نے بھی یاد کیا بہت شکریہ اب اجازت آئندہ ماہ پھر حاضر ہوں گی سندیسے کے ساتھ۔''

ثناء کنول اللہ دتہ..........لودھراں

السلام علیکم! دوستوں بہنوں ساتھیوں اور میری زندگی کی خوشیوں آپ سب کی خدمت میں ثناء کنول حاضر ہے۔

دیر سے آنے کا سبب نہ پوچھ
رستے میں تھیں مشکلیں بہت

یہ میرا ابھی ابھی تازہ تازہ شعر ہے آپ سب کے لیے تو خیر سے اس بار ردا چار تاریخ کو مل گیا۔ جی ہاں جتنے آپ حیران ہو رہے ہیں اتنی میں بھی حیران

سی تھی۔ ٹائیٹل ماشاء اللہ اچھا تھا۔ ''گوشہ آگہی'' میں صالحہ آپی آپ نے بالکل صحیح لکھا۔ کہانیوں میں ثناء ناز، سحر مبین، عائشہ الیاس اور ایقان نے بے حد زبردست لکھا۔ سچ بہت خوب، سارہ راجکماری، فرزانہ حبیب گڈ یار بہت زبردست لکھا۔ نوشابہ فاروق ویلکم ردا۔ روشنی فاطمہ، نیلم ریاست، آپ کو بھی ویلکم بہت پیارا لکھا آپ نے بھی نائلہ طارق دوست، بہن اور کیا (ساتھی لکھ سکتی ہوں) بہت خوب زبردست مزا آ گیا بہت صحیح لکھا تم نے کہانی کا نام بھی اچھا تھا۔ شاعری میں سب نے زبردست لکھا اچھا اب اجازت۔''

فریدہ فرید..........پاکپتن شریف

ردا احباب اور سکھی سہیلیوں کو سلام خلوص!

خوب صورت چہرے اور بے تکے ڈریس میں مزین ٹائیٹل گرل کو دیکھ کر غور کرتے رہے کہ اچھے خاصے سوٹ پر گلے کا ڈیزائن تو نہ اگلا جائے نہ نگلا جائے کی تصویر پیش کررہا تھا۔ نیا پن بھی کوئی تک کا ہونا چاہیے بعدازاں اشتہارات کی ماضی کی نسبت چھوٹی جمپ لے کر فہرست تک پہنچے۔ نوشابہ فاروق نے تو انٹری دے کر سچ میں ہماری عید کردی ان کا ادھورا ناول تو ہنوز دل میں موجود ہے۔ بہرحال ترتیب وار مطالعہ کرتے ہوئے ''گوشہ آگہی'' میں آپی جان کے عزم سفر کی داستان نے حوصلے مزید بلند کردیے۔ آپی جان شفقت و ہمت کا وہ چراغ ہیں جس سے کئی چراغ جلے ہیں۔ سلسلے وار ناولز میں شازیہ جی حسب معمول شادی کے ہنگاموں کے ساتھ موڈ خوشگوار بنا گئیں۔ روشنی فاطمہ سینئر رائٹرز میں سے ایک ہیں ان کے ناول کے بارے میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے ''چھا گئے ہو'' قمروش جی دل دہلا دینے والی تحریر محبتوں کی چاشنی سے تر کہانی پڑھتے رہو ہوش نہیں رہتا کھڑے ہیں کہ بیٹھے ہیں آپ کو فسوں خیز رائٹر کہنا بے جا نہ ہوگا۔ خرمن اس ماہ

غیر حاضر تھی مگر نائلہ جی ہمارے پاس تھیں خوب صورت ٹائیٹل، لاجواب تحریر، ذوالکفل کی انوکھی اور حسین فرمائش تلاوت قرآن سے دن کا آغاز و اختتام کہاں ہوتے ہیں ایسے لوگ؟ پہلے سوچا پھر خود کو تنبیہہ کی کہ ہم کون سا جواہر جیسے ہیں۔ نائلہ جی ویلڈن۔ نیلم ریاست کی میری ناقص معلومات میں شاید فرسٹ اسٹوری ہے اگر ایسا ہی ہے تو پھر نیلم آپ نے تو آتے ہی میدان مارلیا۔ پختہ اندازِ تحریر، داؤد داور زوبیہ کا غیر روایتی ملن داؤد کا ایکشن بھی الگ مسئلہ تھا تو داؤد کی فیملی کاری ایکشن بھی انوکھا تھا۔ کہانی کا پلاٹ روایت سے ہٹ کر مگر دلچسپ تھا اب بات کریں پیاری سی نوشابہ جی کی تو شفا سے شفایاب ناول دلچسپ تھا نوک جھوک، مکالمات فیملی گیدرنگ سب انٹرسٹنگ تھی اسد سے زیادہ افسر توجہ کا مرکز رہا۔ پاکستانی فلموں کا تجزیہ بھی انتہائی حقیقت پر مبنی تھا اوور آل ناول از دا بیسٹ۔ افسانے کی سرزمین ردا ہو اور افسانے باکمال نہ ہوں ناممکن ہے۔ عید رنگ سے سجی تحریریں چاند رات کی چاندنی اچھی کاوش تھی۔ ایقان علی ہمیشہ متنوع موضوعات کے ساتھ آتی ہیں اور دل میں سما جاتی ہیں۔ سحر مبین مختصر اور جامع تحریر تھی جویریہ بانو نثر اور نظم کا حسین امتزاج تھا تحریر میں۔ ثناء ناز اگست کی مناسبت سے اثر انگیز تحریر کے ساتھ اچھی لگیں۔ راجکماری سارہ جتنی مختصر تحریر تھی اسی قدر پراثر بھی تھی اور ہماری پیاری دوست فرزانہ حبیب کو بیسٹ رائٹر آف دی ایئر بننا بہت بہت مبارک ہو۔ افشاں جی ایوارڈ لینے کے لیے جاتے ہوئے ہمیں بھی ساتھ لے جاتیں تھوڑی سی کلیپنگ (تالیاں) ہی کرلیتے۔ عید سروے میں مصباح کے دلچسپ جوابات سے محظوظ ہوتے ہوئے ردا کی ڈائری سے افشاں علی کی انتخابی نظم کو چپکے سے قرطاس میں اتارا۔ ''اس ماہ میں نورین ملک کے انتخاب کو داد دیے بنا آگے

بڑھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس ماہ کی مزاحیہ نظم، ریما نور نے موڈ خوشگوار بنا دیا ایس امتیاز کے انتخاب اچھے ہوتے ہیں۔ ''خوشبو'' سلسلے میں رابعہ افضال، ثناء کنول، سعدیہ عابد سب کا انتخاب اچھا تھا۔ ''ذرا پھر سے کہنا'' میں ریمل آرزو کی نظم اور فرزانہ شوکت کی نظم اچھا انتخاب تھا۔ ''کچن'' میں جب بریانی کا ذکر آجائے تو پھر کچھ اور اچھا نہیں لگتا۔ ''سندیسے'' کی بات کرنے کے لیے تو اب ہم بے چین رہنے لگے ہیں۔ رداد و تاریخ کو ملا تو جہاں خوشی سے کھل گئے وہیں سندیسے میں محفل ذرا سی سونی پاکر مرجھا سے گئے مگر ہماری رابعہ افضال ہیں ناں تو پھر کیا غم وہ ہوں ہم ہوں ایک ہی بات ہے۔ رابعہ آپ سے ہمیں دو وجہ سے انسیت ہے ایک تو آپ بے حد پیاری ہیں اس لیے ہمیں اچھی لگتی ہیں دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ رابعہ افضال ہیں اور ہم بھی شادی سے پہلے فریدہ افضال تھے۔ میری بڑی بہن کا نام رابعہ افضال ہی ہے اور وہ مجھے بہت پیاری ہے آپ کی طرح۔ مصباح مسکان ہم کچھ دن پہلے سوچ رہے تھے کہ تلاشِ گمشدہ کا ایڈ دے دیں مگر شکر ہے آپ جلد لوٹ آئیں اب غائب مت ہونا۔ درخشاں ضیاء آپ کی تحریر آپ کے نام کی مانند جگمگ ہوتی ہے اب ہم سے جدا مت ہویئے گا۔ عانیہ جی تو اپنی ذات میں خود انجمن ہیں۔ معتبر رائے کی حامل عانیہ کی ہر بات ہمیں اٹریکٹ کرتی ہے۔ عید سروے میں عانیہ اور ریما نور کو تو ہم تلاشتے ہی رہے۔ آخر میں سب کو ڈھیروں پیار اور خدا حافظ۔''

عائشہ الیاس..............کراچی

السلام علیکم صالحہ آپی امید ہے بخیر و عافیت سے ہوں گی۔ سب سے پہلے ردا کے خوب صورت عید نمبر کی مبارک باد وصول کریں۔ کیا خوب سب نے لکھا۔ تمام لکھاری بہنوں نے کیا خوب عید کی رونق کا سماں باندھا۔ بہترین نصیحت کے ساتھ لکھی جانی والی تمام کہانیاں دل میں اترتی محسوس ہوئیں اور آپی آپ کے افسانے نے تو جیسے دل کو بھینچ لیا۔ افسانہ نصیحت آمیز تھا خاص کر وہ لاسٹ سین جب وہ گاڑی کی ونڈو میں سے ہاتھ نکال کر بارش کی بوندوں کو محسوس کرتی ہے اور روشن آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی ہے ''مجھے دکھ اس بات کا نہیں ہے کہ تم کیوں چلی گئیں دکھ تو اس بات کا ہے کہ میں اب تک زندہ کیوں ہوں۔'' کیا درد تھا اس میں آپ کے لکھتے وقت کے جذبات بہت نمایاں تھے اور آخر میں شعر کہانی کا نچوڑ تھا۔ میں نے پورا افسانہ زبانی اپنی مما کو سنایا میری عادت ہے جو بات بھی میں دل سے محسوس کرتی ہوں وہ مما کو لفظ بہ لفظ سناتی ہوں۔ ڈائیلاگ میں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کیجیے گا کیوں کہ میں نے بنا دیکھے لکھا ہے۔ بہر حال اب آتی ہوں اپنے اہم مقصد کی جانب تو آپی سب سے پہلے آپ کو سالگرہ کی ڈھیروں مبارک باد معاف کر دیجیے گا۔ میرا خط بہت دیر سے پہنچا لیکن محبت تو تر و تازہ ہے نا۔ خدا آپ کو درازی عمر، صحت یابی، عزت اور اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آپ کا شمار ان مختلف لوگوں میں ہوتا ہے جو آنکھوں کی ظاہری روشنی سے نہیں بلکہ باطن کی روشنی سے دیکھتی ہیں جو بلاشبہ بہت گہری اور خوب صورت ہے آج جس طرح آپ یہ ادارہ چلا رہی ہیں یہ عورتوں کے لیے کچھ کر دینے کی بہترین مثال ہے۔ آپی میں ردا میں بہت خط تو نہیں لکھتی لیکن اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کسی کو پڑھتی نہیں ہوں۔ ہاں تبصرہ کرنا ضروری ہے لیکن یقین جانیے سب سے بڑا مسئلہ پوسٹ کروانے کا ہے میں کہانیاں بھی بڑی مشکل سے پوسٹ کروا پاتی ہوں۔ ہاں پوسٹ آفس میرے گھر کے برابر میں ہوتا تو یقین کریں ہر ماہ ایک خط میرا بھی ردا میں شامل ہوتا۔ بہر حال صباء کے لفظوں نے دل پر بہت اثر کیا کہ سینئر کی تو ہر کوئی تعریف کرتا ہے لیکن ضروری ہے ان نئے لکھاریوں کو جو بالکل نئے ننھے پودے کی طرح ہوتے ہیں جنہیں بہترین نگہداشت سے ہی مضبوط پروان چڑھایا جاسکتا ہے تو اب میں بھی پوری کوشش کروں گی انہیں سراہ سکوں۔ آپی ایک بات اور یوں تو ردا کی ڈھیروں تعریفیں آپ وصول کرتی ہیں لیکن آج میں بھی اس کے اعزاز میں کہنا چاہوں گی کہ واقعی جس طرح آپ نے اسے تخلیق کیا ہے اس پر سلام آپ کو ''کیوں'' وہ اس لیے کہ مجھے اپنے کلچر اور روایتوں سے محبت ہے لیکن آج کے دور میں بہت سے میگزین کی کہانیوں نے اپنا کلچر گنوا کر ویسٹرن کلچر کی اہمیت کو اجاگر کر دیا ہے۔ میں اس کے خلاف نہیں ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے آج بہت سی رائٹر اپنی کہانیوں میں تسلسل کے ساتھ ویسٹرن اسٹوریز کی جھلک دکھاتی نظر آتی ہیں۔ ٹھیک ہے انگریزی ناول پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں لیکن کم از کم ہمیں تو اپنی کہانیوں میں اپنی ثقافت کو اجاگر کرنا چاہیے آنے والے نئے لوگ جب یہ پڑھیں تو انہیں ان کتابوں سے اپنا آپ نظر آنا چاہیے جو ان کا اصل ہے۔ ورنہ تو اگر یونہی چلتا رہا تو وہ وقت دور نہیں جب ہم اور ہماری ثقافت ختم سے گمنام ہو کر رہ جائے گی۔ جب میں نے یونیورسٹی میں ثقافت کے اوپر پریزنٹیشن دی تو پوری کلاس نے مجھے مبارک باد دی لیکن میری ٹیچر نے مجھے صرف اتنا کہا، میں پاکستان کی ثقافت کو نہیں مانتی کیوں کہ وہ اب زندہ ہی نہیں ہے۔ یہ میرے لیے ایک بڑی تلخ حقیقت تھی لیکن حقیقت تو تھی۔ جب ہم ہی اسے گمنام کر رہے ہیں تو ہم ہی ہیں جو اسے اجاگر کر سکتے ہیں لیکن صد افسوس نہ جانے اب کیوں یہ کوئی سمجھنے کو تیار نہیں ہے لیکن ردا کے لیے میں ضرور کہوں گی مجھے اس میں ثقافت نظر آتی ہے جو ہماری پہچان ہے جس میں گاؤں سے لے کر سارا گھریلو زندگی کا تذکرہ ہو یا تہواروں کی خوشیاں سب نظر آتا ہے۔ ایسا نہیں کہ میں اس میں لکھتی ہوں تو سراہ رہی ہوں آپی میں واقعی سخت قسم کی حقیقت پسند انسان ہوں اور جو میں نے جج کیا وہ بتا دیا۔ اچھا آپی اب اجازت دیجیے زندگی رہی تو آئندہ بھی لکھوں گی آپ اپنا بہت خیال رکھیے گا نورین آپی اور ردا کی تمام لکھاری بہنوں کو میرا دل سے سلام اور آپ سب ہی کو یوم آزادی اور عید اضحیٰ بہت مبارک ہو۔''

عانیہ نیازی..............ربوہ

پیاری سوئٹ صالحہ آپی اور نورین ملک آپ کو اور تمام پڑھنے والوں کو میرا اسلام الفت قبول ہو۔ ماشاء اللہ ردا اپنی مسافت کے 20 سال کامیابی سے مکمل کر چکا۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ آپی آپ کو اور تمام اسٹاف کو مبارک باد۔ آپی آپ کو آپ کی سالگرہ کی بھی ڈھیروں مبارک باد۔ خدا آپ کو صحت والی لمبی زندگی عطا کرے، آمین۔ اب بات ہو جائے عید نمبر کی تو میرے پاس لفظ کم پڑ رہے ہیں اتنے شاندار عید نمبر کی تعریف سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ پھر وہ فریدہ فرید ہوں، روشنی فاطمہ، ایقان علی، عائشہ الیاس، ثناء کنول، نوشابہ فاروق، نیو اور سینئر رائٹرز کی تحاریر سے سجے عید نمبر بہت خوبصورت اور عید کی بہترین ٹریٹ تھے اور میرے طرف سے تمام رائٹرز کو بہت بہت مبارک باد۔ اب تو سندیسے کی محفل بھی خوب سجنے لگی ہے اور بڑا اچھا لگتا ہے جب معتبر رائٹرز اپنے قلم سے دیگر رائٹرز کو سراہنے کے ساتھ مجھ ناچیز کو بھی یاد رکھتی ہیں۔ آپ کی محبتیں چاہتیں میرے لیے سرمایہ حیات ہیں۔ خوش رہیں اور یونہی ہم سب میں یہ پیار بھرا قلمی تعلق سدا قائم رہے، آمین۔

......☆......

دوستی کے نام پیغام

صالحہ آپی اور نورین ملک کے نام

پیاری صالحہ آپی اور نورین جی السلام علیکم! نورین جی آپ سے میری فون پر بات ہوئی تھی میں نے آپ کو خوشی خوشی ردا کی سالگرہ کے موقع پر اپنے خصوصی سرپرائز افسانے کا بتایا تھا اور اب اگست کا مہینہ ہمارے گھر کی فضا کو سوگوار کر گیا۔ 23 جولائی 2015ء کو میرے پیارے والد، میرے دوست، میرے ہمراز خاموشی سے ہنستے مسکراتے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اس سے پہلے میرے چار سو صرف خوشیاں اور کامیابیاں تھیں مگر ان کے جانے کے بعد زندگی ختم سی ہوگئی ہے ایسا لگتا ہے اب کچھ بھی کرنے کے لیے نہیں بچا مگر جینا تو پڑتا ہے۔ دعا کیجیے اللہ مجھے اور میری فیملی کو اس ناگہانی دکھ کو سہنے کی ہمت اور صبر عطا فرمائے اور مجھ پر جو ذمہ داریاں ہیں جو خواہشات اور آرزو میرے والد اپنے دل میں لے گئے ان کو پورا کرنے کی مجھے توفیق دیں۔ وہ میری ہر تحریر پر بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ ہمارے درمیان نہیں مگر مجھے یقین ہے ان کی دعائیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ تمام قارئین سے درخواست ہے کہ میرے والد کی مغفرت کے لیے ایک بار ضرور دعا کر دیں۔

وہ حلقۂ یاراں، وہ میری شوخ مزاجی
اے گردشِ حالات بتا، وہ وقت کہاں ہے

صالحہ آپی! آپ سے مجھے بہت ملنے کی آرزو تھی افشاں سے بات ہوئی تھی سوچا تھا اپنے والد کے ساتھ ماہ اگست میں آپ سے ملنے آؤں گی اور ردا کی سالگرہ اور آپ کی سالگرہ کی مبارک باد روبرو دوں گی مگر اللہ کی حکمت کے سامنے ہم انسانوں کی پلاننگ دھری رہ جاتی ہے۔ بس دعا ہے اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش و آباد رکھے اور آپ کے دل کی ساری جائز خواہشات کو پوری کریں۔

☆ سویٹ فرزانہ! آپ کا افسانہ اور آپ کا پیغام ملا۔ فرزانہ آپ کا سندیسہ پڑھ کر ہمیں بھی بہت دکھ ہوا۔ والدین دنیا کی عظیم ترین ہستیاں ہوتی ہیں۔ یقیناً آپ کے لیے یہ سانحہ بہت بڑا ہے۔ خدا آپ کو اور آپ کی فیملی کو صبرِ جمیل عطا کرے اور آپ کے والد کے درجات بلند کرے، آمین۔

سیدہ فرزین حبیب۔ کراچی

ردا کی سہیلیوں کے نام

حسب عادت سب سے پہلے تمام خوب صورت بصارتوں اور سماعتوں کو میرا پیارا سا سلام الفت قبول ہو۔ السلام علیکم۔ میری پیاری سی سہیلیوں افشاں علی، حمیرا عروش اور سدرہ شاہ آپ تینوں کو آپ کی برتھ ڈے کی ڈھیر ساری مبارک باد۔ افشاں علی! آپ کے لیے کیا لکھوں سمجھ میں ہی نہیں آرہا۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے آپ جیسی دوست ملی۔ میری دعا ہے کہ آپ سدا یونہی ہنستی مسکراتی رہیں اور ہمیں بھی ہنساتی رہیں، آمین۔ پیاری سی حمیرا عروش! کہاں گم ہیں آپ؟ پلیز جلدی سے تشریف لائیں۔ آپ کو آپ کی برتھ ڈے کے ساتھ ساتھ شادی کی بھی ڈھیروں مبارک باد۔ دعا ہے کہ آپ اپنے ہمسفر کی سنگت میں ہمیشہ خوش رہیں اور ردا سے جڑی رہیں، آمین۔ پیاری سی سدرہ شاہ! ویری بیڈ ایک بار حاضری کے بعد غائب ہونا اچھی بات نہیں۔ چلیں جلدی سے واپس آئیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہر خواہش اور ہر دعا پوری کرے، آمین۔ ثناء کنول اللہ دتہ! آپ میری بہت اچھی بالکل پکی والی فرینڈ ہیں۔ آپ کی باتیں میرے لبوں پر مسکان بکھیر دیتی ہے اور جب میں خوش ہوں تو آپ کیسے اداس ہو سکتی ہیں۔ ایک مشورہ ہے میرا آپ کو کہ آپ جب بھی کبھی اداس ہوں تو مجھے یاد کر لیجیے گا۔ دیکھیے گا لبوں پر مسکراہٹ ضرور نمودار ہوگی۔ ڈیئر رابعہ افضال خان! بڑی ہستی وہ ہوتی ہے جس کی قدر، عزت اور جگہ دل میں بڑی ہوتی ہے۔ اب تو آپ کو نہیں لگتا ناں کہ آپ بڑی ہستی نہیں ہیں اگر اب بھی آپ کو ایسا لگتا ہے کہ میں نے غلط کہا تو آپ میرے دل میں جھانک کر دیکھ لیں پتا چل جائے گا کہ میں نے صحیح کہا یا غلط۔ افسانہ آفتاب کاوش! میں آپ کو یاد کر رہی ہوں اور آپ کی تحاریر کو بھی۔ اس لیے پلیز جلدی حاضری دیں ردا میں۔ امبرین حیدر! جلدی سے ردا میں انٹری دیں اور اپنا بہت سا خیال رکھیں۔ سحر مبین! میری کیوٹ فرینڈ کیسی ہیں؟ آپ کی دوستی میرے لیے بہت انمول ہے۔ اسے ہمیشہ یونہی قائم و دائم رکھیے گا۔ فریدہ فرید! آپ نے میری تعریف کی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آیا۔ آپ جیسی سینئرز رائٹرز کی تعریف میرے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے کیسے بتاؤں؟ آپ نے میری کتنی حوصلہ افزائی کی ہے اور مجھے کتنی خوشی دی ہے میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ جزاک اللہ۔ مون شاہ! آپ چاہتی ہیں کہ ہم سب آپ کے لیے دعا گو رہیں۔ ڈیئر فرینڈ! میں سب کے لیے دعا کرتی ہوں۔ اس میں آپ بھی شامل رہتی ہیں اور مجھے بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ ملالہ اسلم! آپ کہاں غائب ہیں؟ اور وہ آپ کی فرینڈ ماہا وہ کیسی ہیں؟ جلدی سے ردا میں انٹری دیں اور میرے سوالوں کا جواب دیں او کے۔ مصباح مسکان روف اینڈ اینڈ! میرا سندیسہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ اور آپ دونوں کے سندیسے اور عید سروے دونوں ہی زبردست تھے۔ آئندہ بھی سندیسہ لکھتے وقت مجھے ضرور یاد رکھیے گا۔ اور ہاں! مصباح مسکان آپ کا رزلٹ جیسے ہی آئے ہمیں ضرور بتائیے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر امتحان میں کامیابی عطا فرمائے آمین۔ سویٹ عانیہ نیازی! اپنے سندیسے اور پیغام میں آپ نے مجھے یاد رکھا اور اتنی ساری دعاؤں اور پیار سے نوازا۔ اس کے لیے جزاک اللہ۔ درخشاں ضیاء! میرا پیغام آپ کو پسند آیا جزاک اللہ۔ آپ کی بات بھی درست ہے کہ کہیں بھی جگہ بنانے میں وقت تو لگتا ہے۔ میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں۔ آپ کا افسانہ بہت اچھا تھا اور اپنی فرینڈز لسٹ میں آپ نے مجھے بھی یاد رکھا۔ چلیں اب پکی والی فرینڈ شپ او کے۔ جن دوستوں کے نام یاد نہیں رہے ان سے معذرت۔ امید ہے ناراض نہیں ہوں گی۔ آپ سب لوگ میرے لیے کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ میں یہ شاید کبھی بھی ڈسکرائب نہ کر پاؤں۔ آپ لوگوں کی باتیں، آپ لوگوں کی تعریف اور ہنسی مذاق سب کچھ بہت خاص ہے بہت خاص۔ میرا رب مجھے اتنی ساری محبتوں سے نواز رہا ہے جو میں نے کبھی بھی ڈیزرو ہی نہیں کیں۔ میں اپنے رب کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے ڈھیر ساری نعمتوں سے نوازا۔ آخر میں اس دعا کے ساتھ اجازت دیجیے کہ اللہ تعالیٰ ردا سے جڑے ہر فرد کو بے انتہا خوشیوں، رحمتوں، نعمتوں اور برکتوں سے نوازے۔ آپ سب کو ہمیشہ خوش رہنے اور خوشیاں بانٹنے کی توفیق عطا فرمائے اور بیماروں کو شفا کاملہ عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ سانسوں نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی، اللہ حافظ۔"

صباء عبدالغنی۔ کراچی

صالحہ آپی اور نورین جی کے نام

میرے دلی جذبات

آپ کے اور
میرے
درمیاں

ان دیکھا سا
رشتہ ہے
اس میں ڈھیر
سارا خلوص
محبت، پیار،
خیال، احساس
شامل ہے یہ
ان دیکھا رشتہ
ان رشتوں سے
قدرے اول درجے
بہتر ہے جو صدا
ہمارے ساتھ
ہمارے پاس
رہتے ہیں
مگر ہمارا احساس
نہیں کرتے
مگر ہمارا خیال
نہیں کرتے
آپ کے اور میرے
درمیاں
ان دیکھا سا رشتہ
رب سدا سلامت
و قائم رکھے
آمین!

ریما نور رضوان۔ کراچی

ثناء کنول اللہ دتہ کے نام

پیاری سی ثناء کنول اللہ دتہ السلام علیکم امید ہے خیریت سے ہوں گی۔ منگنی کی بہت بہت مبارک ہو۔ منگنی کے خوب صورت احوال نے یقین جانو بالکل یہی احساس دلایا کہ ہم بھی جیسے وہاں موجود ان مناظر کو دیکھ رہے ہیں تم شاید مجھے نہ جانتی ہو لیکن میں تمہیں جانتی ہوں۔ ردا میں ہر ماہ بڑے خوب صورت طریقے سے رائٹرز کے لیے محبت بھرے پیغام بھیجتی ہو جو بہت پیارے لگتے ہیں۔ بالکل تمہاری طرح۔ خدا سے تمہارے لیے دعا ہے کہ خدا آنے والی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے اور تمہارے نصیب کو اچھا کرے، آمین۔

عائشہ الیاس۔ کراچی

روشنیوں کے شہر کراچی میں گم عزیز ہستی کے نام

سوئیٹ R! سنا ہے آپ نے روشنیوں کے شہر کراچی میں بسیرا کر لیا ہے اور رداڈائجسٹ سے دوستی کر لی ہے۔ اس کے توسط سے آپ سے مخاطب ہوں۔ 10 ستمبر آپ کا جنم دن ہے لیکن ہماری بے بسی دیکھو کہ ہم اس بار اس یادگار دن کو تنہا رہ کر گزاریں گے کیوں کہ آپ کو تو ویسے بھی ہم سے اب کوئی لگاؤ نہیں رہا اور بقول آپ کے، ہم جیسے محرومیوں کے ماروں اور سیاہ نصیبوں کو آپ پسند نہیں کرتے۔ یقین جانیے۔ ہم نے تو اسی دن سے آپ کی طرف جانے والے دوستوں کے نشان مٹا دیئے ہیں۔ پھر بھی اس خوب صورت دن کے حوالے سے ہماری طرف سے جنم دن مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سدا خوشیوں و کامیابیوں سے ہمکنار کرے، آمین!

عابد محمود ملکہ ہانس۔ پاکپتن

صالحہ اور پیاری دوستوں کے نام

پیاری صالحہ جی! میری دوست بہن ہمسفر ہم راہی۔ تمہاری ستمبر میں برتھ ڈے ہے تو ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے۔ لاکھوں کروڑوں خوشیاں عطا کرے۔ ہمیشہ شاد اور آباد رہیں، آمین۔

جب سے تیرے نام کر دی زندگی اچھی لگی
تیرا غم اچھا لگا تیری خوشی اچھی لگی
تیرا پیکر تیری خوشبو تیرا لہجہ تیری بات
دل کو تیری گفتگو کی سادگی اچھی لگی

پیاری سی افشاں علی میری جان میری زندگی میری دھڑکن اور میرے چہرے کی مسکراہٹ۔ ستمبر میں تمہاری

برتھ ڈے ہے تو بہت بہت مبارک ہو سدا خوش اور آباد رہو۔

اس کو کیسے بھول جاؤں ناصر کیسی باتیں کرتے ہو
صورت تو پھر صورت ہے وہ نام بھی اچھا لگتا ہے

پیاری عانیہ نیازی اینڈ حافظہ مون شاہ بخاری! ستمبر میں تمہاری بھی برتھ ڈے ہے تو بہت بہت مبارک ہو۔ سالگرہ سدا آباد اور شاد رہو۔ میری پیاری دوستوں خدا آپ کو سلامت رکھے۔ پیاری سی حمیرا عروش سوری حمیرا شعیب میری دوست ہیپی برتھ ڈے۔ بہت بہت مبارک ہو۔ ہمیشہ آباد رہو۔ حمیرا عروش خدا آپ کو ہمیشہ سہاگن رکھے اور نئے رشتوں کو نبھانے کی توفیق دے۔ صنم ناز ستمبر میں آپ کی بھی برتھ ڈے ہے، سو ہیپی برتھ ڈے۔ آپ سب کے لیے چھوٹی سی دعا۔

ملے تجھے نہ دکھ زندگی میں
پھول کی طرح مہکے خدا کرے
زندہ رہے نام ابد تک تیرا
سالگرہ کی خوشیاں تجھے مبارک خدا کرے (آمین)
پلیز دوستوں وعدہ کرو مجھ سے
ساتھ چھوڑ کے کبھی ہم سے جدا مت ہونا
وفا چاہیے آپ سے کبھی بے وفا مت ہونا
روٹھ جائے ساری دنیا ہم سے
مگر آپ ہم سے کبھی خفا مت ہونا (وعدہ؟)

پیاری ایقان تمہاری تحریر امتحان بہت پیاری تحریر تھی۔ بہت میچورٹی نظر آئی تمہاری کہانی میں کریا۔

ثناء کنول اللہ دتہ۔ لودھراں

ردا کے دوستوں کے نام

ہر انسان کی ازلی خواہش ہے "میرے مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو۔" الحمدللہ ہمارا دلعزیز رداڈائجسٹ ہمارے مزاج اور کائنات کے ہر موسم سے سجا ہر رنگ سے مزین ہے۔ ردا عید نمبر کے نام یہ پیغام بطور مزاجِ عقیدت ہے۔ آپی جان کی ہمت و شفقت کا آئینہ دار ردا، نورین ملک کے اخلاق و خلوص کا سنگھار ردا سکھی سہیلیوں کی کاوش و خصائص سے مہکتا ردا عید نمبر مسامِ جاں کو معطر کر گیا۔ ایک ایک سطر ایک ایک سلسلہ تحاریر، اشعار، پکوان، بیوٹی ٹپس، سب عید نمبر کے عکاس تھے۔ آپی نے مسکراتا "گوشۂ آگہی" سے ابتدائیہ اینٹ رکھی اور پھر سینئرز کے باکمال ہاتھوں کا اعجاز ناولز کے بطور جلوہ گر ہوا۔ افسانے کی سرزمین ردا کو افسانوی سکھیوں نے چار چاند لگا دیا۔ چاہے وہ محترم صالحہ آپی ہوں یا کیوٹ سی رابعہ افضال، سینئر گیتی آراء سے لے کر جونیئرز سعدیہ اقبال، ماریہ عمران، شیریں تبسم، نوشین طاہر، امبرین ناز، تبسم فیاض، مہرین کنول، اقراء چنا ہوں ہر ایک انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ عید رنگوں میں نہلاتی کائنات غزل، عائشہ ذوالفقار یا جگمگاتی درخشاں ضیاء ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ سکہ جمایا عید سروے نے سکھیوں کے معمولاتِ کار سے آگاہی دی۔ شوخ و شنگ افشاں جی ہر لفظ میں کھلکھلاتی عید کی خوشیاں دوبالا کر گئیں۔ شازیہ جی، قمروش جی، سباس جی، روشنی فاطمہ، نائلہ جی کی بابت جان کر حیرت ہوئی ارے آپ لوگ بھی ہماری طرح ہی جیتے ہیں۔ ثناء کنول تازہ تازہ سنجوگ اور ایسا روگ کس لیے؟ افسانہ آفتاب بجناسنگ سلامت رہیں۔ مدیحہ اعجاز، زارا صدف انتہائی صاف گو جوابات ویل ڈن۔ فرح ناز، درخشاں ضیاء، سحر مبین، مہرین کنول، پیارے لوگ پیاری باتیں، ایقان علی، سوئٹ افسانے اور تلخ ارادے کیوں یار؟ گیتی جی بندھن جتنا پرانا اتنا دلفریب ہے نا۔ ریمل آرزو اور شاہدہ کی عید دلچسپی مزے کی تھی۔ فرزانہ حبیب عید سروے کا خوب صورت آغاز ہوا آپ کے خوب صورت لفظوں سے۔ بہت پیاری رابعہ افضال عید نمبر تو آپ کے نام ہے۔ ہر سلسلے میں آپ کی بھرپور شرکت لاجواب انتخاب نہ سراہانا زیادتی ہے۔ آپ کے قلم میں بہت وسعت ہے۔ ریما نور اور عانیہ نیازی کتنے ہو سارا عید سروے چھان لیا۔ بہرحال اوور آل ردا عید نمبر از بیسٹ!

فریدہ فرید۔ پاکپتن

......☆......

گوشہ چشم

فرزانہ فرزین حبیب.............. کراچی

پیاری فرزانہ! آپ کا سندیسہ بمع افسانہ موصول ہوا۔ آپ کا سندیسہ دکھ اور آنسوؤں بھرا پڑھ کر ہم بھی افسردہ ہو گئے۔ بے شک والدین جیسی عظیم ہستی کوئی نہیں ہو سکتی اور جس طرح آپ کے والد نے آپ لوگوں کی پرورش و تربیت کی یہ بات قابل تحسین ہے۔ ادارہ آپ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ خدا آپ کے والد کے درجات بلند کرے۔ آپ کو اور آپ کی فیملی کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ تمام قارئین سے التماس ہے کہ وہ فرزانہ فرزین کے والد کے لیے دعا کریں۔

گیتی آراء.............. کراچی

سوئیٹ گیتی! آپ کا محبت نامہ ملا۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ آپ کا عید کارڈ ہمیں اس بار موصول نہیں ہوا ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم آپ کو یاد نہ رکھتے۔ خوش رہیے اور آپ کا افسانہ بچت آنے والے دنوں میں لگ جائے گا۔ بس تھوڑا انتظار۔

ناصرہ مظہر.............. کراچی

سوئیٹ ناصرہ مظہر! ہماری بہت پیاری دوست جو کہ ہمیں 14 اگست کو ہماری سالگرہ وش کرنے ہمارے گھر آ رہی تھیں کہ راستے میں ڈاکوؤں نے انہیں لوٹ لیا اور اس طرح سے ہمارا گفٹ بھی چلا گیا۔ اب ناصرہ اگلی بار ذرا دیکھ بھال کے چلنا۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

عائشہ الیاس.............. کراچی

عائشہ ڈیئر! بہت شکریہ آپ کے برتھ ڈے کارڈ کا آپ کا کارڈ مجھے بہت پسند آیا۔ خدا کرے آپ یونہی مجھے ہر سال وش کرتی رہیں آپ کا مرتبہ بلند ہو اور خدا نصیب بہت اچھا کرے۔

سائرہ حبیب.............. پنڈی

سوئیٹ سائرہ! آپ کا کارڈ مجھ سے زیادہ میرے اسٹاف کو پسند آیا، بے حد شکریہ۔

عانیہ نیازی.............. ربوہ

سوئیٹ عانیہ! خوش رہیے آپ کے برتھ ڈے کارڈ اور دعاؤں کا بہت شکریہ خوش رہیے۔

نور بانو.............. کوئٹہ

پیاری نور بانو! آپ ہماری بہت پرانی اور ہر دلعزیز قاری ہیں۔ آپ کا کارڈ بھی بہت پیارا اور دلکش تھا۔ بہت شکریہ خوش رہیے۔

شمائلہ دلعبار.............. عمان

پیاری شمائلہ! خوش رہیے۔ بہت عرصے بعد آپ کی ردا میں آمد اچھی لگی۔ آپ کی تحریر مل گئی ہے۔ انشاء اللہ قریبی اشاعت میں شامل ہو گی۔ اپنا خیال رکھیے اور ردا سے جڑی رہیے۔

عائشہ خان.............. ٹنڈو خان

ڈیئر عائشہ! آپ کا افسانہ مل گیا ہے۔ انشاء اللہ قریبی اشاعت میں شامل ہو گا۔

آسیہ مظہر چوہدری.............. آزاد کشمیر

سوئیٹ آسیہ! خوش رہیے آپ کی تحریر ہمیں مل گئی ہے۔ انشاء اللہ قریبی اشاعت میں شامل ہو گا۔ آپ نے سندیسہ نہیں لکھا آئندہ سندیسہ ضرور لکھیے گا اور اپنی تحریر کے ساتھ اپنا مکمل پتہ اور فون نمبر ضرور لکھیے۔

حلیمہ ودود.............. کراچی

پیاری حلیمہ ودود! کیسی ہیں آپ؟ افسوس کہ ہماری آپ سے بات نہ ہو سکی آپ پھر فوراً مجھے کال کر لیں اور رابطہ نمبر ضرور دیں۔ آفس میں ہم ملیں یا نہ ملیں۔ میں فون کرتی ہوں آپ کو مگر شاید آپ کا نمبر تبدیل ہو گیا ہے۔

امبرین حیدر.............. اسلام آباد

سوئیٹ امبرین حیدر! خوش رہیے آپ کی دعاؤں اور پیار کا بے حد شکریہ آنے والے دنوں میں آپ کی تحاریر ضرور شامل اشاعت ہوں گی۔

مہرین کنول.............. کراچی

سوئیٹ مہرین خوش رہیے! آپ کی تحریر لیٹ موصول ہوئی اس لیے اس بار شامل نہ ہو سکی مگر قریبی اشاعت میں ضرور شامل ہو گی۔

عینی سید.............. راولپنڈی

پیاری عینی! آپ نے بہت دنوں بعد ہمیں یاد کیا آپ کا پیار بھرا کارڈ ہمیں بہت پسند آیا۔ خوش رہیے۔

افشاں علی.............. کراچی

مائی ڈول افشاں علی! خوش اور سدا مسکراتی رہیں آپ نہ صرف قارئین کی ہر دلعزیز ہیں بلکہ ہمارے بھی دل سے بہت قریب ہیں خوش رہیں اور خدا کرے اچھے نصیب کرے، آمین۔

ریما نور.............. کراچی

پیاری ریما! کیسی ہیں آپ اس بار آپ کی ڈاک ہمیں مل گئی تو آپ کی تحاریر شامل اشاعت بھی ہیں۔ اب تو یقیناً آپ خوش ہوں گی۔ فضا ڈول کو ہمارا پیار اور ردا سے جڑی رہیے ردا آپ کا اپنا ردا ہے۔

نوشین مدثر.............. لاہور

ڈیئر نوشین! طویل غیر حاضری کے بعد آپ کی آمد بہت اچھی لگی۔ آپ کی نگارشات مل گئی ہیں۔ جلد ہی شامل اشاعت ہوں گی۔

آنسہ احمد.............. پنڈی

ڈیئر آنسہ احمد! آپ سے فون پر ہماری بات ہوئی تھی آپ کی تحریر کے متعلق تاحال آپ کی تحریر ہمیں موصول نہیں ہوئی۔ آپ اپنے قریبی پوسٹ آفس سے جا کر اس بابت معلومات کریں۔ ردا ہمیشہ آپ کو ویلکم کرتا ہے کیونکہ ردا آپ کا اپنا ردا ہے۔

عشرت شفیع.............. کراچی

پیاری عشرت شفیع! خوش رہیے آپ سے بات کر کے ہمیں بے حد خوشی ہوئی آپ نے ہماری اور ردا کی برتھ ڈے کو یاد رکھا اور ردا آپ کو بے حد پسند آ رہا ہے تو یقیناً یہ ردا کی رائٹرز کا کمال ہے جو اتنی با کمال تحاریر ردا کے لیے لکھ رہی ہیں۔

شاہدہ علی.............. لاہور

ڈیئر! اس بار آپ کو ردا نہیں مل سکا۔ وجہ جو بھی رہی ہو۔ مگر اگلے ماہ آپ کو دونوں منتھ کے ردا مل جائیں گے۔ ☆

نئے لکھنے والے متوجہ ہوں

☆ سلسلے وار لکھنے سے پہلے ادارے سے اجازت لینی ضروری ہے۔
☆ تحریر صاف ستھری پیج کے ایک طرف لکھی ہو۔
☆ پہلے مختصر افسانہ لکھیں پھر ناول یا ناولٹ۔
☆ ہر تحریر کے آغاز میں اپنا نام اور اختتام پر اپنا فون نمبر اور مکمل پتہ ضرور لکھیں۔
☆ ہمیشہ اوریجنل مسودہ بھیجیں اور فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس رکھیں۔
☆ مستقل سلسلوں سے متعلق میٹر الگ الگ صفحات پر لکھیں۔ ایک ہی صفحے پر تمام نگارشات نہ لکھیں۔

کچن

مٹن حلیم

اجزاء

مٹن ہڈی کے بغیر	ایک کلو
تیل	آدھا کلو
دال چنا	آدھا پاؤ
دال ماش	آدھا پاؤ
دال مسور	آدھا پاؤ
دال مونگ	آدھا پاؤ
حلیم مصالحہ	2 کھانے کے چمچ
گرم مصالحہ	2 کھانے کے چمچ
نمک	حسب ذائقہ
ادرک (کاٹ لیں)	2 انچ کا ٹکڑا
لہسن	1 پوتھی (15-12 جوئے)
ہری مرچ	8 عدد
پیاز (کاٹ لیں)	3 عدد
دلیہ گندم	100 گرام
کارن فلور	2 کھانے کے چمچ

ترکیب:۔

مٹن کو دھو کر صاف کر لیں اور ایک بڑے پین میں ڈال دیں۔ لہسن کو گرائینڈ کر لیں اور اس کا جوس مٹن والے پین میں شامل کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی اس پین میں ڈالیں پیاز، نمک، ہلدی، سرخ مرچ اور دو کلو پانی۔ پھر پین کو چولہے پر چڑھا دیں اور درمیانی آنچ پر پکنے دیں۔

اس دوران دالیں صاف کر کے (الگ الگ پیالوں میں) پانی میں دو گھنٹے کے لیے بھگو دیں تاکہ وہ نرم پڑ جائیں۔ پھر انہیں حسب ذائقہ نمک ڈال کر ابالنے رکھ دیں۔ مٹن تیار ہو جائے تو بھون کر آنچ پر سے ہٹا لیں۔ دالیں گل جائیں تو ٹھنڈا کر کے ابلی پیس لیں (یا گرائینڈ کر لیں) پھر دال کے اس آمیزے کو مٹن والے پین میں ڈال کر گھوٹا لگائیں اور پہلے کی طرح پانی ڈال کر پکنے دیں۔

جب تک پانی خشک ہو بار بار پین میں گھوٹا لگاتی رہیں۔ جتنی گھوٹیں گی اتنی لذیذ حلیم تیار ہو گی۔ اس پین میں گندم کا دلیہ اور گرم مصالحہ اور ہری مرچیں ڈال کر خوب گھوٹیں اور پکنے دیں تاکہ پانی صرف ایک چوتھائی رہ جائے اور حلیم خوب گاڑھا ہو جائے۔ اب اس میں کارن فلور (پانی میں گھول کر) چمچ چلاتے ہوئے مکس کر دیں۔

تھوڑی دیر دھیمی آنچ پر پکنے دیں تیل اوپر آ جائے۔ پھر لہسن اور پیاز کو ایک الگ پین میں براؤن کر کے اس کا تڑکہ حلیم میں لگائیں اور اوپر سے ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈال کر گارنش کریں ادرک باریک کتر کر بھی ڈال سکتی ہیں۔ لیموں چھڑکنے سے بھی حلیم مزید ذائقے دار ہو جائے گی۔

نوٹ۔ آپ حلیم کو جس طرح چاہیں مزید مصالحوں سے گارنش کے سرو کر سکتی ہیں۔

اسپیشل ران روسٹ

اجزاء

مٹن ران	1 عدد
دہی	1 کپ
لال مرچ	2 کھانے کے چمچ
گرم مصالحہ پاؤڈر	1 کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
سرکہ	آدھا کپ
لہسن، ادرک (پیسٹ)	3 کھانے کے چمچ
اجوائن (پسی ہوئی)	آدھا کھانے کا چمچ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:۔

ران کو اچھی طرح صاف کر لیں پھر اس پر گہرے کٹ لگا لیں دہی میں تمام اجزاء سوائے تیل کے مکس کر لیں اور اچھی طرح ران پر لگا دیں دو گھنٹے میرینیٹ ہونے دیں۔ اب برتن میں حسب ضرورت تیل ڈال کر ران اس میں ڈال دیں درمیانی آنچ پر 20 سے 25 منٹ تک پکنے دیں۔ پھر پلٹ کر دوبارہ 20 منٹ تک پکائیں۔ گولڈن ہو جائے تو ٹشو پیپر پر نکال لیں۔ چلی ساس کے ساتھ سرو کریں۔

تکہ کباب

اجزاء:۔

گوشت	آدھا کلو
لہسن، ادرک (پیسٹ)	1 کھانے کا چمچ
پیاز (درمیانی پیس لیں)	1 عدد
دہی	آدھا کپ
سرکہ	2 کھانے کے چمچ
گرم مصالحہ پاؤڈر	آدھا کھانے کا چمچ
لال مرچ (کٹی ہوئی)	1 کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ڈیڑھ کپ
کوئلہ	1 ٹکڑا

ترکیب:۔

گوشت کو پسندوں کی شکل میں پتلے پتلے پارچے بنا لیں اور اس پر لیموں اور نمک مل دیں آدھا گھنٹہ لگا رہنے دیں اب دہی میں سوائے تیل اور کوئلے کے باقی تمام اجزاء اچھی طرح ملا لیں اور اس آمیزہ میں گوشت کو ڈال دیں اور دو گھنٹے میرینیٹ ہونے دیں۔

پتیلی میں حسب ضرورت تیل ڈال دیں اور اس میں گوشت والا آمیزہ ڈال کر 25 سے 30 منٹ تک ہلکی آنچ پر پکنے دیں پانی خشک ہو جائے تو ہلکی آنچ پر ہی بھونیں۔ کوئلہ دہکا لیں اور پھر اس کا دم لگا دیں۔

باربی کیو جیسا مزہ اٹھائیں۔ لیمن سلاد اور چلی ساس کے ساتھ سرو کریں۔

کٹاکٹ

اجزاء:۔

بکرے کے گردے	4 عدد
بکرے کا دل	2 عدد
بکرے کا مغز	2 عدد
پیاز	2 عدد (درمیانی سائز کی)
ٹماٹر (باریک کاٹ لیں)	1 پاؤ
دہی	آدھا پاؤ
تیل	1 کپ
مرچ پاؤڈر	2 چائے کے چمچ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن/ادرک (پیسٹ)	2 کھانے کے چمچ
گرم مصالحہ	1 چائے کا چمچ
سوکھی میتھی (پسی ہوئی)	2 چائے کے چمچ

ہری مرچ	5-6عدد
ہلدی	تھوڑی سی

ترکیب:۔

دل اور گردوں کے قیمے کی طرح موٹے موٹے ٹکڑے کرلیں۔اب ان کو تیل گرم کرکے اس میں ڈال دیں ساتھ ہی لہسن، ادرک، مرچ، ہلدی، نمک اور اتنا پانی ڈالیں کہ گوشت گل جائے۔پھر اس کو اچھی طرح بھون کر ٹماٹر، پیاز اور ہری مرچ کاٹ کر ڈالیں۔

جب یہ چیزیں بھن جائیں تو مٹر ابال کر ڈالیں اور ساتھ ہی دہی بھی پھینٹ کر ڈال دیں جب دہی کا پانی اچھی طرح خشک ہوجائے تو سوکھی میتھی اور گرم مصالحہ ڈال کر ایک منٹ تک پکائیں پھر چولہا بند کردیں رائتے اور نان کے ساتھ گرم گرم نوش کریں۔

لبنانی کباب

اجزاء:۔

قیمہ	آدھا کلو
میکرونیز (ابلی ہوئی)	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ (پسی ہوئی)	1 چائے کا چمچ
ادرک/لہسن (پیسٹ)	1 کھانے کا چمچ
پیاز (موٹے کٹی ہوئے)	3عدد
آلو (ابلے ہوئے)	3عدد
ہری مرچ (کٹی ہوئی)	2-3عدد
ٹماٹر (موٹے کٹے ہوئے)	2عدد
مٹر (ابلے ہوئے)	1 کپ
انڈے	2عدد
پودینہ	چند پتے
آئل	تلنے کے لئے

ترکیب:۔

پین میں قیمہ، نمک، مرچ، ادرک اور پیاز ڈال کر مکس کرلیں۔ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکائیں پانی خشک ہونے پر بھون لیں۔آلو کاٹ کر مٹر، ٹماٹر، میکرونیز، ہری مرچیں اور قیمہ ڈال کر گرائینڈ کرلیں۔اس کے کباب بنالیں۔انڈے پھینٹ لیں۔کبابوں کو انڈے میں ڈپ کرکے تیل میں گولڈن فرائی کرلیں۔لبنانی ڈش تیار ہے۔

افغانی بریانی

اجزاء:۔

مٹن/بیف (ہڈیوں کے ساتھ	1 کلو
پیاز	4عدد
لونگیں	8عدد
ٹماٹر (پیسٹ)	5عدد ٹماٹر
کالی الائچی	4عدد
چھوٹی الائچی	4عدد
گاجر	آدھا کلو
بادام	6,7عدد
چاول	آدھا کلو (پانی میں بھگو کر رکھیں)
پستہ	5,6عدد
کشمش	6,7عدد
زیتون کا تیل	2 کپ
زعفران	1 چٹکی

ترکیب:۔ایک پین میں پیاز سنہری کرلیں پھر اس میں گوشت مع گرم مصالحہ اور ٹماٹو (پیسٹ کے ڈال دیں اور پین کو پکنے کو رکھ دیں تا کہ گوشت گل جائے مصالحے کو چند منٹ بھونیں پھر آدھا کپ پانی ڈال کر پانچ سے دس منٹ پکائیں گاجر کو باریک کاٹ کر فرائی کریں پھر اس میں پستہ، بادام، کشمش، گاجر اور زعفران ڈال کر مکس کرلیں اوپر سے سبز الائچیاں چھڑک کر بریانی کو بیس منٹ کے لئے دم دیں اور سرو کریں۔

نوٹ☆☆دہی کے رائتے کے ساتھ بہت مزہ دیتی ہے۔

تندوری تکے

اشیاء:

گوشت	ایک کلو (پتلے پارچے)
پیاز	ایک پاؤ
دہی	ایک پاؤ
آئل	آدھ پاؤ
کچا پپیتا	آدھا پاؤ
زیرہ، تل، خشخاش	ایک ایک چھٹانک
بھنے ہوئے چنے	ایک پاؤ
لہسن	ایک پوتھی

ترکیب:

پیاز کے باریک لچھے کاٹیں اور انہیں تھوڑے آئل میں تل کر لال کرکے نکال لیں۔دیگر تمام مصالحے بھی اسی طرح گھی میں تل کر نکال لیں۔اب انہیں پیاز کے ساتھ باریک پیس لیں پھر گوشت میں پہلے پپیتا پیس کر ملائیں پھر پیاز ملاتے ہوئے مصالحے بھی شامل کردیں۔اب گوشت کی بوٹیوں کو اچھی طرح مکس کرلیں تا کہ اس کے تمام اجزاء خوب اچھی طرح مل جائیں۔اس میں پسی ہوئی ادرک، پسا ہوا لہسن، نمک اور دہی بھی ملادیں اور کم از کم تین گھنٹے تک اسی حالت میں پڑا رہنے دیں۔(اس طرح گوشت کے ریشے مصالحہ جذب کرکے جلد گلنے کے قابل ہوجاتے ہیں) پھر انہیں کسی تھال میں پھیلا کر اوون یا بھٹی یا تنور میں اس طرح دم پر لگائیں کہ تھالی پر ڈھکنے یا سرپوش کی قسم کا کوئی برتن ضرور ہو۔کچھ دیر بعد اس برتن کو اٹھا کر تکوں کی حالت کا اندازہ لگائیں۔اگر سرخی پر آگئے ہیں تو تھالی تنور سے نکال لیں اور پراٹھوں کے ساتھ گرم گرم کھائیں۔

ان کے ہمراہ گاجر یا شلجم کا اچار یا مولی کے قتلے یا سلاد ضرور کھانا چاہیے اس طرح ایک تو ان کی لذت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے دوسرے یہ جلدی ہضم ہو کر جزو بدن بن جاتے ہیں۔

ھانڈی گولا کباب

اجزاء:

قیمہ	آدھا کلو
خشخاش	ایک چائے کا چمچہ
سونف	ایک کھانے کا چمچہ
سوکھا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
کھوپرا	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت لال مرچیں	دس تا پندرہ عدد
پپیتا	ایک کھانے کا چمچہ
بھنا چنا	ایک چوتھائی کپ
گرم مصالحہ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
دہی	ڈیڑھ کپ
پیاز (کچی پسی ہوئی)	ایک عدد
ادرک، لہسن	دو چائے کے چمچے

ترکیب:ایک برتن میں خشخاش، سونف، سوکھا دھنیا، کھوپرا اور لال مرچ کو بھونیں اور چنے کے ساتھ اچھی طرح پیس لیں۔قیمے میں پپیتا، نمک، ادرک، لہسن اور تمام بھونا ہوا مرکب ملا کر ایک یا دو گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں پھر دہی میں ملائیں اور ان کو گول شکل میں بنالیں۔تیل گرم کرکے تھوڑے تیل میں فرائی کریں۔فرائی ہونے کے بعد انہیں پون کپ پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔آخر میں ہری مرچیں، ہرا دھنیا ڈالیں اور چولھے سے اتار لیں۔لاجواب ہانڈی گولا کباب تیار ہیں۔

فضائل قرآن

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

★ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن شریف کو سیکھے اور سکھائے۔

★ حق سبحانہ وتقدس کا یہ فرمان ہے کہ جس شخص کو قرآن شریف کی مشغولی کی وجہ سے ذکر کرنے اور دعائیں مانگنے کی فرصت نہیں ملتی، میں اس کو سب دعائیں مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ شانہ کے کلام کو سب کاموں پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی کہ خود حق تعالیٰ شانہ کو تمام مخلوق پر۔

★ حسد دو شخص کے سوا کسی پر جائز نہیں۔ ایک وہ جس کو حق تعالیٰ شانہ نے قرآن شریف کی تلاوت عطا فرمائی اور دن رات اس میں مشغول رہتا ہے دوسرے وہ جس کو حق سبحانہ نے مال کی کثرت عطا فرمائی اور وہ دن رات اس کو خرچ کرتا ہے۔

★ حق تعالیٰ شانہ اس کتاب یعنی قرآن پاک کی وجہ سے کتنے ہی لوگوں کو بلند مرتبہ عطا کرتا ہے اور کتنے ہی لوگوں کو پست و ذلیل کرتا ہے۔

★ قیامت کے دن صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا۔ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا۔ بس تیرا مرتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔

★ جو شخص ایک حرف کتاب اللہ کا پڑھے اس کے لئے اس حرف کے عوض ایک نیکی اور ایک نیکی کا اجر دس نیکی کے برابر ملتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارا (الم) ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف، میم ایک حرف ہے۔

★ جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل کرے اسکے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ ہوگی اگر وہ آفتاب تمہارے گھر میں ہو۔ پس کیا گمان ہے تمہارا اس شخص کے متعلق جو خود عامل ہے۔

★ جس شخص نے قرآن پڑھا پھر اس کو حفظ یاد کیا اور اس کے حلال کو حلال جانا اور حرام کو حرام حق تعالیٰ شانہ اس کو جنت میں داخل فرمادیں گے اور اس کے گھرانے میں سے ایسے دس آدمیوں کے بارے میں اس کی شفاعت قبول فرماویں گے جس کے لئے جہنم واجب ہو چکی ہو۔

★ جس شخص کے قلب میں قرآن شریف کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہیں وہ بمنزل ویران گھر کے ہے۔

★ دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جیسا کہ لوہے کو پانی لگنے سے زنگ لگتا ہے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ ان کی صفائی کی کیا صورت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ موت کو اکثر یاد کرنا اور قرآن پاک کی تلاوت کرنا۔

★ تم لوگ اللہ جل شانہ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جو خود حق سبحانہ سے نکلی ہے یعنی کلام پاک۔

★ جو شخص ایک آیت کلام اللہ کی سنے اس کیلئے دو چند نیکی لکھی جاتی ہے اور جو تلاوت کرے اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگا۔

★ کلام اللہ کو آواز سے پڑھنے والا علانیہ صدقہ کرنے والے کے مشابہ ہے اور آہستہ پڑھنے والا خفیہ صدقہ کرنے والے کی مانند ہے۔

★ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کلام پاک سے بڑھ کر کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا نہ کوئی نبیؑ نہ فرشتہ وغیرہ۔

★ اگر تو صبح کو جا کر ایک آیت کلام اللہ شریف کی سیکھ لے تو نوافل کی سو 100 رکعات سے افضل ہے اور اگر ایک باب علم کا سیکھ لے خواہ اس وقت وہ معمول بہ ہو یا نہ ہو تو ہزار رکعات نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔

★ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو اطلاع دی کہ بہت سے فتنے ظاہر ہوں گے۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ ان سے خلاصی کی کیا صورت ہے انہوں نے کہا کہ قرآن شریف۔

سنگھار

قدرتی فیشل

خواتین یہ چاہتی ہیں کہ ان کی جلد ہر دم فریش اور خوب صورت نظر آئے۔ وہ بھی بغیر پیسے خرچ کیے۔ مطلب یہ کہ وہ فیس ماسک ٹریٹمنٹ کے لیے بیوٹی سیلونز کا رخ کرنا نہیں چاہتیں بلکہ یہ چاہتی ہیں کہ بغیر خرچہ کیے ہی ان کا کام ہو جائے اور انہیں بیوٹی سیلون جا کر اپنا وقت اور پیسے برباد نہ کرنے پڑیں۔ اس قسم کی سوچ رکھنے والی خواتین کی ہم اس سلسلے میں کچھ مدد کر دیتے ہیں۔ ہم یہاں ان کے لیے چند فیس ماسک کے طریقے بتا رہے ہیں جنہیں وہ آزما کر وقت اور خرچہ دونوں ہی بچا سکتی ہیں لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ خواتین کو اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑے گا کہ وہ اپنی جلد کے حساب سے فیس ماسک آزمائیں، یعنی کہ آپ کی جلد آئلی ہے تو جو ماسک اس کے لیے بتایا جا رہا ہے وہی آزمائیں۔ اگر آپ کی جلد آئلی ہے اور آپ نے بجائے آئلی جلد کے ماسک کے خشک جلد کا ماسک لگا لیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی جلد کو سوٹ نہ کرے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ جو ماسک جس اسکن ٹائپ کے لیے بتایا جا رہا ہے وہی اسکن رکھنے والی خواتین اسے آزمائیں۔

آئلی اسکن: آئلی اسکن رکھنے والی خواتین مندرجہ ذیل فیس ماسک آزما کر اپنی جلد کو تازگی بخش سکتی ہیں۔ یہ آسان ترین فیس ماسک ہے جسے ہیں بھی کبھی بھی باآسانی آزمایا جا سکتا ہے۔ ایک سے دو کیلے لے کر انہیں میش کر لیں۔ جب وہ پیسٹ کی شکل میں آجائیں تو اسے چہرے پر لگائیں۔ ماسک کو پندرہ منٹ لگا رہنے دیں، بعد میں ٹھنڈے پانی سے منہ دھو لیں۔

ڈرائی اسکن: ڈرائی اسکن (خشک جلد) رکھنے والی خواتین کو چاہیے کہ وہ حسب ضرورت ناشپاتی لے کر اسے گرائنڈ کر لیں۔ اب گرائنڈ کی ہوئی ناشپاتی میں اتنا شہد ملائیں کہ وہ پیسٹ کی شکل اختیار کر جائے۔ اب اس پیسٹ کو چہرے پر فیس ماسک کی صورت میں لگائیں اور 10 منٹ کے لیے چہرے پر لگا رہنے دیں۔ اس ماسک کو آزمانے سے آپ کی ڈرائی اسکن میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جائے گی اور وہ نرم وملائم نظر آنے لگے گی۔

ملی جلی جلد: اگر آپ کی جلد ملی جلی (یعنی کہیں سے چکنی اور کہیں سے خشک) ہے تو آپ چند پتیاں گلاب کی لے کر انہیں پیس لیں۔ اس میں چند قطرے عرق گلاب، تھوڑا سا دہی اور شہد ڈال کر پیسٹ سا بنا لیں اور چہرے پر لگائیں۔ 10 منٹ لگا رہنے دیں، جب چہرہ دھوئیں گی تو چمکتی جلد دیکھ کر یقیناً آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔

حساس جلد: ایک کپ دہی میں آدھا کپ دلیہ ڈال کر مکس کر لیں۔ جب گاڑھا سا پیسٹ بن جائے تو اس کی گہری تہہ چہرے پر لگائیں اور اسے سوکھنے دیں۔ پندرہ سے بیس منٹ بعد جب ماسک سوکھنے لگے تو اسے سادے پانی سے دھو لیں۔ آپ کا چہرہ بغیر کسی کیمیکل پراڈکٹ استعمال کیے ہی چمکنے لگے گا۔

نوٹ:
☆ جب بھی فیس ماسک لگائیں، کوشش کریں کہ آپ نے نئے کپڑے نہ پہنے ہوں۔
☆ جو بھی ماسک لگائیں دھیان رکھیں کہ اسے آنکھوں اور ہونٹوں کے اردگرد نہ لگائیں۔
☆ فیس ماسک کو بتائے گئے وقت تک ضرور چہرے پر لگائے رکھیں۔ وقت سے پہلے نہ اتاریں۔
☆ ماسک لگانے سے پہلے بالوں کو اچھی طرح سمیٹ لیں۔ ہیئر بینڈ کا بھی استعمال کرسکتی ہیں تاکہ بال لگائے گئے فیس ماسک پر نہ آئیں۔

ٹوٹکے

☆ اگر چہرے پر داغ، دھبے اور چھائیاں ہوں تو چہرے کی رنگت یکساں نظر نہیں آتی اور چہرہ بدنما لگتا ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ٹماٹر کا رس اور جو کا آٹا ملا کر گاڑھا سا پیسٹ بنائیں اور ماسک کی طرح چہرے پر لگالیں۔ خشک ہونے تک اس ماسک کو لگا رہنے دیں پھر گیلی انگلیوں کی مدد سے آہستہ آہستہ رگڑ کر اتار دیں۔ اب ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں۔ اس کے بعد نم چہرے پر وٹامن ای کا ایک کیپسول توڑ کر اس کا آئل داغ دھبوں اور چھائیوں پر لگائیں۔
☆ بال اگر خشک، کمزور، بے رونق اور روکھے ہوں تو دو بڑے چمچے بادام کا تیل لے کر اس میں چھ قطرے ٹی ٹری آئل اور چھ قطرے روز میری آئل ملائیں اور رات سونے سے پہلے سر کی جلد پر اس کا مساج کرلیں۔ صبح کسی اچھے شیمپو سے بال دھولیں۔ ہفتے میں تین مرتبہ اس طریقے پر عمل کرنے سے نہ صرف آپ کے بال نرم و ملائم اور چمکدار نظر آئیں گے بلکہ گرنا بھی بند ہوجائیں گے۔
☆ چہرے اور ناک پر بہت زیادہ کیلیں، بلیک ہیڈز اور وائٹ ہیڈز ہوں تو اس کے لیے ہربل اسٹرنجنٹ تیار کریں۔ ایک چائے کا چمچہ پودینے کا عرق لے کر اس میں برابر کی مقدار میں جو کا آٹا اور چاول کا آٹا ملائیں اور چہرے پر صرف ان ہی جگہوں پر لگائیں جہاں کیلیں اور بلیک ہیڈز ہوں۔ جب ماسک خشک ہو جائے تو اتار دیں اور ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں۔ اس طریقے پر روزانہ عمل کریں۔ جلد ہی آپ کا چہرہ صاف ستھرا ہو جائے گا۔
☆ دانوں اور مہاسوں کے داغ چہرے پر پڑ جائیں تو انہیں دور کرنے کے لیے ایک چائے کا چمچہ کوکونٹ ملک میں بقدر ضرورت کارن فلور ملا کر پیسٹ بنائیں اور ماسک کی طرح روزانہ چہرے پر لگائیں۔ ماسک خشک ہونے پر اسے اتار دیں اور ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں۔ اس سے نہ صرف ایکنی کے داغ دور ہوں گے بلکہ یہ ماسک بہترین اینٹی ایجنگ بھی ہے۔
☆ کپڑوں پر چائے یا کولڈ ڈرنک گر جائے تو فوراً ذرا سا نمک ڈال کر برف مل دیں پھر دھو کر استری کرلیں۔ داغ دور ہو جائیں گے۔
☆ سردیوں کے موسم میں چہرے کی جلد بھی خشک ہو جاتی ہے لہٰذا اس موسم میں خاص طور سے صابن سے چہرہ دھونے سے گریز کریں اور فیس واش استعمال کریں۔ کیونکہ صابن آپ کی جلد سے چکنائی اور نمی کھینچ لیتا ہے۔
☆ موسم کوئی بھی ہو لیکن آپ مہینے میں دو مرتبہ اپنے چہرے کی کلینزنگ ضرور کریں لیکن جب باہر مثلاً شاپنگ وغیرہ کے لیے جائیں تو گھر واپس آکر کلینزنگ کرنا نہ بھولیں۔
☆ ایسی اسکن کیئر پروڈکٹس کا استعمال اپنی جلد پر بالکل نہ کریں جن کا رنگ گلابی ہو۔ کیونکہ گلابی رنگ والی کریمز اور لوشنز میں کیمیکلز ہوتے ہیں جو آپ کی جلد کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ سفید رنگ کی یا ٹرانسپیرنٹ کریمز، لوشنز اور آئل استعمال کریں۔

......☆......

